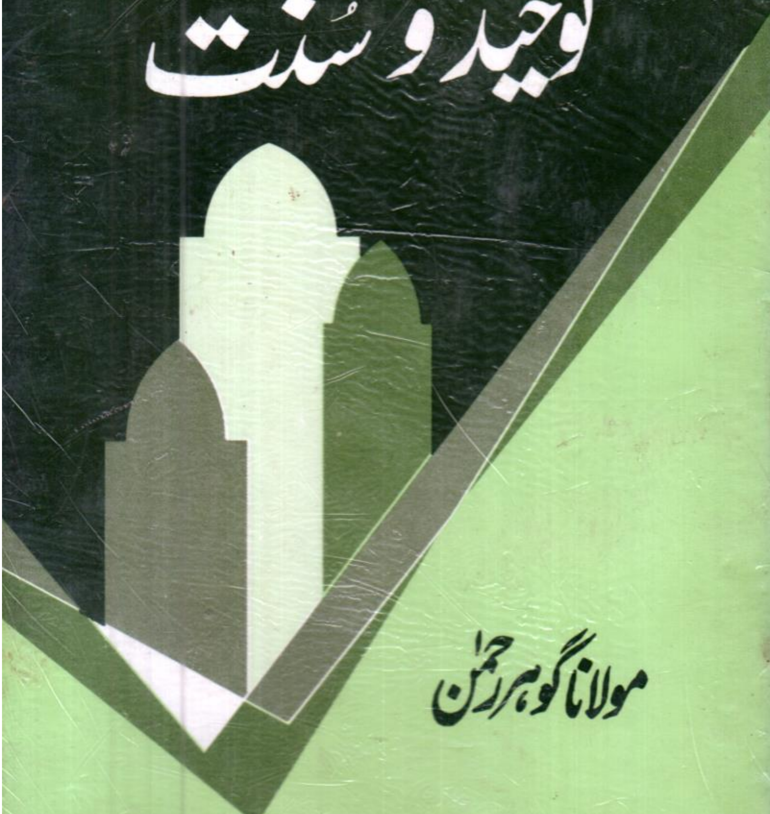
حقیقت

توحید و سنّت



مولانا گوہر رحمٰن

ادارہ معارف اسلامی

حقیقت

توحید و سنّت

مولانا گوہر رحمٰن

ادارہ معارف اسلامی
منصورہ — لاہور — پاکستان

☆ نام کتاب حقیقت توحید وسنت

☆ تصنیف مولانا گوہر رحمٰن

مہتمم دار العلوم تفہیم القرآن، مردان

☆ باہتمام ادارہ معارف اسلامی، منصورہ، لاہور

☆ مطبع میٹرو پرنٹرز لاہور

☆ طبع اول دسمبر ۱۹۸۶ء

☆ طبع دوم مئی ۱۹۸۹ء

☆ طبع سوم جون ۱۹۹۲ء

☆ طبع چہارم جون ۱۹۹۸ء

☆ قیمت -/75 روپے

تقسیم کنندہ :

مکتبہ معارف اسلامی

منصورہ، ملتان روڈ، لاہور۔ پوسٹ کوڈ 54570

فون : 4-5419520-7830033-448022

فہرستِ مضامین

چھٹا باب ۷۷

ساتواں باب ۹۳

آٹھواں باب ۱۱۴

دیباچہ

اس کتاب کے مضامین و مندرجات کو مستقل کتاب کے ابواب بھی کہا جا سکتا ہے، لیکن اصل میں یہ میری کتاب "اسلامی سیاست"[1] کا پہلا حصہ ہے۔ اسلامی سیاست بلکہ پورے اسلامی نظام کے اساسی اُصول و مبادیِ توحید و سُنّت ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی اُلوہیّت و حاکمیّت اور رسولُ اللہ کی رسالت و قیادت پر مبنی سیاست اسلامی سیاست ہے اور دینِ اسلام کا ایک باب ہے۔ توحید و سُنّت کی پابندی سے آزاد سیاست طاغوتی نظام کا ایک باب ہے جس کا دین و مذہب سے کوئی تعلّق نہیں ہے۔

"اسلامی سیاست" میں اسلام کے سیاسی نظام کے اصول ضروری تفصیلات کے ساتھ بیان کر دیئے گئے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب میں اسلام کے مبادیات، یعنی توحید و سنّت پر بحث کی گئی ہے۔

توحید کی حقیقت

توحید کا لغوی مفہوم ہے، یکتا اور تنہا جاننا اور ماننا اور اس کا شرعی مفہوم ہے اللہ

[1] یہ کتاب شائع ہو چکی ہے اور المنار بک سنٹر منصورہ سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

کو اس کی ذات اور صفات میں یکتا و تنہا مان کر اُسی کی عبادت کرنا۔ کسی اور کو اُس کی صفات الُوہیت اور عبادت میں شریک نہ کرنا۔ یہی وہ توحید ہے جس کی دعوت تمام انبیاء نے دی ہے کہ اللہ ہی کی عبادت کرو، دوسرا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے۔

عبادت کی حقیقت

عبادت کے لغوی معنے ہیں انتہائی درجے کی عاجزی اور فروتنی اور اس کے شرعی معنے ہیں ہمہ وقتی غلامی، بندگی اور فرمانبرداری۔ میری کتاب "اسلامی سیاست" کے صفحات ۲۳۹ تا ۲۴۴ پر عبادت کے لغوی اور شرعی معانی کی مفصل بحث حوالوں کے ساتھ موجود ہے۔ یہاں پر عبادت کے جامع تصوّر کو ذہن نشین کرانے کے لیے شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کا ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے۔ ابن تیمیہؒ سے سوال کیا گیا تھا کہ عبادت اور عبودیت (بندگی) کی حقیقت کیا ہے؟ اور کیا پورے کا پورا دین عبادت کے مفہوم میں داخل ہے؟

اسی سوال کے جواب میں امام موصوفؒ نے "العبودیة" نام کا رسالہ لکھا تھا۔ اس کے آغاز میں لکھتے ہیں:

"العبادة هي اسم جامع لكل مايحبه الله ويرضاه من الاقوال والاعمال الظاهرة والباطنة فالصلوٰة والزكوٰة، والصيام، والحج، وصدق الحديث، و اداء الامانة، وبرّ الوالدين، وصلة الارحام، و الوفاء بالعهود، والامر بالمعروف، والنهي عن المنكر، والجهاد للكفار والمنافقين، والاحسان الى الجار، واليتيم، والمسكين، وابن السبيل، و المملوك من الآدميين والبهائم والذكر والدعاء و القراءة وامثال ذالك من العبادة۔ وكذالك حبُّ

اللّٰہ ورسولہ، وخشیۃ اللّٰہ والانابۃ الیہ، و اخلاص الدین لہ، والصبر لحکمہ والشکر لنعمۃ والرضاء بقضاءہ والتوکل علیہ والرجاء لرحمتہ والخوف من عذابہ وامثال ذالک ھی من العبادات اللّٰہ[1]۔

(عبادت ایک جامع نام ہے ہر اس چیز کا جسے اللّٰہ پسند کرتا ہو۔ اقوال میں سے، باطنی (قلبی) اعمال میں سے اور ظاہری اعمال میں سے۔ پس نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، سچ بولنا، حق دار کا حق ادا کرنا، والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرنا، رشتہ داروں کے ساتھ صلۂ رحمی کرنا، بھلائی اور نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا، کفار اور منافقین کے خلاف جہاد کرنا، ہمسایوں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، غلاموں (زیر دستوں) اور چارپایوں سب کے ساتھ احسان کرنا، دعاء، ذکر، تلاوتِ قرآن اور اس طرح کے دیگر اقوال و اعمال سب عبادۃ کے جامع مفہوم میں شامل ہیں)

اسی طرح (اعمالِ باطنہ میں سے) اللّٰہ و رسول ﷺ کی محبت، خوفِ خدا، خدا کی جانب رجوع کرنا، اللّٰہ کے فیصلے پر صبر کرنا، اُس کی نعمتوں کا شکر ادا کرنا، اللّٰہ کے فیصلے پر راضی ہونا، اسی پر بھروسہ کرنا، اللّٰہ کی رحمت کی امید رکھنا، اُس کے عذاب کا خوف اور اسی طرح کے دیگر اعمالِ قلبیہ سب عبادت کے وسیع مفہوم میں شامل ہیں

دوسرے مقام پر عبادۃ کے جامع مفہوم کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں

فالدّین کلّہٗ داخل فی العبادۃ[2]۔

(پس معلوم ہوا کہ سارا دین عبادت کے جامع مفہوم میں داخل ہے)

---

[1] رسالہ العبودیۃ ص ۲ فی مجموعۃ التوحید ص ۵۴۴۔ طبع دمشق ۱۹۶۲ء۔

[2] العبودیۃ ص ۵ فی مجموعۃ التوحید ص ۵۴۷

توحید و عبادت کے درجِ بالا جامع تصوّر کا لازمی تقاضا جماعتِ اسلامی پاکستان کے دستور کی زبان میں یہ ہے کہ :

۱ ۔ " انسان اللہ کے سوا کسی کو ولی، کارساز، حاجت روا اور مشکل کُشا، فریادرس اور حامی و ناصر (غیبی امور یعنی مافوق الاسباب میں) نہ سمجھے کیونکہ کسی دوسرے کے پاس کوئی اقتدار نہیں ہے ۔"

۳ ۔ " اللہ کے سوا کسی سے دعا نہ مانگے ____ کسی کی پناہ نہ ڈھونڈے، کسی کو مدد کے لیے (غیبی مدد) نہ پکارے ۔"

۴ ۔ " اللہ کے سوا کسی کے آگے سر نہ جھکائے ____ کسی کی پرستش نہ کرے، کسی کو نذر نہ دے، اور کسی کے ساتھ وہ معاملہ نہ کرے جو مشرکین اپنے معبودوں کے ساتھ کرتے رہے ہیں کیونکہ تنہا ایک اللہ ہی عبادت کا مستحق ہے ۔"

۵ ۔ " اللہ کے سوا کسی کو بادشاہ، مالک الملک اور مُقتَدرِ اعلیٰ تسلیم نہ کرے، کسی کو باختیارِ خود حکم دینے اور منع کرنے کا مُجاز نہ سمجھے، کسی کو مستقل بالذات شارع اور قانون ساز نہ مانے ۔"

۱۱ ۔ " اپنے لیے اخلاق میں، برتاؤ میں، معاشرت اور تمدن میں، معیشت اور سیاست میں غرض زندگی کے ہر معاملے میں صرف اللہ کی ہدایت کو ہدایت تسلیم کرے اور ہر اس طریقے اور ضابطے کو رد کر دے جو اللہ کی شریعت کے خلاف ہو ۔"

حقیقتِ توحید کا یہ تصوّر اس اعتقاد پر مبنی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام صفاتِ اُلوہیت اور کمالاتِ حقیقیہ سے مُتصِف ہے اور وہ اپنی ان صفات و کمالات میں یکتا اور واحد و لاشریک ہے ۔

ے دفعہ نمبر ۳ کی ذیلی دفعات ۔

امام طحاوی رحمہ اللہ (متوفی ۳۲۱ھ) عقیدۂ توحید کی تشریح اس طرح کرتے ہیں:

نقول فی توحید اللہ معتقدین بتوفیق اللہ ان اللہ واحد لاشریک لہ ولاشیئ مثلہ ولا شیئ یُعجزہ ولا الٰہ غیرہ قدیمٌ بلا ابتداء، دائمٌ بلا انتہاء لا یَفْنٰی ولا یبید ولایکون الّا مایریدُ لا تبلغہ الاوھام ولا تُدرکہ الافہام ولا یشبہ الانام، خالق بلاحاجۃٍ رازق بلا مُئُونۃ، ممیتٌ بلا مخافۃ باعث بلامشقّۃ، مازال بصفاتہٖ قدیما قبل خلقہ لم یزدد بکونھم شیئًا لم یکن قبلھم من صفتہٖ، کماکان بصفاتہٖ ازلیّا کذالک لایزال علیھا ابدیّاً لیس بعد الخلق استفادَ اسمَ الخالق ولاباحداثہٖ البریّۃ اسمَ الباریُ لہ معنی الربوبیۃ ولا مربوبَ ومعنی الخالق و لامخلوق وکما انہ مُحی الموتیٰ بعد ما احیا استحق ھذا الاسمَ قبل احیاءھم کذالک استحق اسم الخالق قبل انشاءھم۔ ذالک بانہ علیٰ کل شیئ قدیر وکل شیئ الیہ فقیر، وکل امرالیہ یسیر لا یحتاج الیٰ شیئ، لیس کمثلہ شیئ وھوالسمیع البصیر۔ خلق الخلق بعلمہ وقدّرلھم اقداراً وضرب لھم اٰجالاً لم یخف علیہ شیئ قبل ان یخلقھم وعلم ما ھم عاملون قبل ان یخلقھم وامرھم بطاعتہٖ ونھاھم عن معصیتہٖ وکل شیئ یجری بتقدیرہٖ، ومشیئتہ تنفذ لامشیئۃ

للعباد الّا ما شاء لهم فما شاء کان وما لم یشا لم یکن یهدی من یشاء ویعصم ویُعافی فضلاً ویضل من یشاء ویخذل ویبتلی عدلا وکلهم یتقلّبون فی مشیئته بین فضله وعدله وهو متعال عن الاضداد والانداد، لا رادّ لقضاءه ولا معقّب لحکمه ولا غالب لامره ـ

امنا بذالک کلّه وایقنّا ان کلاً من عنده[1]

(اللہ کی توحید کے بارے میں ہم اللہ ہی کی توفیق سے کہتے ہیں اور یہی ہمارا عقیدہ ہے کہ اللہ کی ذات یکتا و یگانہ ہے۔ اُس کے ساتھ کوئی بھی شریک نہیں، کوئی چیز اُس کی مثل نہیں، کوئی چیز اُس کو کمزور و عاجز نہیں کر سکتی، اس کے سوا کوئی بھی عبادت کے لائق نہیں، وہ قدیم ہے جس کے وجود کے لیے کوئی ابتدا نہیں، زندۂ جاوید ہے جس کے وجود کے لیے کوئی انتہا نہیں، اُس کی ہستی پر فنا اور زوال نہیں آسکتا۔ کچھ بھی نہیں ہو سکتا سوائے اُس کے جس کا وہ ارادہ فرمالے۔ اُس کی ماہیّت اور کُنہہ انسانی عقل کی رسائی سے بلند ہے اور انسانی فکر اس کا ادراک نہیں کر سکتی، وہ مخلوق کے ساتھ کوئی مشابہت ____ نہیں رکھتا، وہ خالق ہے بغیر کسی حاجت کے، رازق ہے بغیر کسی محنت کے، موت دینے والا ہے بغیر کسی خوف وخطر کے، دوبارہ زندہ کرنے والا ہے بغیر کسی مشقت کے، وہ ____ مخلوق کے پیدا کرنے سے پہلے ہی اپنی صفات سے متصف تھا، اُس نے مخلوق کے وجود

---

[1] العقیدۃ الطحاویہ للطحاوی (ولادت سنہ ۲۳۷ھ) ھو فات سنہ ۳۲۱ھ فی ضمن شرح العقیدہ الطحاویہ لابن ابی العزؒ طبع ریاض صہ۱۸ تا ۸۸ ـ

سے کوئی ایسی صفت حاصل نہیں کی جو اس سے پہلے سے حاصل نہ تھی، جس طرح ازل میں وہ صفاتِ اُلوہیت سے متصف تھا اسی طرح ابد تک ان سے متصف رہے گا، اُس نے اپنے لیے خالق اور باری کا نام مخلوقات اور کائنات کی پیدائش کے بعد حاصل نہیں کیا (بلکہ اُس کا یہ نام ازلی ہے، یعنی پیدا کرنے کی قدرت ازلی اور قدیم ہے، اگرچہ بالفعل پیدا کرنا، یعنی عملِ تخلیق و تکوین حادث ہے) اُسے ربوبیت کی صفت اُس وقت بھی حاصل تھی جبکہ کوئی پرورش لینے والا نہیں تھا اور اسے خالق کی صفت اُس وقت بھی حاصل تھی جبکہ کوئی مخلوق نہیں تھی، جس طرح وہ زندہ کرنے کے بعد مُردوں کو زندہ کرنے والا کہلاتا ہے اسی طرح وہ اِس نام کا مستحق مُردوں کو زندہ کرنے سے پہلے بھی تھا (زندگی دینے کی قدرت کے اعتبار سے) اِسی طرح وہ مخلوق کی ایجاد سے پہلے بھی خالق کے نام کا مستحق تھا۔

وہ ہر چیز پہ قدرت رکھتا ہے، ہر چیز اُس کی محتاج ہے، ہر چیز اُسی کی جانب لوٹتی ہے اور وہ خود کسی کا محتاج نہیں، کوئی چیز اُس کی مثل نہیں، وہ ہر بات سنتا ہے اور ہر چیز دیکھتا ہے، اُس نے مخلوق کو اپنے علم کے مطابق پیدا کیا ہے (یعنی کائنات کی ہر چیز کا علم اُسے تخلیق سے پہلے بھی حاصل تھا) اُس نے مخلوق کے لیے ہر ضروری چیز کا اندازہ اور مقدار پہلے سے مقرر اور متعین کر دی ہے، اُس نے اُن کی موت کے اوقات مقرر کر دیئے ہیں۔ مخلوق کے پیدا کرنے سے قبل بھی اُس سے کوئی چیز مخفی نہیں تھی، اُسے یہ علم حاصل تھا کہ یہ لوگ پیدا ہونے کے بعد کیا کریں گے۔

اُس نے اپنی اطاعت کا حکم دیا ہے اور اپنی نافرمانی سے منع کیا ہے، ہر چیز اُس کی تقدیر اور ارادے سے نافذ ہوتی اور وجود پاتی ہے، بندوں کا ارادہ نافذ نہیں ہو سکتا، وہ ارادہ کر ہی نہیں سکتے سوائے اس کے جس کا ارادہ اُس نے اُن کے لیے کیا ہو، وہ جو چاہے ہو جاتا ہے اور جو نہیں چاہتا

نہیں ہو سکتا۔ وہ ہدایت دیتا ہے (توفیق دیتا ہے) جسے چاہے اور نافرمانی سے بچاتا اور معاف کرتا ہے جسے چاہے اپنے فضل کی بنا پر۔ اور گمراہ کرتا ہے جسے چاہے (یعنی ضدی اور سرکش کو) رسوا کرتا ہے اور عذاب میں گرفتار کرتا ہے جسے چاہے اپنے عدل کی بنا پر۔ سب لوگ اُس کی مشیئت کے اندر اس کے فضل اور عدل کے درمیان گردش کرتے رہتے ہیں۔ نہ کوئی اُس کا مدِمقابل ہے، نہ شریک۔ اُس کی قضا کو کوئی ردّ اور اُس کے فیصلے کو کوئی مؤخر نہیں کر سکتا اور نہ اُس کے حکم پر کسی کا حکم غالب آسکتا ہے۔ ہم ان سب باتوں پر ایمان لا چکے ہیں اور یقین کرتے ہیں کہ سب کچھ اُسی کی جانب سے ہے۔"

اللہ تعالےٰ کی صفات میں سے اہم تر صفات تین ہیں:

خالقیّت ـــــ مالکیّت ـــــ حاکمیّت

حاکمیّت کی تفصیلات اور دلائل اسلامی سیاست کے باب سوم کی فصل ثالث میں بیان ہوئے ہیں (صفحہ ۲۱۸ تا ۲۷۴)۔

اِس کتاب کے پہلے باب میں خالقیّت پر بحث کی گئی ہے۔ اور دوسرے باب میں مالکیّت کا بیان ہے۔

سنّت کا مفہوم

سُنّت کے لفظی اور لغوی معنے ہیں راستہ، طریقہ اور عادت، خواہ اچھا طریقہ ہو یا بُرا۔ صحیح مسلم کی مندرجہ ذیل حدیث میں لفظِ سنّت اسی عام معنے میں استعمال ہوا ہے:

من سَنَّ سُنّۃ حسنۃ فلہ اجرھا و اجر من عمل بھا الیٰ یوم القیٰمۃِ ومن سنّ سنّۃً سیّئۃً فعلیہ وزرھا ووزرُ من عمل بھا الی یوم القیٰمۃِ۔

(جس نے کوئی اچھا طریقہ جاری کیا (متروک سنّت کو زندہ کیا) تو اُسے اُس کا اجر ملے گا اور اس کا اجر بھی ملے گا جو قیامت تک اس پہ عمل کرے گا۔
اور جس نے بُرا طریقہ جاری کیا، تو اُس پہ اس کا گناہ ہو گا اور اس کا بھی جو قیامت تک اس پہ عمل کرے گا)

محدثین اور علماءِ اصولِ فقہ کی اصطلاح میں نبی کریمؐ سے منقول قول، فعل اور تقریر کو سنّت کہتے ہیں. تقریری سنّت یہ ہے کہ نبی کریمؐ کی موجودگی میں جو بات کی گئی ہو یا جو کام کیا گیا ہو یا وہ بات اور کام نبی کریمؐ کے علم میں آیا ہو اگرچہ آپؐ کی موجودگی میں نہ کیا گیا ہو اور آپؐ نے اُس پر خاموشی اختیار کی ہو۔ اس لیے کہ رسول اللہؐ کی خاموشی اِس بات یا عمل کی تائید و تصدیق کے مترادف ہے۔

اسلامی سیاست، بلکہ پورے اسلامی نظام کا دار و مدار سنّتِ رسولؐ پر ہے۔ رسول اللہؐ کی رسالت پر ایمان لانے کا لازمی تقاضا جماعتِ اسلامی، پاکستان کے دستور کی زبان میں یہ ہے کہ:

"اپنی زندگی کے ہر معاملے میں خدا کی کتاب اور اُس کے رسولؐ کی سنّت کو حجّت اور سَنَد اور مرجع قرار دے. جو خیال یا عقیدہ یا طریقہ کتاب و سنّت کے مطابق ہو اُسے اختیار کرے، جو اُس کے خلاف ہو اُسے ترک کر دے. اور جو مسئلہ بھی حل طلب ہو اُسے حل کرنے کے لیے اسی سرچشمۂ ہدایت کی طرف رجوع کرے۔"

دوسری صدی ہجری میں معتزلہ نے اخبار الآحاد کی حُجّیّت سے انکار یا تحریف کی جو روش اختیار کی تھی اُس کا اصل سبب فلسفۂ یونان کی ذہنی غلامی تھی۔ اِسی طرح چودھویں صدی ہجری میں سر سیّد، مولوی عبداللہ چکڑالوی اور غلام احمد پرویز وغیرہ نے سنّتِ رسولؐ کے حجّت اور ماخذِ قانون ہونے سے جو انکار کیا ہے اُس کا اصل سبب فلاسفۂ یورپ اور مستشرقین کی ذہنی غلامی ہے، لیکن اُمّتِ مسلمہ کا اتّفاق و اجماع اور توارث و تعامل یہی ہے کہ سنّتِ رسولؐ حجّت ہے۔

اِس کتاب کے باب ثالث میں رسالت اور سنّت سے متعلق ضروری مباحث بیان کیے گئے ہیں۔ رسالت و نبوت کی حقیقت، اہمیت اور ضرورت بیان کرنے

کے بعد منصبِ رسالت اور سنّتِ رسولؐ کے زیرِ عنوان قرآن کریم سے رسولؐ اللہ کی ۲۰ حیثیات وصفات بیان کی گئی ہیں جو حجیّتِ حدیث کا واضح ثبوت ہیں

مجھے امید ہے کہ اگر اس کتاب یعنی "توحید و سنّت" اور "اسلامی سیاست" دونوں کتابوں کا ترتیب اور تدبّر کے ساتھ مطالعہ کیا جائے، تو دینی فکر کی صحیح تعمیر کے لیے مفید ثابت ہوگا۔

اللّٰھم أرنا الحق حقاً وارزقنا اتّباعه والباطل باطلا وارزقنا اجتنابه ۔ وصلی اللّٰہ علی خیر خلقه محمّد وآله واصحابه اجمعین ٥

گوہر رحمان
دارالعلوم تفہیم القرآن ۔ تفہیم کالونی مالاکنڈ روڈ مردان
(۱۱ شعبان ۱۴۰۴ھ مطابق ۱۳ مئی ۱۹۸۴ء)
بروز اتوار بوقت ۹ بجکر ۱۰ منٹ صبح ۔

پہلا باب

خالقیّت

اسلام کی عمارت کا مرکزی ستُون توحید ہے اور توحید کا شرعی مفہوم ہے اس حقیقتِ نفس الامری کا جاننا اور ماننا کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات میں بھی تنہا اور یکتا ہے، اپنی صفات میں بھی تنہا اور یکتا ہے اور اپنی اُلوہیت، یعنی معبُودیت میں بھی تنہا اور یکتا ہے۔ توحید کے اس عقیدے کی اَساس عقیدۂ خالقِیّت ہے۔ جو شخص وجودِ خالق کا منکر ہو گا وہ توحید کا بھی منکر ہو گا۔ اس باب میں اللہ تعالیٰ کی خالقیت کا اثبات پیش نظر ہے۔

انسانی فطرت اور کائنات کی ہر چیز اپنے پیدا کرنے والے کی ہستی پہ دلالت کرتی ہے۔ اللہ تعالےٰ کی خالقیت، کا ذکر قرآن کریم میں صرف لفظِ خلق اور اُس کے مشتقات کے ساتھ ۲۵۰ آیات میں ہوا ہے۔ خالقیّت کے ہم معنی دیگر الفاظ کی تعداد اس کے علاوہ ہے۔

خلق کے لغوی معنی :

لفظِ خلق عربی زبان میں بنیادی طور پہ دو معنوں میں آتا ہے :

۱۔ تقدیر ، یعنی کسی چیز کا اُس کے بنانے سے پہلے اندازہ لگانا اور مقدار متعین کرنا۔

۲ - اِبداع ، یعنی پیدا کرنا، بنانا اور عدم سے وجود میں لانا۔

ابنِ منظورؒ افریقی (متوفیٰ ۷۱۱ھ) فرماتے ہیں :

واصل الخلق التقدیر .... والخلق فی کلام العرب ابتداع الشیئ علی مثال لم یُسبق الیہ ..... و قال ابوبکر بن الانباریؒ الخلق فی کلام العرب علیٰ وجھین احدھما الانشاء علی مثال ابدعہ والآخر التقدیر[1]

(خلق کے بنیادی معنے ہیں اندازہ لگانا اور مقدار متعین کرنا اور عربی زبان میں یہ لفظ کسی چیز کو بے مثال نمونے پر بنانے اور پیدا کرنے کے معنوں میں بھی آتا ہے ۔ابن الانباریؒ کہتے ہیں کہ لفظِ خَلق کلامِ عرب میں دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے ؛ ایک ایسے نمونے پر پیدا کرنا جو خود ہی بنایا ہو اور دوسرے مقدار متعین کرنا)

علامہ جمال قرشیؒ لکھتے ہیں : خَلق اندازہ کردن و آفریدن[2]

چونکہ ہر چیز کی مقدار اور سارے عالم کے نظام کا مکمل نقشہ پہلے سے اللہ کے علمِ اَزلی میں موجود تھا اب بھی موجود ہے اور آئندہ بھی ہمیشہ کے لیے موجود رہے گا۔ اور کائنات کی ہر چیز تقدیرِ اَزلی کے عین مطابق عدم سے وجود میں لائی جا رہی ہے، اس لئے اللہ کی ذات لفظِ خلق کے دونوں معنوں کے اعتبار سے خالقِ کائنات ہے، یعنی کائنات کی تقدیر بھی اُس کے علم میں ہے اور اِس اَزلی منصوبے کے مطابق کائنات کی ہر چیز کا پیدا کرنے والا بھی وہی ہے ۔

---

[1] لسان العرب ۔طبع بیروت ص ۸۵ ج ۱۰ باب الخاء مع اللام ۔

[2] صراح اللغات ص ۳۷۳ باب القاف مع الخاء ۔ (صراح کی تکمیل ۶۸۱ھ میں ہوئی تھی)

قرآنی طرزِ استدلال فطری ہے

امام غزالیؒ (متوفی ۵۰۵ھ) فرماتے ہیں :

وادلّة القرآن مثل الغذاء ینتفع بها کل احد و ادلة المتکلمین مثل الدواء ینتفع بها آحاد الناس ویتضرّر به الاٰخرون [1]

(قرآن کے دلائل خوراک کی طرح ہیں جن سے ہر شخص فائدہ اٹھا سکتا ہے اور متکلمین کے (فلسفیانہ) دلائل دوا کی طرح ہیں جن سے خاص قسم کے لوگ تو فائدہ اٹھا سکتے ہیں، لیکن باقی لوگوں کو اُن سے ضرور نقصان ہی پہنچتا ہے)

قرآن کریم کی دعوت چونکہ ہر عام وخاص کے لیے ہے اس لیے اس کا طرزِ بیان اور اُسلوبِ استدلال فطری، عام فہم اور سادہ ہے، لیکن اس کے دلائل واضح اور عام فہم ہونے کے باوجود " براھینِ قطعیّہ" ہیں۔ اسی لیے قرآنِ کریم کا ایک نام " بُرْھان" ہے، یعنی وہ قطعی اور غالب دلیل جس کے مقابلے میں کوئی دلیل ٹھہر نہیں سکتی۔ حکماء اور فلاسفہ کا طرزِ استدلال سراسر مصنوعی اور تکلف پر مبنی ہوتا ہے جس سے فریقِ مخالف کو خاموش تو کیا جا سکتا ہے، لیکن اس سے شرحِ صدر، نورِ بصیرت، اطمینانِ قلب اور معرفتِ حق کی حلاوت وبشاشت نہیں مل سکتی۔ یہ کیفیت قرآنی دلائل ہی سے مل سکتی ہے : اَلَا بِذِکْرِ اللّٰهِ (ای القرآن) تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ۔

امام فخرالدین رازیؒ (متوفی ۶۰۶ھ) لکھتے ہیں :

" قرآنی طرزِ استدلال باقی تمام طرزہائے استدلال کے مقابلے میں انسان کی سمجھ کے قریب تر اور عقلِ انسانی میں تیزی کے ساتھ جگہ پانے والا ہے۔ قرآنی

---

[1] الجام العوام عن علم الکلام۔ ص۲۰ ۔

دلائل کی اصل غرض وغایت مجادلہ اور مناظرہ نہیں، بلکہ اصل مقصد صحیح عقائد کو دلوں میں بٹھانا ہے اور اس کے لئے یہی طرزِ استدلال زیادہ قوی اور مؤثر ہے"[1]

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ (متوفی ۷۲۸ھ) فرماتے ہیں:

بل الکتاب والسنۃ دلا الخلق وھداھم الی البراھین والادلۃ المبیّنۃ لاصول الدین۔ و ھٰؤلاء الغالطون اعرضوا عما فی القرآن من الدلائل العقلیۃ والبراھین الیقینیۃ[2]

(قرآن وسنت نے مخلوق کو وہ براہین اور دلائل دئے ہیں جو دینی اصول وعقائد واضح کرنے والے ہیں، لیکن ان خطا کاروں (فلسفیوں) نے قرآن کریم کے بیان کردہ عقلی دلائل اور قطعی براہین سے روگردانی کی ہے)

قرآن کے طرزِ استدلال کی چند مثالیں

اس عالم کے بنیادی یونٹ تین ہیں: علوی، جَوّی اور سفلی۔ یعنی بالائی، درمیانی اور تحتانی۔

دوسرے پہلو سے دیکھئے تو عالمِ عناصر کے ابتدائی انواع بھی تین ہی ہیں جن کو فلسفہ کی اصطلاح میں موالیدِ ثلاثہ کہا جاتا ہے، یعنی جمادات، نباتات اور حیوانات۔

قرآنِ کریم میں انہی چیزوں کو خالقِ کائنات کی ہستی پر بطور دلیل کے ذکر کیا گیا ہے۔ اس لئے کہ یہ آثار اور نشانیاں ہیں اور ہر ایک اثر اور علامت اپنے مُؤثِر اور ذُو العلامت کی عقلی اور منطقی دلیل ہوتی ہے۔

---

[1] تفسیر کبیر۔ صفحہ ۹۸، ج ۱۔ تفسیر سورۃ البقرہ۔ آیات نمبر ۲۱-۲۲۔

[2] رسالہ "معارج الوصول" فی مجموعۃ الرسائل الکبریٰ ص ۱۸۳

بطورِ مثال چند آیات ملاحظہ کیجئے :

۱۔ بے شک آسمانوں[1] اور زمین[2] کے بنانے میں اور رات[3] و دن[4] کے اختلاف میں اور ان کشتیوں[5] میں جو نفع مند چیزیں لے کر دریاؤں[6] میں چلتی ہیں اور بارش[7] کے پانی میں جسے اللہ نے آسمان (بادل) سے برسایا۔ پھر اس کے ذریعے زمین کو اُس کی خشکی کے بعد تر و تازہ کر دیا اور ہر قسم کے حیوانات[9] اس میں پھیلائے اور ہواؤں[10] کی تبدیلی میں اور اس بادل[11] میں جو زمین و آسمان کے درمیان مُقَیّد (مُعلّق) ہے (ان سب میں) عقل والوں کے لیے دلائل اور نشانیاں ہیں[1]۔

اس آیت میں ۱۱ چیزوں کو وجودِ خالق کے دلائل قرار دیا ہے۔ جو شخص بھی ان میں غور و فکر کرے گا اُس کی عقل خدا کی ہستی پر ایمان لے آئے گی۔ یہ تمام چیزیں متوازن، مستحکم اور باحکمت نظام کے تحت اپنے اپنے فرائض انجام دے رہی ہیں۔

- ہماری نظروں کے سامنے سورج چمک رہا ہے جو زمین و فضا کو بُقعۂ نور بنا دیتا ہے۔ سورج کا حُجم زمین کے حُجم سے ۳ لاکھ ۳۳ ہزار گنا زیادہ بڑا ہے اور یہ زمین سے ۹ کروڑ ۳۰ لاکھ میل دور ہے۔ اس کی روشنی ایک لاکھ ۸۶ ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے زمین تک پہنچتی ہے لیکن اس بُعد اور دوری کے باوجود اگر اس کی طرف نظر جما کر دیکھنے کی کوشش کی جائے تو بینائی کھو بیٹھنے کا خطرہ ہے۔
- اس کے بعد سورج غروب ہو جاتا ہے، تو رات کی سیاہ چادر ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔
- اسی شمسی نظام کے تحت موسمی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ کبھی گرم ہوائیں چلتی ہیں اور کبھی آبِ رواں کو تخ بستہ کرنے والی ٹھنڈی ہوائیں نمودار ہو جاتی

---

[1] البقرہ آیت ۱۶۴۔

ہیں ۔

- جب موسمِ بہار آتا ہے، تو زمین سرسبز و شاداب اور پھول پتوں کے زیورات سے آراستہ نظر آتی ہے اور ان کے حُسن سے لُطف اندوز ہونے کے لئے باذوق سیّاح ہر وقت پابہ کاب ہو جاتے ہیں، لیکن اس پُرکیف منظر کے چند ماہ بعد جب موسمِ خزاں آتا ہے، تو زمین کے یہ سارے زیورات ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں۔ اور وہ مُردہ و بے جان ڈھانچے کی طرح خشک اور بے رونق ہو جاتی ہے ۔
- ہمارے چاروں طرف حیوانات، نباتات اور جمادات کے طرح طرح کے انواع و اصناف پھیلے ہوئے ہیں ۔

کیا یہ ساری چیزیں اور ان کا معتدل و متوازن اور اٹل نظم اپنے خالق و صانع اور مُدبّر و مُنتظِم کے وجود پر دلیل نہیں ہے ؟ یقیناً دلیل ہے اور قطعی دلیل ہے۔ انسانی ریسرچ و تجربہ جس سائنسی ایجاد کو بھی منصّۂ شہود پر لائے گا وہ اپنی زبان میں اعلان کرے گی اور کرتی رہی ہے کہ میں جس عقل، جس تجربے، جس مادے اور جس توانائی سے تیار کی گئی ہوں وہ سب خدائے ذوالجلال کی تخلیق ہے ۔

اِسی طرح کا عقلی، سادہ، عام فہم لیکن مضبوط استدلال قرآن کریم کی سینکڑوں آیات میں بیان ہوا ہے۔ بطور نمونہ چند دیگر آیات میں غور و فکر اور تدبّر کیجئے

۲ ۔ دانے اور گٹھلی کو پھاڑنے والا اللہ ہے ۔

وُہی زندہ کو مُردہ سے اور مُردہ کو زندہ سے نکالتا ہے ۔

یہ سارے کام کرنے والا تو اللہ ہے، پھر تم کدھر بھکے چلے جارہے ہو ؟

پردۂ شب کو چاک کرکے وہی صبح نکالتا ہے ۔

اُسی نے رات کو سکُون کا وقت بنایا ہے ۔

اُسی نے چاند اور سُورج کے طلوع و غروب کا حساب مقرر کیا ہے۔ یہ سب اُسی زبردست قدرت و علم رکھنے والے کے ٹھہرائے ہوئے اندازے

ہیں ۔اور وہی ہے جس نے تمہارے لئے تاروں کو صحرا اور سمندر کی تاریکیوں میں راستہ معلوم کرنے کا ذریعہ بنایا ہے ۔
دیکھو ! ہم نے نشانیاں کھول کر بیان کر دی ہیں، اُن لوگوں کے لئے جو علم رکھتے ہیں ۔
اور وہی ہے جس نے ایک جاندار سے تم کو پیدا کیا ۔ پھر ہر ایک کے لئے ایک جائے قرار ہے اور ایک اُس کے سونپنے کی جگہ، یہ نشانیاں ہم نے واضح کر دی ہیں اُن لوگوں کے لئے جو سمجھ بوجھ رکھتے ہیں ۔
اور وہی ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا ۔ پھر اُس کے ذریعے ہر قسم کی نباتات اُگائی ۔پھر اُس سے ہرے ہرے کھیت اور درخت پیدا کئے ۔پھر اُن سے تہ بر تہ چڑھے ہوئے دانے نکالے ۔ اور کھجور کے شگوفوں سے پھلوں کے گچھے کے گچھے پیدا کئے جو بوجھ کے مارے جھکے پڑتے ہیں ۔ انگور، زیتون اور انار کے باغ اُگائے جن کے پھل ایک دوسرے سے ملتے جلتے بھی ہیں اور پھر ہر ایک کی خصوصیات جدا جدا بھی ہیں ۔ یہ درخت جب پھلتے ہیں تو ان میں پھل آنے اور پھر ان کے پکنے کی کیفیت ذرا غور سے دیکھو
اِن چیزوں میں نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لئے جو ایمان لاتے ہیں
اس پر بھی لوگوں نے جنوں کو اللہ کا شریک ٹھہرا دیا ۔ حالانکہ وہ ان کا خالق ہے اور بغیر جانے بوجھے اُس کے لئے بیٹے اور بیٹیاں تراش لیں، حالانکہ وہ پاک اور بالاتر ہے اِن باتوں سے جو یہ لوگ کہتے ہیں[1]
اِن آیات میں ۱۷ نشانیاں بیان ہوئی ہیں اور درمیان میں جگہ جگہ غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے کہ یہ چیزیں نہ صرف یہ کہ اپنے پیدا کرنے والے پر دلالت کرتی ہیں، بلکہ اُس کے وحدہٗ لاشریک لہٗ ہونے کا ثبوت بھی پیش کرتی ہیں اور آخر میں شکایت کی گئی ہے

---

[1] الانعام ۔ آیات ۹۵ تا ۱۰۰ پارہ ۷ ۔

۔ اتنی کھلی نشانیاں دیکھنے کے باوجود بعض لوگ مخلوق و مملوک کو خالق و مالک کا شریک ٹھہرا کر احسان فراموشی کر رہے ہیں۔

۴۔ (اُس نے آسمانوں اور زمین کو بالکل ٹھیک ٹھیک بنایا ہے۔ وہ بہت بالا و برتر ہے۔ اُس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔ اُس نے انسان کو ذرا سی بوند سے پیدا کیا اور دیکھتے دیکھتے وہ ایک جھگڑالو ہستی بن گیا۔

اُس نے جانور پیدا کئے جن میں تمہارے لئے پوشاک بھی ہے اور خوراک بھی اور طرح طرح کے دوسرے فائدے بھی۔

اُن میں تمہارے لئے جمال ہے جب کہ صبح تم انہیں چرنے کے لئے بھیجتے ہو اور جب شام کو اُنہیں واپس لاتے ہو۔

وہ تمہارے بوجھ ڈھوکر ایسے ایسے مقامات تک لے جاتے ہیں جہاں تم سخت جانفشانی کے بغیر نہیں پہنچ سکتے۔ یقیناً تمہارا رب بڑا ہی شفیق اور مہربان ہے۔

اُس نے گھوڑے اور خچّر اور گدھے پیدا کئے، تاکہ تم اُن پر سواری کرو۔ اور وہ تمہاری زندگی کی رونق بنیں۔

اور وہ بہت سی چیزیں پیدا کرتا ہے جن کا تمہیں علم تک نہیں۔ اور اللہ کے ذمّے ہے سیدھا راستہ بتانا جب کہ راستے ٹیڑھے بھی موجود ہیں۔ اگر وہ چاہتا تو سب کو ہدایت دے دیتا،

وُہی ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا جس سے تم خود بھی سیراب ہوتے ہو اور تمہارے جانوروں کے لئے بھی چارہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ اس پانی کے ذریعے سے کھیتیاں اُگاتا ہے اور زیتون اور کھجور اور انگور اور طرح طرح کے دوسرے پھل پیدا کرتا ہے۔

اِن سب چیزوں میں ایک بڑی نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرتے ہیں۔

اُس نے تمہاری بھلائی کے لئے رات اور دن کو اور سُورج اور چاند کو مُسخر کر رکھا ہے اور سب تارے بھی اُسی کے حکم سے مُسخّر ہیں ۔ اس میں بہت سی نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لئے جو عقل سے کام لیتے ہیں اور یہ جو بہت سی رنگ برنگ کی چیزیں اُس نے تمہارے لئے زمین میں پیدا کر رکھی ہیں اُن میں بھی یقیناً نشانی ہے اُن لوگوں کے لئے جو سبق حاصل کرنے والے ہیں[1]

ان آیات میں ۱۳ نشانیاں بیان ہوئی ہیں جو وحدتِ خالق، قدرتِ خالق اور علم و حکمت رکھنے والے مدبر و منتظم کے وجود کی کھلی دلیلیں ہیں ۔ اسلُوبِ بیان اور طرزِ استدلال اتنا واضح ، سادہ ، عام فہم ، پیارا اور دلنشیں ہے کہ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے اور دل میں ناقابلِ تَذَبذُب اور غیر متزلزل یقین پیدا ہوتا ہے ۔ شرط صرف یہ ہے کہ انسان میں اِنابت اور حق شناسی کا ارادہ موجود ہو ورنہ قلبِ عُنِید کے سامنے اگر سچائی ، روشنی کی طرح کھل کر آجائے پھر بھی وہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہو گا ۔

---

[1] النّحل، آیات ۳ تا ۱۳، پارہ ۱۴ ۔

دوسرا باب

سلف صالحین اور فقہاءِ اسلام کا طرزِ استدلال

سلف صالحینؒ نے اسی فطری اور قرآنی طرزِ استدلال کو اختیار کیا تھا اور اِسی کے ذریعے سے وہ منکرینِ خدا کو نہ صرف لاجواب کر دیتے تھے، بلکہ ان کو شرحِ صدر بھی نصیب ہو جاتا تھا۔ چند مثالیں پیشِ خدمت ہیں :

امام جعفر صادقؒ کا استدلال

" امام جعفر صادقؒ کی مجلس میں کسی زندیق نے اللہ کی ہستی سے انکار کیا، تو دونوں کے درمیان درج ذیل مکالمہ ہوا اور آخر کار منکرِ خدا کو ایمان کی دولت مل گئی۔

امام جعفرؒ : تم نے کبھی دریا میں کشتی پر سفر کیا ہے ؟

مُنکرِ خدا : ہاں !

امام جعفرؒ : کبھی دریائی حوادث کا سامنا ہوا ہے ؟

مُنکرِ خدا : ہاں ایک مرتبہ تباہ کن ہوائیں چلیں، کشتیاں ٹوٹ گئیں اور ملّاح ہلاک ہو گئے۔ میں ایک تختے کے ساتھ چمٹ گیا، لیکن تھوڑی دیر بعد یہ تختہ بھی میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور میں دریا کی لہروں میں غوطے کھاتے ہوئے بمشکل ساحل تک پہنچا۔

امام جعفرؒ : پہلے تو تیرا بھروسہ کشتی اور ملّاح پر تھا، پھر تختے پر، ان سب

کی تباہی کے بعد کیا تم نے اپنے آپ کو موت کے حوالے کر دیا تھا یا بچنے کی امید ابھی باقی تھی ؟

منکرِ خُدا : مَیں اس وقت بھی بچنے کی امید رکھتا تھا۔

امام جعفرؒ : کائنات کا بنانے والا ذہی ہے جس کی غیبی امداد کی تُو اس وقت امید رکھتا تھا اور اسی نے تجھے دریا کی لہروں سے نجات دی تھی۔

یہ سُنکر مُنکرِ خُدا نے اسلام قبول کر لیا۔[1]

امامؒ موصوف نے اپنے اس سادہ مکالمے میں دراصل وہی دلیل پیش فرمائی تھی جو قرآن کریم کی اس آیت میں ذکر ہوئی ہے :

" وہ اللہ ہی ہے جو تم کو جنگل اور دریا میں چلاتا ہے، یہاں تک کہ جب تم کشتیوں میں سوار ہو کر بادِ موافق پر فرحاں وشاداں سفر کر رہے ہوتے ہو اور پھر اچانک تُند و تیز ہوا کا زور ہوتا ہے اور ہر طرف سے موجوں کے تھپیڑے لگتے ہیں اور مسافر سمجھ لیتے ہیں کہ طوفان میں گھر گئے۔ اس وقت سب اپنے دین کو خالص کر کے خدا ہی کو پکارتے ہیں کہ اگر تو نے ہم کو اِس بلا سے نجات دے دی تو ہم شکر گزار بندے بنیں گے "[2]

حقیقت یہ ہے کہ دہریئے کے لاشعور میں بھی غیبی قدرت رکھنے والے خدا کا تصوّر موجود ہوتا ہے جو شعور میں اُس وقت آتا ہے جب وہ مادّی اور ظاہری اسباب سے مایوس ہو جاتا ہے۔ انسان کے اِسی نفسیاتی اور لاشعوری تصوّر کو شعوُر اور عقیدے میں لانے کے لئے قرآنِ کریم میں فرمایا گیا ہے :

قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۔ (الانعام-۶۳)

---

[1] تفسیر کبیر از امام رازیؒ طبع مصر ص۹۸ ج۲ تفسیر سورۃ البقرہ آیت ۲۰ -

[2] سورۂ یونس۔ آیت ۲۲ - پارہ ۱۱ -

(کہہ دو کون بچاتا ہے تم کو صحرا اور سمندر کے اندھیروں سے ؟ جب کہ پکارتے ہو تم اُس وقت اُسی کو گڑگڑا کر اور چپکے سے)

" رمضان ۸ھ میں جب مکّہ مکرّمہ فتح ہوا، تو ابوجہل کا بیٹا عِکرمہ یمن جانے کے لئے بھاگ گیا۔ وہ جب کشتی میں سوار ہوا، تو طوفانی ہواؤں نے گھیر لیا۔ کشتی کے مسافروں نے کہا کہ خدائے واحد کو مدد کے لئے پکارو یا خود ساختہ خدا یہاں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔ عکرمہ رض نے کہا کہ یہی بات تو محمدؐ کہا کرتے تھے۔ اگر دریا میں ایک خدا کے علاوہ دوسرا کوئی نہیں بچا سکتا تو پھر خشکی پر بھی کوئی دوسرا کچھ نہیں کرسکتا۔ اے خدا! میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تو نے مجھے اس مصیبت سے نکال دیا تو میں مکّہ واپس جاکر محمدؐ کے ہاتھ میں ہاتھ دے دوں گا (ایمان لاؤں گا) مجھے امید ہے کہ وہ اپنے اخلاقِ کریمہ سے میری تقصیرات کو معاف فرما دیں گے" چنانچہ طوفان سے نجات مل گئی اور عکرمہ رض واپس آکر رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ایمان لے آئے۔ ایمان لانے کے بعد وہ کئی محاذوں پہ کفّار کے خلاف جہاد میں شریک ہوئے اور محمدؒ بن اسحٰق کی تحقیق کے مطابق جنگِ یرموک میں شہید ہوئے۔"[1]

امام ابو حنیفہؒ کا استدلال

" امام ابو حنیفہؒ دہریوں کے خلاف ایک کھلی تلوار تھے اور لادین لوگ امامؒ صاحب کو قتل کرنے کا موقع تلاش کرتے رہتے تھے۔ ایک روز امامؒ موصوف مسجد میں تشریف فرما تھے کہ دہریوں کی ایک ٹولی تلواریں لئے قتل کے ارادے سے آئی اور اس موقع پہ درجِ ذیل مکالمہ ہوا اور دہریوں نے توبہ کرکے خدا کی ہستی کو مان لیا؛

امام ابو حنیفہؒ : پہلے میرے ایک سوال کا جواب دے پھر جو چاہتے ہو کرلو۔

---

[1] "الاِصابہ فی تمییز الصّحابہ" لابن حجرؒ طبع جدید بغداد۔ ص۴۹۶، ج ۲ -

مُنکرینِ خدا : لاؤ کونسا سوال ہے ؟

امامِ ابوحنیفہ رح : اُس شخص کے بارے میں تم کیا کہتے ہو جو کہتا ہے کہ میں نے ایسی کشتی دیکھی ہے جو سامان سے لدی ہوئی ہے اور چاروں طرف سے طوفانی موجوں اور تُند و تیز ہواؤں نے اُسے گھیر لیا ہے، لیکن وہ سیدھی راہ چل رہی ہے، حالانکہ نہ تو کوئی ملّاح اسے چلا رہا ہے اور نہ پیچھے سے کوئی دوسرا شخص اسے حرکت دے رہا ہے۔ بتاؤ کیا اس شخص کی یہ بات عقلاً تسلیم کی جا سکتی ہے ؟

منکرینِ خُدا : اس بات کو تو عقل نہیں مان سکتی۔

امامِ ابوحنیفہ رح : سُبحان اللہ ! جب ایک کشتی دریا میں بغیر ملّاح کے نہیں چل سکتی اور عقل ایسی بات کو تسلیم نہیں کر سکتی، تو یہ بات کس طرح عقل میں آ سکتی ہے کہ وسیع و عریض دنیا بغیر کسی صانع کے پیدا ہو گئی ہے اور بغیر کسی منتظم اور مُدبّر کے قائم ہے اور اس کا نظم از خود چل رہا ہے ؟

یہ سُن کر منکرینِ خدا کا یہ حال ہوا کہ :

فبكوا جميعًا وقالوا صدقت واغمدوا سيوفهم وتابوا۔

(سب کے سب رونے لگے اور سب نے کہا کہ تم نے سچّی بات کہی ہے۔ اُنہوں نے اپنی تلواریں نیام میں ڈال لیں اور توبہ کر کے ایمان لے آئے)[1]

یہ وُہی دلیل ہے جو امام جعفر صادق رح نے اپنے انداز میں بیان کی تھی اور امام ابوحنیفہ رح نے اپنے انداز میں بیان کی تھی جس کا مأخذ سورۂ یونس اور سورۂ الانعام کی مذکورہ آیتیں ہیں۔

---

[1] تفسیر کبیر ص ۹۹ ج ۲ ۔

امام مالکؒ کا استدلال

"ہارون الرشید نے ایک مرتبہ امام مالکؒ سے پوچھا کہ وجودِ خالق کی دلیل کیا ہے؟ امامؒ موصوف نے آوازوں کے اختلاف، نغموں کے تنوّع اور زبانوں کے تفاوت کو بطورِ دلیل پیش کیا۔"[1]

امام شافعیؒ کا استدلال

"افراد کی ایک ٹولی نے ایک مرتبہ امام شافعیؒ سے سوال کیا: "اس بات کی دلیل کیا ہے کہ یہ عالم قانونِ طبعی کی بنیاد پر از خود قائم نہیں ہے؟"

امامِ شافعیؒ : کیا شہتوت کے پتوں کا ذائقہ، رنگ و بُو اور طبیعت ایک ہے؟

منکرینِ خدا : ہاں بالکل ایک ہی ہے۔

امامِ شافعیؒ : انہی پتوں کو جب ریشم کا کیڑا کھاتا ہے تو اس سے ریشم بن کر نکلتا ہے، شہد کی مکھی کھاتی ہے تو شہد بن جاتا ہے، بکری کھاتی ہے تو مینگنی بن جاتی ہے، لیکن جب ان کو ہرن کھاتی ہے تو مشک بن کر نکلتا ہے۔ بتاؤ وہ کون ہے جو ایک طرح کے پتوں سے یہ مختلف چیزیں بناتا ہے؟ حالانکہ ان کی طبیعت ایک ہے۔ یہ سُن کر منکرینِ خدا نے استدلال کی تعریف کی اور امامؒ موصوف کے ہاتھ پر ایمان قبول کر لیا۔"[2]

---

[1] کبیر ص ۹۹، ج ۲۔

[2] کبیر ص ۹۹، ج ۲۔

امام احمدؒ بن حنبل کا استدلال

" امام احمدؒ بن حنبل نے وجودِ خالق کے ثبوت میں یہ دلیل پیش فرمائی تھی کہ ایک مضبوط قلعہ ہے جس میں کوئی سوراخ نہیں ۔ جس کا ظاہر چاندی کی طرح ہے اور باطن سونے کی طرح ۔ اچانک اس قلعے کی دیوار ٹوٹ جاتی ہے اور اس میں سے ایک جانور نکلتا ہے جو سنتا بھی ہے اور دیکھتا بھی ہے ۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کام ایک خالق اور صانع کا ہے اور وہی خدا ہے ۔ امام موصوفؒ کی مراد انڈے سے تھی جس میں سے زندہ چوزہ نکلتا ہے[1] "

۵ ۔ ایک اعرابی کا استدلال :

ایک ان پڑھ دیہاتی سے جب اس بارے میں سوال کیا گیا تو اُس نے کہا :

البعرة تدل على البعير والروث على الحمير

واثار الاقدام على المسير فسماء ذات ابراج

وارض ذات فجاج وبحار ذات امواج اما تدل

على الصانع العليم القدير[2] ؟

(مینگنی اونٹ پہ دلالت کرتی ہے ۔ لید گدھے کی نشانی ہے ۔ نقشِ قدم کسی راہرو پہ دلالت کرتا ہے ، تو کیا برجوں والا آسمان ، وسیع راستوں والی زمین اور موجزن دریا اُس صانع کی ہستی پہ دلالت نہیں کرتے جو علم بھی رکھتا ہے اور قدرت بھی)

---

[1] کبیر ص ۹۹ ، ج ۲ ۔

[2] کبیر ص ۹۹ ۔ ۱۰۰ ، ج ۲ ۔

عبداللہ بن مُعتز باللہ کا استدلال

یہ عبداللہؒ عباسی خلیفہ المعتز باللہ کے بیٹے تھے۔ خطیب بغدادیؒ، ابن الأثیرؒ اور ابنِ کثیرؒ نے لکھا ہے کہ یہ عربی زبان کے بہترین ادیب اور شاعر بھی تھے اور گہرا اور پختہ علم بھی رکھتے تھے۔[1]

ابنِ کثیرؒ نے اِن کے درج ذیل اشعار نقل کئے ہیں جن میں وہی قرآنی طرز کا فطری استدلال پیش کیا گیا ہے ؎

فواعجباً کیف یُعصی الالٰہ ام کیف یجحد الجاھدُ

(تعجب ہے کہ خدا کی نافرمانی کیسے کی جاتی ہے یا کس طرح کوئی مُنکر اس کی ہستی سے انکار کرتا ہے)

ولِلّٰہ فی کل تحریکۃ وتسکینۃ ابداً شاھدُ

(اللہ۔ اللہ کی ہستی پر ہر حرکت اور ہر سکون میں ایک گواہ موجود ہے)

وفی کل شیئٍ لہ اٰیۃ تدل علیٰ انہ واحدُ

(اور ہر چیز میں اُس کی ایک نشانی ہے جو دلالت کرتی ہے کہ وہ یکتا ہے)[2]

ملّا علی قاریؒ نے شرح فقہ اکبر میں لکھا ہے کہ مذکورہ بالا اشعار مشہور شاعر ابو العتاہیہ اسمٰعیل بن القاسم (متوفی ۲۱۱ھ) کے ہیں، بہرحال ابن المعتز کے ہیں یا ابو العتاہیہ کے۔ ان میں اجسام و اعراض کو وجودِ صانع کی دلیل کہا گیا ہے جو مضبوط عقلی دلیل ہے۔

---

[1] تاریخِ بغداد۔ طبع بیروت۔ صـ۱۰۱، ج ۱۰۔

[2] تفسیر ابنِ کثیر صـ۱۰۳، ج ۱۔

ابونواس کا استدلال

کسی نے ابونواس سے وجودِ باری تعالیٰ کے متعلق سوال کیا، تو اُس نے قرآنی طرزِ اِستدلال کو نظم کا جامہ پہناتے ہوئے کہا ؎

"تأمّل فی نبات الارض وانظر   الیٰ آثارِ ما صنع الملیک"

(زمین کے سبزہ زاروں پر غور کرو اور ان نشانیوں کو دیکھو جنہیں بادشاہِ حقیقی نے پیدا کیا ہے)

عیون من لجین شاخصات   وازهارهی الذهب السبیک

(خالص چاندی کی طرح شفاف پانی والے چشمے ہیں اور کُندن سونے کی طرح کے پھول ہیں)

علیٰ قضب الزبرجد شاهدات   بان الله لیس له شریک

(جو زبرجد جیسی شاخوں پر گواہی دیتے ہیں کہ اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے)[1]

امیہؓ بن ابی الصّلت کا استدلال

یہ دونوں عرب کے دانشوروں میں سے تھے۔ زید بن عمرو بن نفیل تو رسولؐ اللہ کی بعثت سے پہلے وفات پا چکے تھے۔ اُمیہ نے دورِ نبوّت پایا تو تھا مگر اُس کا شعر تو مسلمان تھا، لیکن دل مومن نہیں تھا جیسا کہ حدیث میں آیا ہے :

آمن شعرهٗ وکفر قلبهٗ۔

یہ دونوں حضرات توراۃ اور انجیل کا علم رکھتے تھے اور اللہ کی ہستی کے قائل تھے۔ درج ذیل اشعار ان دونوں میں سے کسی ایک کے ہیں۔ ان اشعار میں استدلال بھی ہے،

---

[1] کبیر صـ۹۹، ج ۲ و تفسیر ابن کثیر صـ۱۰۳، ج ۱۔

درد وسوز بھی، اور منکرین کی حالت پر افسوس بھی۔ اسلوبِ کلام فطری اور شعور و جذبات کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے والا ہے ؎

(۱) وانت الذی من فضل مَنٍّ ورحمة
بعثت الیٰ موسیٰ رسولا منادیا

(اور تو ہی ہے جس نے اپنے احسان اور اپنی رحمت سے موسیٰؑ کے پاس آواز دینے والا فرشتہ بھیجا تھا)

(۲) فقلت لہ فاذھب وھارون فادعوا
الی اللہِ فرعون الذی کان طاغیا

(پس تو نے موسیٰؑ اور ہارون سے کہا تھا کہ جاؤ فرعون کو اللہ کی طرف بلاؤ جو سرکش ہو گیا تھا)

(۳) وقولا لہ ھل انت سوّیت ھذہ
بلا وتدٍ حتیٰ استقلت کما ھیا؟

(اور اُس سے کہو کہ کیا یہ آسمان بغیر ستونوں کے تو نے کھڑا کیا ہے جو ٹھہرا ہوا ہے جیسا کہ ہے)

(۴) وقولا لہٗ أانت رفعت ھذہ
بلا عمدٍ او فوق ذالک بانیا؟

(اور اس سے کہو کہ کیا تو نے اس کو ستونوں کے بغیر اٹھا رکھا ہے یا اس کے اوپر کوئی بنانے والا ہے؟)

(۵) وقولا لہ ھل انت سویت وسطھا
منیرًا اذا ماجنک اللیل ھادیا؟

(اور اُس سے کہو کہ کیا تو نے آسمان روشنی دینے والے چاند سے آراستہ کیا ہے جو رات کے اندھیروں میں راستہ دکھاتا ہے؟)

(۶) وقولا لہ من یرسل الشمس غدوۃ
فیصبح ما مست من الارض ضاحیا؟
(اور اُس سے کہو کون ہے جو ہر صبح سورج نکالتا ہے جس کی روشنی سے
زمین کی ہر چیز چمک اٹھتی ہے ؟)

(۷) وقولا لہ من انبت الحبّ فی الثریٰ
فیصبح منہ العشب یھتز رابیا؟
(اور اُس سے کہو کہ مٹی میں بیج کون اُگاتا ہے جس سے گھاس کے پتے
جھومتے ہوئے بلند ہو جاتے ہیں[۱] ؟)

یہ وہ سوالات ہیں جن کا جواب انسان کی فطرت میں پایا جاتا ہے۔ سوالیہ انداز اسی قسم کے فطری اور بدیہی حقائق کے متعلق اختیار کیا جاتا ہے۔

علامہؒ اقبال کا استدلال

علّامہ اقبالؒ یورپ کے فلسفوں سے اچھی طرح واقف تھے، لیکن انہوں نے بھی اللہ کی ہستی پہ وہی فطری طرزِ استدلال اختیار کیا ہے جو قرآن کا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

اے انفس و آفاق میں پیدا ترے آیات
حق یہ ہے کہ ہے زندہ و پائندہ تری ذات
محرم نہیں فطرت کے سرودِ ازلی سے
بینائے کواکب ہو کہ دانائے نباتات

---

[۱] تفسیر ابن کثیر ۔ طبع بیروت ۱۹۶۶ء، ص ۶۵-۶۶، ج ۴، تفسیر سورۃ الرعد آیت ۲، پارہ ۱۳ ۔

اور حضرت سعدیؒ شیرازی کا یہ شعر ؎

برگِ درختانِ سبز درنظرِ ہوشیار

ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

یہ مضمون قرآن کریم کی اس آیت سے لیا گیا ہے :

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (حٰم سجدۃ۔ ۵۳)

(عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفس میں بھی یہاں تک کہ ان پہ یہ بات کھل جائیگی کہ یہ قرآن واقعی برحق ہے)

تیسرا باب

ایمان باللہ اور انسانی فطرت

وَفِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ ○ (الذاریات ۲۱)

(اور خود تمہارے اندر بھی نشانیاں ہیں، تو کیا تم کو سوجھتا نہیں)

" محترمہ رابعہ عَدَوِیّہ رح سے کسی نے کہا کہ فلاں شخص نے اللہ کے وجود پہ ایک ہزار دلائل قائم کئے ہیں۔ ہنس کر فرمایا۔ میرے لیے تو صرف ایک دلیل کافی ہے۔

پوچھا گیا۔ وہ کونسی ہے ؟

فرمایا۔ اگر کسی صحرا میں تمہارا قدم پھسل جائے اور تم کسی گہرے کنویں میں گر جاؤ جس سے نکلنے کا کوئی راستہ اور ذریعہ موجود نہ ہو، تو بتاؤ کیا کرو گے ؟

سوال کرنے والے نے کہا: اُنَادِیۡ یَا اللّٰہ ۔ (میں پکاروں گا یا اللہ)

قالت و ذالک ھو الدلیل (فرمایا یہی تو دلیل ہے[1])

حضرت رابعہ رح نے پھر مذکورہ آیت میں بیان کردہ حقیقت کو ایک مثال میں پیش فرمایا ہے "انسان جسم، عقل اور رُوح کا مجموعہ ہے اور اس کی روح، اس کا دل اور اس کی فطرت کہتی ہے کہ پیدا کرنے والا موجود ہے۔ خدا کی ہستی پہ ایمان دل کی فطری آواز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان جب مادی، ظاہری اور طبعی اَسباب سے مایوس ہو جاتا ہے، تو اُس کا دل پکارتا ہے ؛ یا اللہ یا اللہ ! اگرچہ وجودِ خالق کے عقلی اور آفاقی دلائل بھی موجود ہیں، لیکن اُصولاً اس کا علم حضوری، بدیہی اور فطری ہے "

---

[1] تعریف عام مبدین الاسلام، از علامہ طنطاوی ۔ طبع بیروت ۱۹۷۰ء، ص ۵۳/۱۲۰

علاّمہ طنطاوی کا استدلال :

علاّمہ طنطاوی نے ۱۹۱۴ء اور ۱۹۳۹ء کی دو عالمگیر لڑائیوں کا دور دیکھا تھا۔ وہ کہتے ہیں :

"ہم سب کو گذشتہ اور اس سے پہلی جنگ کا زمانہ یاد ہے کہ لوگ کس طرح دین کی طرف متوجہ ہوگئے تھے اور اللہ کے سامنے گڑگڑا رہے تھے۔ لیڈر اور فوجی جنرل سب عبادت خانوں کی تلاش میں رہتے تھے اور عام فوجیوں کو عبادت کے لئے بلاتے تھے۔

مَیں نے چھاتہ بردار فوج کے جوان کا ایک مضمون پڑھا ہے جو جنگ کے زمانے میں "ریڈرز ڈائجسٹ" میں شائع ہوا تھا۔ وہ اپنا حال یوں بیان کرتا ہے :

میری تربیت ایک مادہ پرست گھرانے میں ہوئی تھی جس میں نہ خدا کا نام تھا، نہ نماز تھی، نہ دینی تعلیم اور نہ کوئی دینی اُستاد۔ اس گھرانے میں میری پرورش اُس جانور کی طرح ہوئی تھی جو کھانے، پینے اور جنسی لذت کے علاوہ کسی چیز کو نہیں جانتا، لیکن پہلی بار جب میں چھتری کے ذریعے اُترنے لگا اور مَیں نے اپنے آپ کو فضا میں پایا تو چھتری کھلنے سے پہلے میری زبان سے بلا اختیار یہ نکلا ! یا اللہ، یا رب ! بعد میں خود مجھے تعجب ہوا کہ یہ ایمان میرے اندر کہاں سے آگیا تھا؟"[1]

تھوڑی مدت ہوئی ہے کہ عالمی اخبارات میں اسٹالن کی بیٹی کی کہانی شائع ہوئی تھی جس میں وہ خود تعجب کرتی ہے کہ "ملحدانہ ماحول میں پرورش پانے کے باوجود مَیں مذہب کی جانب کیسے آئی ہوں"۔ لیکن اس میں حیرت و تعجب کی کوئی بات نہیں ہے۔ اس لئے کہ انسان اصل میں "حیوانِ مُتَدَیِّن" ہے۔ دینی اور مذہبی حِس اس کی فطرت میں ہے :

---

[1] تعریف بدین الاسلام۔ ص۵۲، ج ۱۔

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۔ (الروم ۳۰)

(خدا پرستی کی یہ وہ فطرت ہے جس پر اللہ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے اس فطری حالت کو کوئی نہیں بدل سکتا)

حضرت رسول اللہ نے فرمایا کہ ہر بچہ خدا پرستی کی فطری استعداد کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔

اسی فطری اور وجدانی حالت نے فرعون موسیٰؑ کو طبعی اسباب سے مایوسی کے وقت یہ کہنے پر مجبور کیا تھا کہ " میں اس خدا کو مانتا ہوں جس کو بنی اسرائیل مانتے ہیں "

اس بات کو اب یورپ کے فلسفی بھی ماننے لگے ہیں ۔ فرانس کے ایک مشہور ماہر عمرانیات نے " خدا کے وجود پر ایمان بدیہی ہے " کے عنوان سے ایک کتاب لکھی ہے۔ اُس میں اُس نے کہا ہے :" یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی شخص مرجائے اور اس نے کائنات کے خالق پر غور و فکر کیا ہی نہ ہو"[1]

اُنیسویں صدی اور انسان کا ابتدائی تصور

قرآن کریم اور تمام آسمانی صحیفوں کی تعلیم یہ ہے کہ انسان کا ابتدائی تصور خدا پرستی کا تھا ، دہریت یا اصنام پرستی کا نہیں تھا ۔ آدمؑ کی اولاد دس صدیوں یا دس نسلوں تک ۔ توحید خالق کے عقیدے پر قائم رہی ، بعد میں حضرت نوحؑ کی قوم میں اولیاء پرستی کا شرک رائج ہوگیا لیکن خدا کے وجود کا عقیدہ ان مشرکین میں بھی قائم رہا ۔

اُنیسویں صدی کے نام نہاد مغربی ماہرین آثارِ قدیمہ کے نظریات اس کے خلاف ہیں مگر بیسویں صدی کی تازہ ترین تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے کہ خدا کی ہستی پر اعتقاد انسانی

---

[1] تعریف عام بدین الاسلام ص ۵۴ ، ج ۱ ۔

تمدّن کا بالکل ابتدائی تصور تھا۔

• مولانا ابوالکلام آزاد نے ان نظریات کا خُلاصہ بڑے اچھے انداز میں بیان فرمایا ہے۔

فرماتے ہیں :

۱۔ انیسویں صدی کے آغاز میں یہ نظریہ مشہور ہوا کہ انسان ابتدا میں مَظاہرِ فطرت کی پرستش کرتا تھا۔ روشنی اور بارش کو دیوتا کا درجہ دیا جاتا تھا۔ اسی مظاہر پرستی نے اِرتقائی اصول کے تحت ترقی کر کے ایک خدا کے تصوّر کی شکل اختیار کر لی۔

۲۔ ۱۸۵۱ء میں یہ بات کہی گئی کہ خدا پرستی دراصل اَرواح پرستی کی ترقی یافتہ صورت ہے۔

۳۔ ۱۸۷۰ء میں "یُمن ازم" کا نظریہ پیش ہوا، یعنی اَجداد پرستی یا آباء پرستی نے ترقی کر کے خدا کا تصور پیدا کیا۔

۴۔ ۱۸۷۲ء میں ای۔ بی ٹیلر کا "اینیمزم" کا نظریہ مشہور ہوا، یعنی انسان کے اندر ابتدا ہی سے روحانی زندگی کا تصوّر موجود تھا جس نے خدا پرستی کی راہ دکھائی۔ یہ نسبتاً معقول نظریہ تھا اس لیے علمی حلقوں میں خاصا مقبول ہوا۔

۵۔ ۱۸۸۵ء میں "ٹوٹمزم" کا نظریہ تخلیق ہوا، یعنی حیوان پرستی۔ اس خیال کے عَلمبرداروں نے یہ فلسفہ بگھارا کہ ہندوستان میں گائے، مصر میں مگرمچھ اور بیل، شمالی خطوں میں ریچھ اور صحرانشین قبائل میں سفید بچھڑا احترام و تقدّس کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اسی حیوان پرستی نے ترقی کر کے ایک خدا کا تصوّر پیدا کیا ہے۔

۶۔ ۱۸۹۲ء میں کہا گیا کہ جادُو اور حیوان پرستی کے مرکب تصوّر نے خدا پرستی کا عقیدہ ایجاد کیا ہے۔

۷۔ لیکن بیسویں صدی کے اوائل ہی میں ماہرینِ آثارِ قدیمہ کی تازہ ترین تحقیقات اور شواہد نے اس ارتقائی نظریے کا یکسر خاتمہ کر دیا اور تسلیم کیا جانے لگا کہ خدا کی ہستی کا توحیدی اعتقاد انسانی تمدّن کا بالکل ابتدائی تصوّر ہے۔ مظاہر پرستی، ارواح پرستی، اَجداد پرستی، اوہام پرستی، حیوان پرستی، شاہ پرستی، یا جادُو کے توہّمات آغاز میں بالکل نہیں تھے، بلکہ یہ سب خُرافات بعد میں ایجاد ہوئی ہیں اور سب

غیر فطری ہیں۔ انسان کی اصل فطرت خدا پرستی ہے اور یہی اس کا ابتدائی عقیدہ تھا۔
پروفیسر شمٹ لکھتا ہے "اب یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ انسان کے ابتدائی تمدن کے تصور کی اعلیٰ ترین شکل فی الحقیقت توحیدی اعتقاد، یعنی خدائے واحد کا تصور تھا اور انسان کا دینی عقیدہ جو اس تصور سے ظہور پذیر ہوا وہ پوری طرح ایک توحیدی دین تھا۔ یہ حقیقت اب اس درجہ نمایاں ہو چکی ہے کہ تحقیق کی ایک سرسری نظر بھی اس کے لئے کفایت کرے گی"

- مصر کے تقریباً آٹھ ہزار سالہ قدیم آثار اور نوشتوں میں اَزلی بادشاہ اور معبودِ اعظم کے عقیدے ملتے ہیں۔ مصر کے اصنام دیوتا کل سب بعد کی چیزیں ہیں۔
- عراق میں دجلہ اور فرات کی وادی میں دوسری جنگِ عالمگیر کے بعد ہونے والی کھدائی سے جو آثارِ قدیمہ ظاہر ہوئے ہیں اُن سے ثابت ہوتا ہے کہ سورج، چاند اور دیگر اجرامِ فلکیہ کی پرستش کے دور سے بہت پہلے اس علاقے میں ایک "لازوال ہستی" یعنی خدا کی پرستش کا تصور موجود تھا۔
- "موہنجو دارو" کے آثارِ قدیمہ ہم کو آریاؤں کے عہد سے بھی بہت آگے لے جاتے ہیں۔ اِن آثار سے ثابت ہوا ہے کہ اس قدیم ترین بستی کے مکینوں کا تصور اصنام پرستانہ نہیں تھا، بلکہ توحیدِ الٰہی کا تصور تھا۔
- سامی قبائل کا اصل مسکن صحرائے عرب تھا۔ عاد، ثمود، عمالقہ، آرامی اور عبرانی وغیرہ سب اصل میں عرب تھے جو فلسطین، مصر، عراق اور خلیجِ فارس و دیگر علاقوں میں پھیل گئے تھے۔ اب جدید سامی اثریات کے مطالعہ سے بالکل واضح ہو گیا ہے کہ اِن تمام قوموں میں ایک غیر فانی معبود کا اعتقاد موجود تھا جو اِلٰہ یا اَللّٰہ کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ یہی اِلٰہ ہے جس نے کہیں اَیل کہیں اُلُوہ اور کہیں اِلاٰہیا کی صورت اختیار کی تھی۔

بیسویں صدی کی جستجو ہمیں جس طرف لے جارہی ہے وہ انسان کا قدیم ترین توحیدی اور غیر اصنامی اعتقاد ہے۔ اور یہ انسان کی فطرت کی آواز ہے۔ دہریت اور

اشراک کے غیر فطری تصورات بعد کے بیمار ذہن کی پیداوار ہیں[1]

---

[1] یہ ساری بحث مولانا ابوالکلام آزاد کی ام الکتاب سے مأخوذ ہے۔ ترجمان القرآن ص ۱۲۴ تا ۱۳۰، ج ۱، طبع لاہور۔

چوتھا باب

فلسفہ اور وُجودِ باری تعالیٰ

خدا کی ذات وصفات کے بارے میں اگرچہ فلسفہ راہِ راست سے بھٹک چکا ہے اور یونان کے اکثر فلسفی کہتے ہیں کہ خدا نے عقلِ فعّال کو پیدا کرکے عالم کا نظام اُس کے سپرد کر دیا ہے اور خود مُعطّل ہو گیا ہے۔ اسی طرح خدا کی صفات کا بھی وہ انکار کرتے ہیں اور شرک میں بھی مبتلا ہیں، لیکن اس بات کو تقریباً سب مانتے ہیں کہ کائنات کو ایک بے مثال ہستی نے پیدا کیا ہے اور یہ جہان مادّی طبیعت اور حادثہ و اتفاق کی تخلیق نہیں ہے۔

یونان کے قدیم ترین سات فلسفی جن کو "اَسَاطین الحکمہ" یعنی فلسفے کے سات ستون کہا جاتا رہا ہے، اس عقیدے کے حامل تھے کہ خدا موجود ہے اور وہی علّتِ اُولیٰ اور خالق ہے۔ علّامہ شہرستانی رحمہ اللہ (متوفی ۵۴۸ھ) نے ان کے خیالات ونظریات کو بڑے خوبصورت اور جامع انداز میں نقل کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

۱۔ تھیلز ملطس (۵۵۰ ق م):

یہ یونان کے شہر مُلطس کا مشہور فلسفی تھا۔ اس کا عقیدہ یہ تھا:

ان للعالم مُبدعًا لا تدرک صفته العقول من جهة هويّته وانما يُدرک من جهة آثاره[1]

(اس عالم کا پیدا کرنے والا موجود ہے جس کی شان کا ادراک عقل نہیں

---

[1] الملل والنحل، از شہرستانی، طبع مصر ۱۹۶۷ء، ص۶۱، ج ۲۔

کرسکتی، بلکہ اس کا ادراک اس کی نشانیوں سے ہی کیا جاسکتا ہے)

۲۔ انکساگورس (۵۴۷ ق م)

یہ تالیس کا شاگرد تھا اور خدا کے وجود اور وحدانیت کا قائل تھا۔ اگرچہ بعض مسائل میں اپنے استاد سے اختلافِ رائے رکھتا تھا، مگر وجودِ خالق کے مسئلے میں اس سے بالکل متفق تھا۔[۱]

۳۔ انکسیمنس (۵۲۴ ق م)

یہ بھی ملطیہ کا معروف فلسفی تھا اور کردار کے لحاظ سے بھی اچھی شہرت رکھتا تھا۔ اللہ کی ہستی کے بارے میں اس کی رائے یہ تھی:

ان الباری تعالیٰ ازلی لا اول لہٗ
ولا اخر ھو مبدأ الاشیاء ولا مبدء لہٗ[۲]

(باری تعالیٰ ازلی ہے جس کے لئے نہ ابتدا ہے اور نہ انتہا۔ وہی ساری چیزوں کا مبدأ ہے، لیکن اس کے لئے ابتدا نہیں ہے)

۴۔ ایپیڈوکلیز (۴۳۵ ق م)

یہ عظیم فلسفی اور دقیق النظر و رقیق الحال حکیم تھا۔ شہرستانی ؒ نے لکھا ہے کہ اس کی داؤدؑ اور لقمانؒ سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس کی رائے بھی دیگر یونانی حکماء کی طرح یہ تھی کہ عالم کا بنانے والا موجود ہے جو علم ہے، ارادۂ محض ہے، قدرت ہے اور عدل ہے۔[۳]

۱؎ الملل والنحل ص۶۴، ج ۲۔
۲؎ ایضاً ص۶۶، ج ۲۔
۳؎ ایضاً ص۶۸، ج ۲۔

۵۔ فیثاغورس (چھٹی صدی ق م)

یہ جزیرہ ساموس کی بستی سامیا کا رہنے والا تھا۔شہرستانی ؒ نے اس کے متعلق بھی لکھا ہے کہ یہ حضرت سلیمانؑ کا ہم عصر تھا اور اس نے سرچشمۂ نبوت سے فہم وادراک حاصل کیا تھا۔ یہ صائب الرائے اور راسخ العقل فلسفی تھا۔توحیدِ باری تعالیٰ کا قائل تھا اور کہا کرتا تھا :

"باری تعالیٰ ایک ہے ...... اور اُس کا اِدراک اُس کی نشانیوں، اُس کی مخلوق اور اُس کے کاموں ہی کے ذریعے کیا جاسکتا ہے[1]"۔

۶۔ سُقراط (متوفی ۳۹۹ سنہ ق م)

یہ اُثینا (ایتھنز) میں بت ساز باپ کے گھر پیدا ہوا تھا۔کچھ مدّت تو اپنے باپ کے پیشۂ بت سازی کو اختیار کئے رکھا، لیکن بعد میں سب کچھ چھوڑ کر فلسفے کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔اُس نے زُہد وریاضت اور تہذیب و اخلاق کو اپنا مشغلہ بنا لیا تھا اور دنیوی آسائشوں سے کنارہ کشی اختیار کرکے پہاڑی قیام گاہ میں مقیم رہتا تھا۔ فلسفے کی مختلف شاخوں میں سے اس نے الٰہیات اور اخلاقیات کو غور و فکر کا خاص موضوع بنایا۔شرک اور بت پرستی سے لوگوں کو منع کیا کرتا تھا، چنانچہ قوم کے سرداروں نے اُس کے خلاف عوام کو بھڑکایا اور بادشاہ کو اس کے قتل پہ مجبور کیا اور بادشاہ نے زہر کا پیالہ پلاکر اُسے موت کی نیند سلادیا۔

حکمت و فلسفے میں سُقراط کا استاد فیثاغورث تھا۔سُقراط کہا کرتا تھا کہ باری تعالیٰ کی ذات کا اِدراک ہماری عقل نہیں کرسکتی اس کا علم، قدرت، جُود اور حکمت بے انتہا ہے جس تک ہماری عقل نہیں پہنچ سکتی[1]۔

---

[1] الملل والنحل ص ۸۳-۸۴، ج ۲۔

سُقراط نے اپنی حکمت مکالموں کے انداز میں بیان کی ہے۔ اس کا ایک مُباحَثہ جو کسی منکرِ خدا کے ساتھ ہوا تھا یہ ہے :

سُقراط : کبھی تم کو کسی شخص کی مہارت اور صنعت نے متاثر کیا ہے ؟

منکرِ خدا : ہاں ! مجھے شعر میں فلاں شخص نے ۔ تصویر کشی میں فلاں شخص نے اور مجسّمہ سازی میں فلاں شخص نے بہت زیادہ متأثر کیا ۔

سُقراط : جو شخص ایسی تصویریں بناتا ہے جن میں نہ عقل ہو اور نہ جان، وہ زیادہ تعریف کا مستحق ہے یا وہ جس نے ذی عقل اور جاندار چیزیں بنائی ہوں ؟

منکرِ خدا : ظاہر ہے کہ ذی عقل اور ذی حیات تصویریں بنانے والا ہی زیادہ باکمال ہے۔ بشرطیکہ یہ عقل اور جان تصویر کی اپنی استعداد یا محض اتفاق کا نتیجہ نہ ہو، بلکہ واقعتاً تصویر بنانے والے کا فعل ہو ۔

سُقراط : کیا اتفاق اور طبیعت سے یہ ممکن ہے کہ انسان کو یہ اعضاء مل جائیں جو مختلف اغراض و مقاصد کے لئے استعمال ہوتے ہیں ؟ آنکھ دیکھتی ہے، کان سنتے ہیں، ناک سونگھنے کا کام کرتی ہے، زبان ذائقہ معلوم کرتی ہے اور پلک و ابرو آنکھ کی حفاظت کرتی ہے ۔ کیا یہ سب اتفاقی حادثے کا نتیجہ ہوسکتا ہے ؟ مرد اور عورت کے درمیان جنسی میلانات، ماں کے دل میں اولاد کی محبت جبکہ یہ بات یقینی نہیں ہے کہ اولاد والدین کو کبھی نفع پہنچا سکے گی ۔ اسی طرح بچے کو پیدا ہوتے ہی ماں کے سینے سے دودھ پینے کا طریقہ معلوم ہوجانا، کیا یہ ممکن ہے کہ یہ سب کچھ اتفاقات کا نتیجہ ہو ؟

منکرِ خُدا : نہیں ! یہ ساری چیزیں تو دلالت کرتی ہیں کہ کائنات کا خالق عظیم ہے لیکن ہم اپنے خالق کو دیکھتے کیوں نہیں ہیں ؟

سُقراط : تم اپنی روح کو بھی تو نہیں دیکھ سکتے، حالانکہ وہ تمہارے بدن میں موجود ہے۔[1]

---

[1] دائرۃ المعارف، طبع بیروت ۱۹۷۱ء، از فرید وجدی، جلد اوّل ص ۴۸۶ - ۴۸۸ ۔
العقائد الاسلامیہ، از سید سابق ص ۴۵ - ۴۶ ۔

علامہ طنطاوی نے بھی اسی قسم کا ایک مناظرہ نقل کیا ہے جو انہوں نے خود مادّہ پرستوں کے ساتھ کیا تھا۔ فرماتے ہیں :

" ہم چھوٹی عمر کے تھے اور استنبول وغیرہ کے کالجوں میں پڑھتے تھے۔ یہ جنگ عالمگیر اوّل کا زمانہ تھا۔ اپنے آپ کو روشن خیال (مُتَنَوِّرِیْن) کہنے والے طالب علم اور اساتذہ کہا کرتے تھے کہ انسان کو نیچر (طبیعت) نے پیدا کیا ہے اور اس کو عقل بھی اسی نے دی ہے۔ جب ہم بالغ ہوئے اور ہماری عقل پختہ ہوئی تو ہم پوچھنے لگے کہ :

یہ طبیعت (نیچر) کیا چیز ہے ؟ طبیعت تو فَعِیْلَۃٌ کا وزن ہے جو مَطْبُوْعَۃٌ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ فَمَنْ طَبَعَهَا ؟ تو اس کی طباعت اور چھپائی کس نے کی ہے ؟ یعنی اس کو کس نے پیدا کیا ہے ؟

مادہ پرست جواب دیتے۔ طبیعت اتفاقی قوانین کا نام ہے۔

ہم نے کہا۔ اس کی مثال تو پھر یہ ہوئی کہ فرض کیجئے دو آدمی کسی صحرا میں راستہ بھول گئے۔ اچانک اُن کے سامنے ایسا محل آیا جس کی دیواریں مُنَقَّش تھیں۔ کمروں میں قالین بچھے ہوئے تھے اور وقت بتانے والی گھڑی بھی موجود تھی۔ دونوں کے درمیان اس محل کے بارے میں بحث شروع ہوگئی۔ ایک نے کہا کہ اس محل کو کسی نے بنایا ہے اور فرش بھی اسی نے بچھایا ہے۔

دوسرے کی رائے تھی تم رجعت پسند معلوم ہوتے ہو۔ یہ سب کچھ تو طبیعت کا کام ہے۔

پہلا شخص کہتا ہے۔ طبیعت یہ کام کیسے کرسکتی ہے ؟

دوسرا جواب دیتا ہے۔ اصل میں یہاں پتھر پہلے سے موجود تھے۔ سیلاب، ہوا اور دوسرے عوامل کی وجہ سے یہ پتھر اکٹھے ہوکر دیواریں بن گئے۔

پہلا شخص سوال کرتا ہے اور یہ قالین کیسے بنے ؟

دوسرا جواب دیتا ہے۔ یہاں بھیڑ، بکریاں موجود تھیں جن کی اُون اُڑ کر آئی اور قالین بن گیا۔ پھر کچھ رنگدار معدنیات اڑ کر آئیں اور دیواروں اور قالینوں کو منقش

کردیا۔کرد

پہلا شخص پوچھتا ہے ۔ یہ گھڑیاں کہاں سے آگئیں ؟

دوسرا شخص جواب دیتا ہے ۔اصل میں یہاں لوہا موجود تھا جو ہواؤں کے ذریعے ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا پھر وقت گزرنے کے ساتھ یہی چھوٹے چھوٹے ٹکڑے آپس میں مل کر گھڑی کی شکل اختیار کر گئے ۔

یہ معاملہ درج کرنے کے بعد طنطاوی فرماتے ہیں ۔اب بتاؤ کہ تم ایسے شخص کو پاگل نہ سمجھو گے جو محل اور اُس کے اندر بچھے ہوئے قالینوں کے بننے کی یہ توجیہ کرتا ہے ؟

انسان کی زبان میں ۹ ہزار چھوٹے چھوٹے غُدود ہیں جن میں سے ہر ایک ذائقہ محسوس کرنے کی صلاحیّت رکھتا ہے ۔

کان کے پردے میں ایک لاکھ خُلیئے ہیں جن سے سننے کا کام لیا جاتا ہے ۔

آنکھ میں ۱۳ کروڑ (۱۳۰ ملین) خلیئے ہیں جن سے دیکھنے کا کام لیا جاتا ہے ۔

اسی طرح زمین اور اس کی معدنیات کو دیکھو ۔طرح طرح کے جانور اور نباتات ہیں ۔ وسیع وعریض صحرا ہیں ۔ دریا ہیں ۔اونچے اونچے پہاڑ ہیں گہری وادیاں ہیں ۔کیا کارخانۂ عالَم کی یہ ساری چیزیں اتفاقی حادثے اور طبیعت دنیچر کا کارنامہ ہوسکتا ہے ؟ یہی وہ دلیل ہے جس کی طرف قرآنِ کریم نے متوجّہ کیا ہے :

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخَالِقُوْنَ ۝

(کیا یہ لوگ بغیر کسی خالق کے خود بخود پیدا ہو گئے ہیں یا انہوں نے اپنے آپ کو خود بخود پیدا کیا ہے[1] ؟)

۷ ۔ اَفلاطون (متوفی ۳۴۷ سنہ ق م)

یہ سُقراط کا شاگرد اور حکماءِ سبعہ کا آخری فلسفی تھا۔ اس کے عقیدے کا خلاصہ بھی توحید

---

[1] تعریف عام بدین الاسلام ص ۶۵ تا ۶۷ ، ج ۱ ۔

وحکمت ہے۔ ارسطو نے اس کا عقیدہ بیان کیا ہے:

ان للعالم محدثاً مبدعاً ازلیاً واجباً بذاتہ[1]۔

(اس عالم کا پیدا کرنے والا اَزلی ہے جس کو کسی نے پیدا نہیں کیا)

۸۔ ۱۴ قدیم مشہور فلسفی:

شہرستانیؒ نے "الحکماء الاصول" کے زیرِ عنوان لکھا ہے کہ قدماء میں وہ فلسفی بھی شمار ہوتے ہیں جن کے خیالات کا تفصیلی علم ہمیں حاصل نہیں ہے۔ اُن میں بعض شُعراء تھے اور بعض عابد وزاہد قسم کے لوگ۔ اس کے بعد اس نے ۱۴ مشہور فلسفیوں اور ان کے شاگردوں کی آراء نقل کی ہیں جو سب کے سب خالقِ کائنات کے وجود کے قائل تھے[2]۔

۹۔ اَرسُطُوؔ (متوفی ۳۲۲ سنہ ق م)

یہ مُتأخرینِ حکماءِ یونان کا امام مانا جاتا ہے اور "مُعلّمِ اوّل" کے نام سے مشہور ہے۔ متأخرین اُن حکماءِ یونان کو کہا جاتا ہے جو مذکورہ سات فلسفیوں کے بعد گزرے ہیں۔

ارسطو ۱۷ سال کی عمر میں افلاطون کی درس گاہ میں داخل ہوا اور ۲۰۔۲۵ سال تک تعلیم حاصل کرتا رہا۔ اپنے استاد سے کئی مسائل میں اختلاف بھی رکھتا تھا، مگر وجودِ خالق کا نہ صرف قائل تھا، بلکہ اس کے بارے میں متعدد عقلی دلائل کا موجد بھی تھا۔ شہرستانیؒ نے الٰہیات کے موضوع پر اس کے نظریات ۱۶ مسائل کے نام سے نقل کئے ہیں[3]۔

۱؎ الملل والنحل۔ ص۹۶، ج ۲۔

۲؎ ایضاً، باب ثانی کی پوری فصل ثانی ص ۹۵ تا ۱۱۹۔ ج ۲۔

۳؎ ایضاً ایضاً ایضاً

۱۰ ۔ آٹھ مشہور فلسفی

متأخرینِ فلاسفۂ یونان میں آٹھ دوسرے مشہور فلسفی بھی گزرے ہیں جو خدا کی ہستی اور بعض دیگر مسائل میں ارسطو سے متفق تھے ۔ ان کے نام یہ ہیں :

اسکندر رومی ۔ (مشہور سکندر اعظم جو ارسطو کا شاگرد تھا)

دَیو جانس الکلبی ـــــ الشیخ الیونانی

ثاوفرسطیس ـــــ برقلس

ثامسطیوس ـــــ سکندر افرودیسی

فرفریوس ـــــ [1]

۱۱ ۔ ہندومت کی مذہبی کتابیں :

ہندوستان میں کچھ لوگ دہریت کے قائل بھی رہے ہیں، لیکن اکثریت خدا کے وجود کی قائل تھی ـــ اور آج بھی قائل ہے ۔ براہمۂ ہند کا مذہبی پیشوا برہما خدا کا قائل تھا ۔ اس کا قول ہے :

"عقلی دلائل سے ثابت ہوتا ہے کہ اس جہان کا خالق موجود ہے جو عالم ہے، قدرت والا ہے، حکمت والا ہے اور اس کے اپنے بندوں پر احسانات ہیں جن کا شکر ادا کرنا واجب ہے" [2]

ہندومت کی مذہبی کتابوں میں چار وید نمایاں ہیں جو یہ ہیں :

رِگ وَید ـــ سام وَید ـــ یُجروید ـــ اور اتھر وید

رِگ وَید میں خدا کی ہستی اور توحید کا تصور ان الفاظ میں موجود ہے :

---

[1] الملل والنحل باب ثانی کی پوری فصلِ ثالث، ص ۱۱۹ تا ۱۵۸، ج ۲ ۔

[2] ایضاً ص ۲۵۱، ج ۲، باب رابع فصل اوّل ۔

"وہ ایک ہے، مگر علم والے اُسے مختلف ناموں سے پکارتے ہیں"

(۱۶۴-۴۶)

"وہ ایک نہ آسمان ہے، نہ زمین ہے، نہ سورج کی روشنی ہے، نہ ہوا کا طوفان ہے۔ وہ کائنات کی روح ہے۔ تمام قوتوں کا سرچشمہ، لازوال، ہمیشہ رہنے والا" (حصہ دہم ۱۲۱-۲)

"ہم اسے دیکھ نہیں سکتے، ہم اسے پوری طرح بتلا نہیں سکتے" (ایضاً)[1]

ے مشکل حکایتیست کہ ہر ذرّہ عین اوست
اما نمی تواں کہ اشارت باو کنند

وید قدیم ترین کتابیں ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں دو ہزار قبل مسیحؑ کے زمانے میں لکھی گئیں۔ ان میں اگرچہ بیہودہ رسوم اور بیچ اعتقادات کا ایک گورکھ دھندا بھی ہے، لیکن خدا کے وجود کے عقیدے سے اس مذہب کے بانی اور اس کے فلسفیوں کا فکر خالی نہ تھا اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ دنیا کی اکثریت منکرِ خدا نہیں۔

رگ وید کا مذکورہ بالا اقتباس مصر کے ممتاز محقق محمد سیّد گیلانی نے بھی نقل کیا ہے[2]

۱۲۔ کنفیوشس (متوفی ۴۹۸ ق م)

چین میں قدیم ترین زمانے سے اِلٰھۃٌ باطلہ کی پرستش کے باوجود ایک ایسی ہستی کے وجود کا اعتقاد بھی تھا جو رَبُّ الْاَرْبَاب، حَاکِمُ الْحُکّام اور آسمانی ہستی کہلاتی تھی۔ آسمانی کی نسبت اُسے اُس کے عُلوِّ شان کی وجہ سے دی گئی تھی، تاہم اُن کا سیاسی نظام جابرانہ بادشاہت پر مبنی تھا۔

چینی فلسفی کنفیوشس ۵۵۱ ق م میں پیدا ہوا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے

---

[1] ترجمان القرآن از مولانا ابوالکلام آزاد۔ ص ۱۳۸، ج ۱۔

[2] ذیل الملل والنحل، از محمد سیّد گیلانی۔ ص ۱۰۔ یہ الملل کا تکملہ ہے۔

کہ یہ "کنگ فوزی" سے بگڑا ہوا لفظ ہے۔ سیّد گیلانی مصری کے خیال میں یہ دو لفظوں سے بنایا گیا ہے۔ کونج جو اس کے قبیلے کا نام تھا اور تونس جس کے معنی ہیں رئیس یا فیلسوف تو کنفیوشس کا مفہوم ہوا: کونج قبیلے کا رئیس اور فلسفی۔ اس کی عمر ۳ سال تھی کہ والد مرگیا اور اپنے پیچھے فقیر و تنگدست گھرانا چھوڑ گیا جس کا کوئی ذریعۂ معاش نہ تھا۔ کنفیوشس ایک امیر شخص کی بکریاں چراتا تھا اور فارغ اوقات میں فلسفہ وغیرہ کی تعلیم حاصل کرتا تھا۔ عمر کے بائیسویں ۲۲ سال میں اُس نے "فلسفۂ اخلاق" اور "فلسفۂ سیاسیات" کی تعلیم دینے کے لئے ایک مدرسہ قائم کیا جس میں وہ نوجوانوں کو تربیت دیا کرتا تھا۔ اس کے ساتھ وہ بعض سرکاری افسروں کے مُشیر کی ذمہ داری بھی نبھاتا تھا۔ ۴۹۶ سنہ ق م میں اُس کو رئیسُ الوُزراء، یعنی وزیرِاعظم مقرر کیا گیا، لیکن حاسدین کی سازشوں سے تنگ آکر اُس نے یہ عہدہ چھوڑ دیا اور نوجوانوں کی تعلیم کے لئے مختلف علاقوں کے دورے شروع کر دیے۔

ان سرگرمیوں کے ساتھ اس نے متعدد کتابیں بھی لکھیں جن کی وجہ سے چینی قوم میں اُسے ایک مقدّس انسان کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ اُس کی تعلیم اصلاحِ نفس اور اصلاحِ معاشرہ کے ایسے اصولوں پر مبنی تھی جن کی بنیاد محبت، اُخوّت اور عدل پر استوار تھی۔ چار چیزیں اُس کی تعلیم میں "فضائلِ رئیسیّہ" کی حیثیت رکھتی تھیں:

۱۔ والدین کی فرمانبرداری اور اُن کے ساتھ تواضع کا سلوک۔
۲۔ حکمرانوں کی اطاعت، یعنی ملکی قوانین کا احترام۔
۳۔ والدین کی طرح بڑے بھائی کی فرمانبرداری اور احترام۔
۴۔ دوستوں کا آپس میں مخلصانہ تعلق اور ایک دوسرے کو دھوکہ نہ دینا۔

کنفیوشس کہا کرتا تھا کہ "میں ہمیشہ ایک اِلٰہِ اعظم کی عبادت کرتا ہوں[1]"۔

---

[1] ذیل الملل ص۱۹ تا ۲۱، نقلاً عن الادیان الکبریٰ، ترجمہ حسن صعب۔

۱۳۔ لاؤتزے (ولادت ۶۰۴ھ ق م)

یہ بھی چینی فلسفی تھا اور خدا کے وجود کا قائل۔ اُس کی اور کنفیوشس کی تعلیمات میں بہت زیادہ فرق تھا، لیکن وجودِ خالق کے عقیدے میں دونوں متفق تھے، البتہ لاؤتزے وحدۃ الوجود کی طرف مائل تھا[1]۔

۱۴۔ جاپانی قوم کا تصوّرِ الٰہ :

جاپانی قوم آغاز میں اُرواح پرستی، مظاہر پرستی اور قبیلہ پرستی میں مبتلا تھی، لیکن خالقِ کائنات کے وجود کی قائل تھی۔ بعد میں اُن کی عقیدت کا مرکز بیاتو قبیلے کا سردار المیکادو نامی ایک شخص بن گیا جسے سورج کا اوتار مانا جاتا تھا۔ اسی سردار پرستی سے بادشاہ کی پرستش کا تصوّر ابھرا جس کی خوشنودی کے لئے اپنی جان کی قربانی دینا، اُسے سجدہ کرنا اور دیگر رسومِ تعظیم اداکرنا اس قوم کا مذہبی اور سیاسی نشان بن گیا۔

جنگِ عالمگیر دوم (۱۹۳۹ء-۱۹۴۵ء) تک جاپان میں یہی شاہ پرستی کا مذہب جاری تھا۔ جاپان پر امریکی تسلّط کے بعد یہ تصوّر ختم یا کم ہوا، لیکن خدا کے وجود کی یہ قوم اور اس کے فلسفی بہرحال قائل رہے اور اسی نکتے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ خالص دہریت دنیا کے فلسفیوں کا نظریہ کبھی بھی نہیں رہا[2]۔

۱۵۔ صابئین اور رُوحانیین :

صَبُوَۃٌ کے معنی ہیں کجی، اسی سے ایران وعراق کا مشہور فرقہ صابئین کے نام سے معروف ہوا ہے۔ ان لوگوں کا دعویٰ تھا کہ خدا تک رسائی حاصل کرنے کا ذریعہ آسمانی جواہر

---

[1] ذیل الملل۔ ص ۲۶-۲۷۔

[2] ذیل الملل و النحل۔ ص ۲۹-۳۰۔

مجرّدہ ہیں جو پاکیزہ، مقدّس اور روحانی مخلوق ہیں۔ اسی وجہ سے یہ اپنے آپ کو "اَصْحَابُ الرُّوْحَانِیَّات" بھی کہتے تھے۔

یہ "عاذِی مُوْن اور" ھُرْمُس" یعنی حضرت شیثؑ اور حضرت ادریسؑ کی نبوت کے تو قائل تھے، لیکن ان کے علاوہ سلسلۂ نبوت کے بالکل منکر تھے، بلکہ عقیدۂ نبوت کو شخصیت پرستی اور انسانوں کی غلامی کہا کرتے تھے۔ وہ صرف عقل ہی کو طریقۂ عبادت معلوم کرنے کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ ایران و عراق کا قدیم ترین مذہب یہی تھا۔ انہوں نے اجرامِ فلکیہ۔ سورج، چاند اور ستاروں کے نام پر ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں بُت اور ہیاکل بنائے تھے اور ان بتوں کی پرستش کو قربِ خداوندی کے حصول کا وسیلہ سمجھتے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ اسی ستارہ پرستی کی تردید فرمایا کرتے تھے، تاہم باری تعالیٰ کے وجود کے یہ لوگ بھی قائل تھے۔ شہرستانیؒ لکھتے ہیں :

ومذهب هٰؤلاء ان للعالم صانعاً فاطراً حكيماً مقدساً عن سمات الحدثان[1]

(ان کا مذہب یہ تھا کہ عالم کا پیدا کرنے والا موجود ہے۔ جو حکمت والا ہے اور حادث ہونے کے ہر عیب سے پاک ہے)

۱۶ - زردشتِ ایرانی :

۵۵۰ء ق م اور ۵۸۳ء ق م کے درمیان زردشت کا ظہور ہوا۔ بشتاسب بن لہراسب کی حکومت کے تیسویں سال میں اُس نے نبوّت کا دعویٰ کر دیا اور ژند اور پاژند کے نام سے دو کتابیں لکھیں۔ ژند کے معنی ہیں تفسیر اور پاژند کے معنی ہیں تفسیر التفسیر۔ اُس نے اپنی کتاب میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق پیشین گوئی بھی کی ہے :

تمسكوا بما جئتكم به الى ان يجيئكم صاحب

---

[1] الملل والنحل۔ ص ۶، ج ۲۔

الجمل الاحمر یعنی محمداً (صلی اللہ علیہ وسلم) و ذٰلک علیٰ رأس الف سنۃٍ وستّ مائۃٍ[1]

(اے لوگو! میری تعلیمات پر اسوقت تک عمل کرتے رہو جب تک تمہارے پاس سرخ اونٹ والا نہیں آجاتا، یعنی محمدؐ اور وہ ۱۶ سو ۱۶۰۰ سال کے بعد آئیگا)

ہمارے مؤرخین بالعموم یہ لکھتے ہیں کہ مجوسیت (آتش پرستی) کا بانی یہی زردشت تھا۔ ابن جریر طبریؒ اور ابن کثیرؒ نے ہشام بن الکلبی کے حوالے سے لکھا ہے کہ مجوسیت کی اشاعت اسی نے کی تھی۔ انہوں نے اہلِ کتاب کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ زردشت اصل میں فلسطینی اور اَرمیاؑ کا خادم تھا، لیکن بعد میں اُسے دھوکہ دے کر آذربائیجان آگیا اور اس علاقے میں آتش پرستی کی تبلیغ میں مصروف ہوگیا۔ یہاں آنے کے کچھ عرصہ بعد اس نے بلخ جاکر بشتاسب کو اپنے مذہب کی دعوت دی۔ بشتاسب نے اس مذہب کو اختیار کر لیا اور اپنی رعایا کو بھی اس کے قبول کرنے پر مجبور کیا۔ بیان کیا جاتا ہے اس مقصد کے لئے اُس نے بہت سے لوگوں کو قتل تک کیا[1]

ابن الاثیرؒ نے یہی بیان ایران کے مجوسیوں کے حوالے سے لکھا ہے[2] لیکن مصر کے مشہور محقق فرج اللہ زکی الکردی کی تحقیق یہ ہے کہ قرآن کریم کی سورۂ فرقان اور سورۃ قٓ میں اصحاب الرّسّ نام کی جس قوم کا ذکر ہوا ہے وہ اسی زردشت کی قوم تھی اور ایران کا نبی تھا (الکردی نے اس کا نام ابراہیم زردشت لکھا ہے) اس نے اپنی قوم کو توحید کی دعوت دی، لیکن لوگوں نے یہ دعوت قبول نہ کی اور تباہ ہوگئے۔

رسّ دراصل اُرَس کی تخفیف ہے اور یہ کوہ قفقاز کے علاقے میں ایک بستی یا اس بستی کی ایک نہر کا نام تھا جس کی مناسبت سے اس علاقے کو وادیٔ آرس کہا جاتا تھا۔ ہند اور ایران میں زردشت کے لاکھوں پیروکار آج تک موجود ہیں۔ قدیم فارسی زبان میں

---

[1] تاریخ طبری ص۲۸۲، ج ۱، طبع بیروت، البدایہ لابن کثیر طبع بیروت ۱۹۶۶ء، ج ۲، ص۴۲۔

[2] الکامل لابن الاثیر ج ۱، ص۲۵۔

اُس کی ایک کتاب بھی موجود ہے جس میں اُس کے مذہب کے بنیادی مسائل واحکام کے علاوہ بشارتیں بھی ہیں، جیسا کہ دوسری آسمانی کتابوں کا انداز ہے۔ انہی بشارتوں میں سے ایک الرّسُول کے ظہور کی بشارت بھی ہے۔[1]

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے اصحاب الرّس کے بارے میں ۸ اقوال نقل کئے ہیں، جن میں آٹھواں یہی فرج اللہ زکی کا قول ہے، اور لکھا ہے کہ قطعی بات تو نہیں کہی جا سکتی لیکن میرا وجدان کہتا ہے کہ یہی آخری قول راجح ہے۔ اس قول کے دلائل تفصیل کے ساتھ اصحاب الرس کی بحث میں بھی ذکر کئے ہیں اور ذوالقرنین کی بحث میں بھی بیان کئے ہیں۔[2]

مولانا ابوالکلام آزاد نے زردشت کی نبوت کا ذکر تو نہیں کیا، لیکن اُس کو توحید کا داعی ضرور قرار دیا ہے جو ایرانیوں کو قدیم عقائد (صابی عقائد) سے نجات دلانے کی جدوجہد کرتا تھا۔ مولانا لکھتے ہیں۔ اس نے دیوتاؤں کی جگہ ایک خدا کی تعلیم دی جو بے ہمتا ہے، بے مثال ہے، نور ہے، پاکی ہے، سرتاسر حکمت اور ساری کائنات کا خالق ہے۔

زردشت نے انسان کے لئے دو عالم بتلائے ہیں ایک عالم دنیوی زندگی کا ہے اور دوسرا مرنے کے بعد کی زندگی کا۔ مرنے کے بعد جسم تو فنا ہو جاتا ہے، مگر روح باقی رہتی ہے اور اپنے اعمال کے مطابق جزا پاتی ہے۔[3]

جدید محققین کا بالعموم یہی خیال ہے کہ کواکب پرستی (صابئیت) اور آتش پرستی (مجوسیئت) ایران اور عراق کا قدیم مذہب تھا جس کی تردید کے لئے زردشت نے کام کیا، لیکن اس کے انتقال کے چند صدیوں بعد پھر پرانا مذہب آتش پرستی دوبارہ مقبول ہو گیا اور اس کی نسبت زردشت کی جانب مشہور کر دی گئی۔

ظہورِ اسلام کے وقت ایرانی آتش پرست تھے اور کہتے تھے کہ ہمارے نبی زردشت

---

[1] برحاشیہ البدایہ والنہایہ، ج ۲، ص ۴۲-۴۳۔

[2] قصص القرآن، ج ۳، ص ۸۲ اور ج ۳، ص ۱۲۶، طبع کراچی ۱۹۷۲ء۔

[3] ترجمان القرآن، ج ۱، ص ۱۴۶۔

کی یہی تعلیم تھی کہ آگ کی پوجا کرو اور اسے بجھنے نہ دو ۔ مسلمان مؤرخین نے یہی بات اپنی تاریخوں میں لکھ دی ۔ حالانکہ امرِ واقعہ اس کے برعکس تھا، بہرحال حقیقت جو بھی ہو اتنی بات تو تسلیم کی جاتی ہے کہ زردشت خدا کے وجود کا قائل تھا اور یہی ثابت کرنا اس وقت ہمارا مقصد ہے ۔

۱۷۔ قدیم عربوں کا عقیدہ :

علامہ شہرستانی ؒ نے لکھا ہے کہ عرب میں ظہورِ اسلام سے قبل دو قسم کے لوگ تھے۔ ایک وہ جو خالقِ کائنات کے قائل نہیں تھے ۔ اُن کو مُعَطِّلَۃ کا نام دیا گیا ہے، یعنی جاہلیت خالصہ کے علمبردار ۔ اُن کی تعداد بالکل تھوڑی تھی ۔ یہ فلسفی کہلاتے تھے ۔ وَمَا یُهْلِكُنَا اِلَّا الدَّهْرُ (ہلاک نہیں کرتا ہم کو مگر زمانہ) انہی لوگوں کا قول ہے ۔

ان کے مقابلے میں عربوں کی غالب اکثریت کا عقیدہ یہ تھا کہ اس جہان کا پیدا کرنے والا اللہ ہے اور وہی حقیقی معنوں میں مختارِ کُل ہے، لیکن اُنہوں نے اللہ کا قرب حاصل کرنے اور اُس تک پہنچنے کا ذریعہ بت پرستی کو سمجھ لیا تھا ۔ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (ہم پرستش نہیں کرتے ان کی مگر اس لئے کہ قریب کر دیں ہم کو اللہ سے) اسی غالب اکثریت کا قول ہے ۔ ان میں سے بعض دانشور ایسے بھی تھے جو نہ صرف یہ کہ اللہ کے وجود کو مانتے تھے، بلکہ آخرت کے بھی قائل تھے اور رسالت کے بھی منتظر تھے کہ کوئی نبی آکر ہم کو اللہ کی عبادت کا طریقہ بتائے ۔ شہرستانی ؒ نے ان کو مُحَصِّلَہ کا نام دیا ہے اور مثال کے طور پر سات ممتاز دانشوروں کے اقوال و اشعار نقل کئے ہیں ۔ اُن کے اقوال میں صاف طور پر توحید اور آخرت کا اقرار موجود ہے ۔ اُن سات " مُحَصِّلَۃُ الْعَرَب " کے نام یہ ہیں :

زید بن عمرو بن نُفَیل	قُس بن ساعدہ
عامر بن ظرب عدوانی	طابخہ بن ثعلب کا غلام
نَابِغَہ ذُبیانی	زہیر بن ابی سلمیٰ

علاف بن شہاب تیمی[1]

---

[1] الملل والنحل ج۔۲۔ ص۲۴۱-۲۴۴ ۔

حافظ ابن کثیرؒ نے ان میں سے اکثر کا ذکر کیا ہے، اور اُمیّہ بن ابی الصّلت، زید ابن عَمرو بن نفیل اور قس بن ساعدہ کے اقوال تفصیل کے ساتھ نقل کئے ہیں۔ ورقہ بن نوفل بھی توحید، آخرت اور رسالت کا قائل تھا۔ اُس کا ذکر تو صحیح بخاری، باب بدء الوحی میں بھی آیا ہے۔

۱۸۔ دُنیا کے ۲۴۲ ممتاز فلسفی

علّامہ سیّد سابق نے ایک مغربی مفکّر کا قول نقل کیا ہے کہ اُس نے دنیا کے بڑے بڑے ممتاز فلسفیوں کے نظریات کا جائزہ بڑی عرق ریزی سے لیا تو نتیجہ یہ نکلا:

۲۴۲ : خدا کے وجود پر پختہ اور راسخ ایمان رکھتے تھے۔

۲۸ : کسی عقیدے پر نہیں پہنچے تھے۔

۲۰ : اس موضوع پر سرے سے غور ہی نہیں کیا تھا[۱]۔

مذکورہ بالا بحث سے ثابت ہوتا ہے کہ فلاسفۂ عالم کی غالب اکثریت خدا کے وجود کی قائل رہی ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اللہ کی ہستی کو ماننا خلافِ عقل ہے اور عقل کسی غیر محسوس چیز کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہے، تو کیا مذکورہ بالا فلسفی عقل سے عاری تھے؟ یہ تو دنیا کے مانے ہوئے حکماء، عُقلاء اور فلاسفہ تھے!!

حقیقت یہ ہے کہ خدا پر ایمان لانا خلافِ عقل نہیں، بلکہ اُس کا انکار کرنا بے عقلی اور حماقت ہے۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ آثار کو مانتے ہوں، مگر مُؤثّر کے وجود کو تسلیم نہ کریں، صَنعت و مَصنوعات کو دیکھتے ہوں اور صانع کو نہ مانیں ـــ، وہ بے وقوف اور بے عقل ہی ہو سکتے ہیں۔

۱۹۔ فلاسفۂ اسلام:

فلاسفۂ اسلام کے عقائد اس بارے میں واضح اور مشہور ہیں۔ فلسفۂ یونانیوں اور اہلِ

---

[۱] العقائد الاسلامیہ ص۷۹۔

یورپ کی ذاتی جائداد نہیں ہے جس میں کوئی دوسرا آدمی قدم نہ رکھ سکتا ہو۔ مسلمان فلسفی بلامُبالغہ سینکڑوں کی تعداد میں ہیں اور اُنہوں نے اس میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ کِندی، ابنِ سینا، فارابی، ابن رُشد، اَلبیرونی، الغزالیؒ، الرازیؒ، ابنِ تیمیہؒ، رومیؒ، طوسی اور شاہ ولی اللہؒ وغیرہ وہ فلاسفۂ اسلام ہیں جن کے سامنے یونانی اور یورپین فلسفی طفلِ مکتب نظر آتے ہیں۔

عقلِ انسانی غیر محسوس اور غیر مادّی چیزوں کی اصل، کُنہ اور ماہیّت معلوم نہیں کر سکتی اور نہ اُن کی صفات کی حقیقت کے بارے میں حتمی فیصلہ کر سکتی ہیں۔ اس موضوع پر مشہور فلسفی کانٹ (متوفی ۱۸۰۴ء) نے مستقل کتاب لکھی ہے، لیکن مسلمان علماءِ علم کلام نے اُس سے بہت پہلے یہی بات بیان کر دی تھی۔ سید شریف جرجانیؒ نے شرح مواقف میں اور امام غزالیؒ اور دیگر فلاسفۂ اسلام نے اپنی تصانیف میں عقل کا دائرۂ کار متعین کیا ہے کہ وہ صرف مادّی اور حسّی حلقوں میں کام دے سکتی ہے۔ محسوسات سے معقولات تک پہنچنا اور جزئیات سے کلیّات مستنبط کرنا بہرحال عقل کا کام ہے۔ بالفاظِ دیگر آثار سے مؤثِر تک رسائی حاصل کرنا، مُسبّبات سے اسباب کا پتہ لگانا، مصنوعات سے صانع کا علم حاصل کرنا اور معلول سے علّت کا ادراک عقل کے دائرۂ کار میں شامل ہے۔

کائنات کی تمام اشیاء آثار اور نشانیاں ہیں، جو عقلاً و بداہتاً ایک مؤثِر کے وجود پر دلالت کرتی ہیں۔ اسی حقیقت کو دنیا کے عُقلاء اور فلاسفہ نے عقلی استدلال سے معلوم کیا ہے جو فطرت کے بھی مطابق ہے اور شریعت کے بھی۔ جو لوگ اس حقیقت کو نہیں مانتے وہ صرف اسلام اور شریعت ہی کے منکر نہیں ہیں، بلکہ اپنی فطرت اور اپنی عقل کے بھی دشمن ہیں۔

پانچواں باب

مغربی فلاسفہ

سترھویں صدی عیسوی میں یورپی ممالک میں بڑے بڑے فلاسفہ پیدا ہوئے، جنہوں نے "جدید فلسفے" کی بنیاد رکھی مثلاً :
گلیلیو (متوفی ۱۶۴۲ء)، ڈیکارٹ (متوفی ۱۶۵۰ء) اور نیوٹن (متوفی ۱۷۲۷ء) اس دورِ جدید کے اکابر فلاسفۂ یورپ میں سب سے زیادہ مشہور ہیں اور ان کو فلسفۂ جدید کے تین ستون کہا جا سکتا ہے۔ ان میں ڈیکارٹ کو اہلِ مغرب "ابو الفلسفۃ الجدیدۃ" یعنی فلاسفۂ جدید کا باوا آدم سمجھتے ہیں۔ اُس کے مداحوں اور پیروکاروں کا دعویٰ ہے کہ ارسطو (متوفی ۳۲۲ ق م) کے بعد فلسفے کو نئی زندگی دینے والا ڈیکارٹ ہی ہے، تاہم اُن کا یہ دعویٰ کوئی ثابت شدہ تاریخی حقیقت نہیں، بلکہ محض تعصّب پر مبنی ہے۔

ارسطو اور ڈیکارٹ کے درمیانی دور میں ایسے بہت سے فلسفی گزرے ہیں جن سے اہلِ یورپ نے روشنی حاصل کی اور علوم کی نئی جہتیں معلوم کرنے کے قابل ہوئے۔ دورِ جدید کے یورپی فلسفی اگرچہ خدا کی شانِ اُلوہیّت اور اُس کی ذات کی معرفت کما حقہٗ حاصل نہیں کر سکے — اور اُن کا رجحان اللہ کی اطاعت کے بجائے اُس سے بغاوت کی جانب زیادہ ہے لیکن وہ خالقِ کائنات کی ہستی کے بہر حال قائل ہیں۔

وجودِ خالق کے بارے میں اس دور کے مغربی فلاسفہ کے نظریات، مشہور مصری محقق محمد فرید وجدی (متوفی ۱۹۵۴ء) نے تاریخی اور زمانی ترتیب کے ساتھ بڑے اچھے انداز میں نقل کئے ہیں۔ اُن کی مشہور کتاب "دَائِرَۃُ مَعَارِفِ الْقَرْنِ الْعِشْرِیْن"

سے بطور نمونہ چند فلاسفہ کے عقائد و نظریات نقل کرنا فائدے سے خالی نہ ہو گا :

۱۔ ڈیکارٹ (۱۵۹۶ء-۱۶۵۰ء)

ڈیکارٹ فرانس کا مشہور فلسفی تھا جس نے اپنے فکر کی بنیاد شک پر رکھی تھی۔ اُس نے اپنے ذہن سے ہر قسم کے تقلیدی اور موروثی عقائد کو نکال دیا تھا اور کائنات کی ہر چیز کے بارے میں شک کو اپنا اصول بنا لیا تھا۔

آفاقی دلائل سے آنکھیں بند کر کے جب اس فلسفی نے اپنی ذات اور اپنے نفس کا جائزہ لیا اور خلوت میں بیٹھ کر غور و فکر کیا، تو ایک چیز کے موجود ہونے پر شک نہ کر سکا اور وہ تھی اس کی اپنی ذات (انا) اس نے کہا کہ "شک کر رہا ہوں اور شک کے لیے شک کرنے والے کا وجود ضروری ہے، لہٰذا میں موجود ہوں" چنانچہ مطالعۂ نفس کے بعد ڈیکارٹ نے اللہ کی ہستی پر جو انفسی دلائل (نفسیاتی دلائل) قائم کئے ہیں ان کا خلاصہ درج ذیل ہے :

۱۔ "میں اپنے آپ کو اس حقیقت کے ماننے پر مجبور پاتا ہوں کہ میرے اندر شعور اُس ذات نے پیدا فرمایا ہے جو ہر قسم کی صفاتِ کمال سے مُتَّصِف ہے اور وہ اللہ ہی کی ذات ہے"

۲۔ "اگر میں نے اپنے آپ کو خود پیدا کیا ہوتا، تو میں اپنے اندر وہ تمام کمالات بھی پیدا کر لیتا جن کا تصور کیا جا سکتا ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے، پس اِس سے ثابت ہوتا ہے کہ مَیں کسی اور کا پیدا کردہ ہوں اور مجھے پیدا کرنے والا تمام صفات کا جامع ہے"

۳۔ "میرے اندر خدا کی ذاتِ کاملہ کے وجود کا ایسا واضح اور مکمل شعور موجود ہے جو میرے اس شعور سے کسی طرح بھی کم نہیں ہے کہ مُثَلَّث کے زاویوں کا مجموعہ دو قائم زاویوں کے برابر ہوتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ موجود ہے"

۴ - " اُس ذاتِ کاملہ کو اگر میں اللہ کہوں، تو اس سے مراد وہ ذات ہے جو ازلی اور ابدی ہے، اپنے وجود میں مستقل ہے، ہر چیز کا علم رکھتی ہے، ہر چیز پر قُدرت رکھتی ہے اور سارا جہان اُسی کا پیدا کردہ ہے ۔ میں جب بھی پورے انہماک سے غور و فکر کرتا ہوں تو اس بات پر میرا یقین مزید پختہ ہو جاتا ہے کہ میرا یہ شعور و احساس خود میری تخلیق نہیں ہے ۔ اور مجھ پہ واضح ہوتا ہے کہ اللہ کی ہستی ایک اٹل اور ثابت شدہ حقیقت ہے[1]"۔

ڈاکٹر سلیمان دینا نے بھی ابن سینا کی کتاب الاشارات کے قسم ثانی کے مقدمے میں ڈیکارٹ کی کتاب " تأملات " سے درج بالا اقتباسات نقل کئے ہیں[2]۔

۲- اَسپِینُوزا (متوفی ۱۶۷۷ء)

اَسپِینُوزا ایک یہودی فلسفی تھا جس نے مشہور یہودی فلسفی موسیٰ بن میمون (متوفی ۱۲۰۴ء) کی کتاب " دَلالَۃ الحائرین " کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا تھا اور موسیٰ بن میمون کے نظریات اسلامی فلسفی فارابی (متوفی ۳۳۹ھ) کی تعلیمات کا خلاصہ ہیں جنہیں یہودیت کا جامہ پہنا دیا گیا ہے، بہرحال اَسپِینُوزا نے اللہ کے وجود کے بارے میں وہی طرزِ استدلال اپنایا ہے جو ڈیکارٹ اور اس جیسے دوسرے لوگوں نے اختیار کیا ہے، یعنی فطری شعور"۔

اَسپِینُوزا کہتا ہے :

" اللہ کا وجود قدیم اور اَزلی ہے اور تمام کائنات کا وجود اسی کا عطا کردہ ہے ..... نفسِ انسانی کا وجود بھی چونکہ اللہ ہی کا دیا ہوا ہے اس لیے یہ نفسِ انسانی فطرتاً اُس کی جانب مائل اور متوجہ رہتا ہے اور اس کا کمال یہی ہے کہ وہ اللہ

---

[1] فرید وجدی : دائرۃ معارف القرن العشرین، طبع بیروت ۱۹۷۱ء ج ۱، ص ۴۹۰-۴۹۱، مادہ الہ ۔

[2] مقدمہ الاشارات القسم الثانی، طبع دار المعارف مصر ۱۹۵۷ء، ص ۵۹-۶۰ ۔

کا قرب حاصل کرے اور اس کی ذات سے صدقِ دل کے ساتھ محبت رکھے"[1]

۳- فِنیلُون :

فِنیلُون بھی سترہویں صدی مسیحی کے بڑے فلسفیوں میں سے ہے۔ اُس نے اپنی کتاب "وجود اللہ وصفاتہ" میں یہ براہین پیش کئے ہیں :

۱- " میں نے بحث و تحقیق کے دوران میں اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ میں اپنی ذات کا خود خالق نہیں ہوں اور میری ذات کمالِ مُطلق سے بہت زیادہ دور ہے۔ اس لئے کہ میں بعض چیزوں کو جانتا ہی نہیں ہوں، اکثر دھوکے میں پڑ جاتا اور شک و تذبذب کا شکار ہو جاتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ اِن تغیّرات اور نقائص کے ہوتے ہوئے مَیں اپنے لئے کمالِ مُطلق کا دعویٰ کیسے کر سکتا ہوں! اور جب میں نہ خود پیدا ہوا ہوں اور نہ کمالِ مُطلق کی صفت رکھتا ہوں، تو لامُحالہ مجھے پیدا کرنے والی ذات کوئی اور ہے جو ذاتی وجود کی مالک ہے اور کمالِ مطلق کی صفتِ عالیہ سے متّصف ہے۔ یقیناً یہ ذات اللہ ہی کی ہے جس کے وجود سے میرا وجود بھی قائم ہے اور ساری کائنات کا وجود بھی قائم ہے"[2]

۴- بوسورتھ (۱۷ ویں صدی)

بُوسَوِیت، فِنیلُون کا ہم عصر تھا اور یہ دونوں فرانسیسی تھے۔ اس کے بیان کردہ دلائل میں سے ایک دلیل یہ ہے :

" ہم اپنے اندر عقل و شعور کی قُوّت محسوس کرتے ہیں۔ اگر ہمارا وجود ایسے اندھے اور بہرے مادے کی تخلیق ہے جو عقل رکھتا ہے نہ ادراک، تو

---

[1] ڈاکٹر ابراہیم مذکور : فی الفلسفۃ الاسلامیہ - طبع مصر ۱۹۶۸ء

[2] فرید وجدی : دائرۂ معارف، ج ۱، ص ۴۹۱-۴۹۲ -

پھر یہ انسانی عقل و ادراک کہاں سے آگیا؟ جو چیز کسی کے پاس خود موجود نہ ہو وہ دوسروں کو کس طرح دے سکتا ہے! پس معلوم ہوا کہ ہماری عقل اُس ذات کی تخلیق ہے جو "ادراکِ مُطلق" رکھتی ہے۔"

۵- لیبنٹز (۱۶۴۶ء – ۱۷۱۶ء)

یہ المانیہ کا مشہور فلسفی تھا جس نے ڈیکارٹ کے فلسفے کی بہترین طرز پر تشریح کی ہے۔ خدا کی ہستی کا یہ بھی قائل تھا اور وہی دلیل اس نے بھی پیش کی ہے جو ڈیکارٹ نے پیش کی تھی، البتہ یہ کائنات کی ہر چیز کے وجود کو بھی مَبدءِ اوّل کے ثبوت میں پیش کرتا ہے۔ دلائلِ اَنفُس کے ساتھ دلائلِ آفاق کا مطالعہ بھی کرتا ہے، جبکہ ڈیکارٹ سارے جہان سے کٹ کر اپنے نفس کے مطالعے میں مُستغرق ہو گیا تھا[1]۔

۶- نیوٹن (۱۶۴۲ء – ۱۷۲۷ء)

نیوٹن جدید فلسفے اور سائنس کا ابوالآباء سمجھا جاتا ہے۔ وہ فلکیات، طبیعیات اور ریاضیات کا ماہر تھا۔ قانونِ کششِ ثقل کا انکشاف کرنے والا اُسی کو سمجھا جاتا ہے۔ یہ وہ انگریز فلسفی ہے جس نے اللہ کے وجود اور خالقِ کائنات ہونے کی صفت کو ثابت کرنے کے لئے دلائلِ اَنفسی کے مقابلے میں دلائلِ آفاقیہ پر زور دیا ہے۔ اُس کے فلسفے کی بنیاد تجربے اور حِس پر استوار ہے۔

نیوٹن کے استدلال کا خلاصہ یہ ہے کہ:

"لوگو! خالق کے وجود میں شک نہ کرو اس لئے کہ اندھی فطرت (نیچر) جو ہر جگہ اور ہر وقت ایک ہی طرح کی ہوتی ہے، اُس کے بارے میں یہ تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا کہ کائنات کا یہ تنوّع اُس کی وجہ سے قائم ہے، اور نہ یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ عالَم کا یہ مُرتّب و منظّم اور مُتناسب وجود اُس کی

---

[1] فرید وجدی: دائرۂ معارف، ج ۱، ص ۴۹۴۔

تخلیق ہے ۔ ... یہ ثابت شدہ حقیقت ہے کہ ستاروں کی حرکات صرف قانونِ کشش (تجاذب) کا کام نہیں ہے، اس لئے کہ قوّۃِ جاذبہ تو ستاروں کو سورج کی جانب دھکیلتی ہے ۔ لازماً کوئی ہاتھ ایسا ہے جو ان کو ان کے دائروں میں رکھتا ہے ۔

یہ واضح اور کھلی حقیقت ہے کہ کوئی ایسا " طبیعی سبب " موجود نہیں ہے جو ان ستاروں کی حرکت کو باقاعدہ طور پہ مسلسل بغیر کسی تغیّر و تبدیلی کے ایک ہی سمت میں اور ایک ہی راستے پہ قائم رکھتا ہو ۔ پھر کوئی ایسا طبیعی سبب بھی معلوم نہیں ہو سکا ہے جو ان کی رفتار میں توازن و تناسب قائم رکھ سکے اس لئے ثابت ہوتا ہے کہ کائنات کی ہر چیز، وہ اجرامِ فلکیہ سے ہو یا قوّتِ کشش سے، سب کا خالق اللہ ہے ۔ کیا یہ ساری کائنات اپنی عجیب شکل اور کامل وجود کے ساتھ اُس خدا کے وجود پہ دلالت نہیں کرتی جو جسمانیّت سے پاک ہے، زندہ ہے، حکیم ہے اور ہر چیز کو دیکھتا ہے[1]"۔

۷ ۔ کلارک (۱۶۷۵ء ۔ ۱۷۲۹ء)

کلارک مشہور انگریز فلسفی تھا ۔ نیوٹن کا شاگرد اور دوست ۔ اُس نے اپنی کتاب " اثباتِ وجود اللہ " میں خالقِ کائنات کے وجود پہ ایک دلیل یہ بیان کی ہے :

" ہمارے ذہن میں اَبدیّت اور لامتناہیّت کا تصوّر موجود ہے جس کو ہم اپنے ذہن سے نکال نہیں سکتے ۔ اگر اس صفت کا کوئی موصوف موجود نہ ہوتا، تو ہمارے اذہان میں اَبدیّت اور غیر متناہیّت کا تصوّر بھی نہ ہوتا[2]"۔

---

[1] فرید وجدی : ج ۱، ص۴۹۸ ۔

[2] ایضاً، ج ۱، ص۴۹۸-۴۹۹ ۔

۸۔ لاک

یہ بھی انگریز تھا۔ "عقلِ انسانی" کے موضوع پر اپنی کتاب میں لکھتا ہے:

"خالق کائنات کے اثبات کے لئے ہم کو اپنے نفس اور اپنے وجود پر غور و فکر کرنا چاہئے۔ کوئی شخص اپنے وجود اور اپنی عقل کے وجود میں شک نہیں کر سکتا ..... اور یہ بات عقل کے خلاف ہے کہ احساس اور شعور سے خالی مادّے نے اپنے آپ کو خود بخود عقل دے دی ہو۔ اس سے بداہتًہ ثابت ہوتا ہے کہ کائنات اور خود ہمارے نفس و عقل کا مُبدأ وہ ذات ہے جو علم رکھتی ہے، جس کے علم کی کوئی حد ہی نہیں ہے"۔[1]

۹۔ والٹیر (۱۶۹۴ء – ۱۷۷۸ء)

یہ فرانس کا مشہور فلسفی تھا۔ انقلابِ فرانس کی فکری بنیاد اس نے اور رُوسو نے مل کر فراہم کی تھی۔ شخصی اقتدار کے خاتمے اور عوامی حکومت کے قیام کے لئے اِن دونوں نے فکری محاذ پر بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیا تھا۔

والٹیر اس بات کو تو معلوم نہ کر سکا کہ خالقِ کائنات نے عالم کو عدم سے پیدا کیا ہے اور وہ اَبدی زندگی کا مالک ہے، لیکن اتنا تو یہ انقلابی فلسفی بھی ماننے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے کہ میں اُس ذات کا پیدا کردہ ہوں جو مجھ سے زیادہ طاقتور ہے۔ اُس کی پیش کردہ دلیل کا خُلاصہ یہ ہے:

"مَیں جب وقت بتانے والی گھڑی کو دیکھتا ہوں تو اس سے یہی نتیجہ نکالتا ہوں کہ کسی دانا اور عاقل نے اس گھڑی کے پرزوں کو اس طرح ترتیب کے ساتھ جوڑا ہے کہ اس کی سوئی وقت بتا رہی ہے۔ اسی طرح میں جب

---

[1] فرید وجدی: ج ۱، ص ۴۹۸–۴۹۹۔

جسمِ انسانی کے اعضاء پر غور کرتا ہوں تو اس سے یہی معلوم کرتا ہوں کہ کسی دانا اور عاقل نے ان اعضاء کا نظم قائم کیا ہے اور انسان کو اس قابل بنایا ہے کہ وہ نو مہینے تک ماں کے پیٹ میں غذا حاصل کر سکے۔ اس کو دیکھنے کے لئے آنکھیں اور کسی چیز کو پکڑنے کے لئے ہاتھ دیئے ہیں۔ اس دلیل سے میں یہ بات بخوبی معلوم کر سکا ہوں کہ کوئی ہستی ایسی ہے جس نے مادّے کو یہ شکل دی ہے۔ میرے غور و فکر کا نتیجہ یہی ہے کہ کوئی ہستی ایسی موجود ہے جو مجھ سے زیادہ قوّت رکھتی ہے[1]۔"

۱۰۔ رُوسو (۱۷۱۲ء ــ ۱۷۷۸ء)

رُوسو فرانس کا وہ شہرۂ آفاق فلسفی تھا جس نے ۱۷۶۲ء میں اپنی کتاب "مُعاہدۂ عمرانی" شائع کر کے لوگوں میں بادشاہت کے خلاف بیداری اور جراٴت پیدا کی تھی۔ اسی نظریہ کے نتیجے میں ۱۷۸۹ء میں فرانس کا مشہور انقلاب رونما ہوا تھا۔

رُوسو خالق کی ہستی کا قائل تھا۔ وہ اپنی کتاب "اَلْاِعْتِراف بِالعَقِیْدہ" میں اِس موضوع پہ کائنات کی آفاقی دلیلوں اور نشانیوں کی تفصیل کے بعد لکھا ہے:

"وہ کونسی عقل ہے جو اس بات کی شہادت نہ دیتی ہو اور وہ کونسی آنکھ ہے جو کائنات کے نظم میں یہ بات دیکھ نہ سکتی ہو کہ اس کو ایسے صانع نے بنایا ہے جس کی حکمت سے بڑھکر کسی حکمت کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا.....

میرے لیے تو اس بات کو ماننا ممکن نہیں کہ مردہ اور بے جان مادّے نے اس کائنات کو زندگی دی ہے اور نہ اس بات کو مان سکتا ہوں کہ اندھی فطرت نے ذی عقل چیزوں کو پیدا کیا ہے[2]۔"

---

[1] فرید وجدی: ج ۱، ص ۴۹۹ــ۵۰۰۔

[2] ایضاً ج ۱، ص ۵۰۳۔

۱۱۔ لارڈ کلفنٹن

یہ مشہور انگریز مفکر ان لوگوں کا مذاق اڑاتا تھا جو یہ کہتے تھے کہ کائنات کا وجود اندھی فطرت (نیچر) اور اتفاقی حادثہ کا نتیجہ ہے۔ لارڈ کلفنٹن نے کہا :

"یہ تصور کرنا ناممکن ہے کہ زندگی کا آغاز اور اس کا مسلسل جاری رہنا ایک زبردست قوتِ خالقہ کے بغیر بھی ہو سکتا ہے۔ میرا پختہ اعتقاد ہے کہ جن فلاسفہ نے حیوان (جاندار) کے متعلق بحثیں کی ہیں ان میں سے بعض نے اس قوی حجت سے آنکھیں بند کر رکھی ہیں جو کائنات کے نظم میں موجود ہے۔ ہمارے چاروں طرف قوی اور قطعی دلائل موجود ہیں جو ایک منظم اور متوازن نظام کا ثبوت ہیں۔ یہ نظام طبیعیاتی اصول کی روشنی میں اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ اس کی پشت پر ایک آزاد ارادہ کام کر رہا ہے اور تمام چیزوں کے وجود کی بنیاد ایک واحد، بے مثال اور اَزلی خالق کے وجود پر ہے[۱]۔"

۱۲۔ ہرشل :

ہرشل اٹھارہویں صدی عیسوی کا ممتاز ماہرِ فلکیات تھا۔ یہ پورے تیقّن کے ساتھ واضح الفاظ میں لکھتا ہے :

"علوم کا دائرہ جتنا وسیع ہوتا جا رہا ہے اتنا ہی خالق کے اَزلی وجود پر قوی اور شکوک کی جڑ کاٹنے والے دلائل میں اضافہ ہو رہا ہے۔ وہ خالق جس کی قدرت کی کوئی حد اور انتہا نہیں ہے۔ اَرضیات، ریاضی، فلکیات اور طبیعیات کے ماہرین نے علم کی جو عمارت اپنے تعاون اور باہمی کوششوں سے بامِ عروج تک پہنچائی ہے اُس سے اللہ کے وجود اور اُس کی عظمت پر اعتقاد اور ایمان میں مزید مضبوطی اور پختگی آ گئی ہے[۲]۔"

---

[۱] عقیدۃ المسلم: از محمد الغزالی، ص ۲۹۔
[۲] فرید وجدی: ج ۱، ص ۵۰۳ و عقیدۃ المسلم ص ۲۶ و العقائد الاسلامیہ ص ۴۹-۵۰۔

چھٹا باب

جدید سائنس اور وجودِ باری تعالےٰ

فلسفے کا دائرۂ کار معقولات ہوتا ہے اور اس کی تحقیق تَعقّل و تفکّر پر مبنی ہوتی ہے، مگر سائنس کا دائرۂ کار محسُوسات و مادّیات ہے اور اس کی تحقیق تجربے اور اِستقرا پر مبنی۔ جس طرح فلاسفہ کے تَعقّل سے خالق کی ہستی ثابت ہوتی ہے، اسی طرح جدید سائنس کے تجربات سے بھی باری تعالیٰ کے وجود پہ روشنی پڑتی ہے۔ دورِ جدید کے صحیح الفکر اور ماہر ترین سائنسدانوں نے کھل کر اللہ کی ہستی کا اعتراف کیا ہے۔

اسلام سائنس کا مخالف نہیں ہے اور نہ ان دونوں کے درمیان کوئی تضاد یا تصادم ہے، البتہ اسلام اُن سائنسدانوں کا مخالف ہے جو خود سائنسی انکشافات کے مقتضیات سے آنکھیں بند کر کے دہریے اور مادہ پرست ہو گئے ہیں۔ اسی طرح اسلام اُن سائنسدانوں اور نام نہاد فلسفیوں کو بھی راہِ راست سے برگشتہ قرار دیتا ہے جو خدا کی خالقیّت کے تو قائل ہیں اور اس حقیقت کو تو مانتے ہیں کہ کائنات کا یہ نظام خدا کی قدرت اور اس کے ارادے سے چل رہا ہے، لیکن خالقِ حقیقی کی غلامی اور بندگی چھوڑ کر اپنی خواہشات کے غلام بن گئے ہیں۔ اللہ نے اپنے انبیاء کے ذریعے انسان کے لئے جو دستورِ حیات، یعنی اسلام بھیجا ہے اُسے چھوڑ کر وضعی اور من گھڑت نظاموں اور رازموں کے پیرو کار ہیں۔

اِس گروہ کے چند نمایاں افراد یہ ہیں:

۱۔ ہربرٹ سپنسر (تاریخِ پیدائش ۱۸۲۰ء)

سپنسر مشہور ترین انگریز فلسفی اور سائنسدان تھا۔ ۱۸۲۰ء میں ایک ٹیچر کے گھر پیدا

ہوا۔ ۱۷سال کی عمر میں طبیعیات اور سیاسیات کی جانب اس کا میلان ہوا۔ کچھ مدّت تک ایک کارخانے میں انجنیئر کی حیثیت سے ملازمت کی، لیکن اس کارخانے کی مالی حالت خراب ہوگئی تو مشہور جریدے اکانومسٹ کا مدیر بن گیا اور ۱۸۴۸ء سے ۱۸۵۳ء تک اس جریدے سے وابستہ رہا۔

سپنسر کو دورِ جدید کا مقبول ترین فلسفی اور سائنسدان سمجھا جاتا ہے۔ امریکہ اور فرانس میں اس کو جو مقام اور مقبولیت حاصل ہوئی تھی وہ اس کے کسی اور ہم عصر کو نصیب نہ ہوسکی۔ اللہ کے وجود کے بارے میں یورپ کا یہ سب سے بڑا حکیم لکھتا ہے :

" وہ اسرار جن پر غور کرنے سے وہ اور بھی ناقابلِ فہم بن جاتے ہیں، ہمیں یہ باور کرنے پر مجبور کرتے ہیں کہ انسان کے اوپر ایک ازلی اور ابدی قوت حکمراں ہے۔ اور یہی وہ قوت ہے جس سے تمام اشیاء صادر ہوتی ہیں"[1]

اپنے مشہور رسالے " التربیۃ " (تعلیم) میں اسپنسر مزید لکھتا ہے :

" علم (سائنس) خرافات کا مخالف ہے، لیکن نفسِ مذہب کا مخالف نہیں ہے۔ طبیعیات میں زندقہ کی بہت سی باتیں بھی مشہور ہوگئی ہیں، لیکن جو علم سطحی معلومات سے گزر کر حقائق کی گہرائیوں تک پہنچا ہے وہ زندقہ کی روح سے بیزار ہے۔ علمِ طبیعی دین کا مدِمقابل نہیں ہے، بلکہ یہ اعتراف ہے ان چیزوں کی نفاست کا جن کو ہم دیکھتے اور پڑھتے ہیں۔ اور اعتراف ہے خالق کی قدرت کا۔ جو سائنسدان یہ جانتا ہے کہ پانی کا ایک قطرہ آکسیجن اور ہائیڈروجن کے ایک مقررہ مقدار میں ملنے سے بنتا ہے جس میں اگر تھوڑی سی کمی بیشی بھی ہوجائے، تو وہ پھر پانی نہیں کوئی اور چیز بن جائے گا۔ ایسا سائنسدان

---

[1] الایمان و الحیاۃ : از ڈاکٹر محمد یوسف القرضاوی، طبع بیروت۔ ۱۹۶۹ء ص ۳۳۴۔

یقیناً خالق کی عظمت، قدرت، حکمت اور علم پر ایمان لائے گا۔ اس کے مقابلے میں جو شخص اس کو پانی کا صرف ایک قطرہ سمجھتا ہو اُسے وہ ایمان نصیب نہیں ہوگا جو کسی ماہرِ طبیعیات کو حاصل ہوتا ہے۔"

۲۔ پروفیسر لینئن

فرانس کا یہ مشہور محقق لکھتا ہے:

"اللہ کی ذات جو ازلی ہے، کبیر ہے، عالم ہے اور قادر ہے اپنی عجیب و غریب کاریگریوں سے میرے سامنے اس طرح جلوہ گر ہوتی ہے کہ مجھ پر ہیبت اور حیرت طاری ہو جاتی ہے۔ کس قدر عجیب قدرت ہے! کس قدر عجیب حکمت ہے اور کس قدر عجیب ایجاد ہے، جو اُس کے دستِ کارساز کی مصنوعات میں پائی جاتی ہے۔ خواہ وہ چھوٹی سے، چھوٹی ہو یا بڑی سے بڑی۔

کائنات سے جو فوائد ہم حاصل کرتے ہیں وہ اللہ کی عظیم و وسیع رحمت کی شہادت دیتے ہیں جیسا کہ اس کائنات کا حُسن و جمال اور تناسب و توازن اللہ کی وسیع حکمت کی خبر دیتا ہے۔ کائنات کی حفاظت اور اس کے نظم کو بحال رکھنا اُس کے جلال اور عظمتِ شان کی گواہی اور ثبوت ہے۔"[1]

۳۔ مونتل

یہ اپنے "دائرۃ المعارف" (انسائیکلوپیڈیا) میں لکھتا ہے:

"علومِ طبیعیہ کی اہمیت و ضرورت صرف یہی نہیں ہے کہ ہم اپنی عقل کی

---

[1] فرید وجدی: ج ۱۰ ص ۵۰۴۔

پیاس بُجھائیں، بلکہ ان کی اصلی اور بڑی اہمیت یہ ہے کہ ہم اپنی عقل کی نظر خالقِ کائنات کی طرف اٹھائیں اور اُس کے جلال وعظمت کے احساس واعتقاد سے مُنوّر و مُزیّن ہوجائیں۔"[1]

۴۔ سر آرتھر تھامسن

یہ مشہور ماہرِ طبیعیّات، سائنس اور مذہب کے موضوع پر لکھتا ہے :

"عقلِ مُتَدَیّن (دین و مذہب کو ماننے والی عقل) کو آج پریشان نہیں ہونا چاہیئے کہ سائنس دان فطرت اور مادے کے دائرے سے نکل کر ربِّ فطرت تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس لئے کہ یہ اُس طرف توجہ نہیں دیتا، اور یہ اُس کا دائرۂ کار نہیں ہے۔

بعض اوقات نتیجہ اپنے مقدمات سے بہت زیادہ بڑا ہوتا ہے۔ اور یہ اُس وقت محسوس ہوتا ہے جب علماءِ فطرت، قیاس واستنباط کے ذریعے ماوراءِ فطرت تک پہنچ جاتے ہیں۔

اب ہمیں خوش ہونا چاہیئے کہ سائنس دان نے دینی تصوّرات کو علم کی فضا میں سانس لینے کا وہ موقع فراہم کردیا ہے جو ہمارے آباؤ اجداد کو حاصل نہیں تھا۔ ہم پوری بصیرت کے ساتھ تسلیم کرتے ہیں کہ سائنس نے بہت بڑی خدمت یہ کی ہے کہ اس نے اپنے انکشافات سے اللہ تعالیٰ کی جانب انسان کی راہنمائی کی ہے۔ امن وسلامتی کا اصل ذریعہ اللہ پر ایمان ہی ہے۔"[2]

---

[1] فرید وجدی ص ۵۰۴ ج ۱۔

[2] الایمان والحیاۃ ص ۳۳۵ بحوالہ عقائد المفکّرین فی القرن العشرین، از استاذ عقاد۔

۵۔ ڈاکٹر وتزکیمادی :

فرانس کا یہ سائنسدان کہتا ہے :

" میں جس وقت محسوس کرتا ہوں کہ خدا پر میرا عقیدہ کمزور ہو رہا ہے، تو سائنسی اکیڈمیوں کی جانب رجوع کرتا ہوں، تاکہ میرا ایمان پختہ اور مضبوط ہو جائے۔"[1]

" اس کی وجہ یہ ہے کہ ان اکیڈمیوں میں جب کائنات کے اسرار سے پردہ اُٹھتا ہے اور اللہ کی قدرت کے آثار نئی شکل میں سامنے آتے ہیں، تو ایمان باللہ میں مزید پختگی اور ثبات پیدا ہوتا ہے، بشرطیکہ ان تجربہ گاہوں میں کام کرنے والا قلبِ سلیم رکھتا ہو۔

۶۔ آئن سٹائن (متوفی ۱۹۵۵ء)

یہ عظیم ماہر طبیعیات ۱۸۷۹ء میں جرمنی میں پیدا ہوا۔ نسلاً یہودی تھا؛ چنانچہ ۱۹۳۳ء میں نازی حکومت نے اُسے جلاوطن کر دیا۔ جرمن سے نکل کر وہ امریکہ چلا گیا اور وہاں طبیعیات کے پروفیسر کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ جلاوطنی سے پہلے وہ برلن میں قیصر کے ادارۂ طبیعیات کا ناظم تھا۔

آئن سٹائن نے نیوٹن کے نظریۂ کشش ثقل پر تنقید کی ہے اور بتایا ہے کہ یہ نظریہ کرۂ ارض پر تو منطبق ہو سکتا ہے، مگر عظیم تر کائنات پر منطبق نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ یہ کوئی ناقابلِ تبدل کلیّہ نہیں ہے صرف ایک محدود اور قابلِ ترمیم حقیقت ہے۔

باری تعالیٰ کے وجود کے متعلق بیسویں صدی کا یہ مشہور سائنسدان کہتا ہے :

---

[1] العقائد الاسلامیہ۔ ص۵۰، از سید سابق۔

"یہ فطری عقیدہ ہے کہ وہ ذات جس کی کُنہ (حقیقتِ ذاتیہ) جاننے کا کوئی ذریعہ ہمارے پاس نہیں ہے، یقیناً موجود ہے اور وہ اپنی عظیم ترین حکمت کی نشانیوں اور حسین ترین جمال کی روشنیوں سے ظاہر بھی ہے۔ میں یہ تصوّر بھی نہیں کرسکتا کہ کوئی پختہ فکر عالِم اس بات کو نہ جان سکتا ہو کہ یہ عالمِ وجود ایسی حکمت پر مبنی ہے جسے عقل سمجھ سکتی ہے۔ پس علم ایمان کے بغیر لنگڑے کی مانند ہے اور ایمان علم کے بغیر اندھے کی مانند"[1]

ایٹمی سائنس کے انکشافات

الحمد للہ کہ آج جدید ترین ایٹمی سائنس نے بھی ثابت کر دیا ہے کہ مادے کا وجود اپنی ابتدائی ماہیئت کے اعتبار سے مادے سے ماوری کسی اور قوّت کا مرہونِ مِنّت ہے۔

۱۸۰۳ء تک دنیا کے تمام سائنسدان ڈالٹن کے اس نظریے سے متفق تھے کہ مادہ لطیف ترین ذرّات کا مرکب ہے جنہیں ایٹم کہا جاتا ہے۔ ایٹم یونانی لفظ ہے جس سے مراد وہ ذرّہ ہے جس کو تقسیم نہ کیا جا سکے (جُزْءِ لَا یَتَجَزّٰی) اُس وقت ناقابلِ تقسیم ایٹم کا نظریہ ناقابلِ تردید سمجھا جاتا تھا۔

لیکن ایک صدی بعد ۱۹۰۴ء میں جے۔ جے تھامپسن نے یہ ثابت کیا کہ ایٹم ناقابلِ تقسیم نہیں ہے، بلکہ اس کے بھی اجزائے ترکیبی ہیں اور وہ ہیں برقیتے (برقیاتی اور کہربائی لہریں)

۱۹۱۳ء میں موسلے نے یہ نظریہ قائم کیا کہ ایٹم دراصل مُثبت اور مَنفی برقیوں کا مجموعہ ہے۔

---

[1] عقیدۃ المسلم ص ۲۹۔

۱۹۳۲ء کے بعد چاڈوک نے ثابت کیا کہ ایٹم میں صرف مثبت اور منفی برقیے ہی نہیں، بلکہ ایسے برقیے بھی اس کا جز ہوتے ہیں جو نہ مثبت ہیں نہ منفی، چنانچہ اب سائنس مادے کی اصلیت مثبت، منفی اور نہ ایسے برقیوں کے باہمی اختلاط اور رفتار کو قرار دیتی ہے جو نہ مثبت ہیں نہ منفی اور یہ نظریہ اب پختہ ہو چکا ہے[1]

ایٹم کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنے کے لئے مولانا عبدالباری ندوی کی کتاب "مذہب اور سائنس" کا مطالعہ کیجئے۔

اہلِ ایمان تو یہ مانتے ہی ہیں کہ نہ صرف ان برقیاتی لہروں کو، بلکہ کائنات کی ہر چیز کو قابو میں رکھنے والی اللہ رب العلمین ہی کی ذات ہے، لیکن اب تو مادہ پرست بھی سوچنے، بلکہ ماننے لگے ہیں کہ یہ نظر آنے والا مادّہ اصل حقیقت نہیں، بلکہ کوئی اور قوت ہے جو اس مادے سے ماورئی ہے اور جو مادے کو بنانے والی ہے اور اس کی مذکورہ تینوں قسموں کے برقیوں کو کنٹرول کرنے والی بھی وہی ہے۔

ایٹمی سائنس کے ماہرین کی رائے:

امریکہ کے ایک رسالے نے ایٹم کے ماہرین اور فلکیات وحیاتیات کے ممتاز سائنس دانوں کی ایک بڑی جماعت سے جب وجودِ خالق کے بارے میں سوال کیا تو ان سب کا جواب یہ تھا:

"ہمارے پاس ایسے بہت سے دلائل اور شواہد موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک عظیم ترین ہستی موجود ہے جو کائنات کا نظم چلا رہی ہے اور اپنے لامحدود علم اور رحم سے اس جہاں کی نگراں ہے۔"

ایک اور سائنس دان نے کہا: "اس بارے میں اب کوئی شک وشبہ باقی نہیں رہا کہ وہ عظیم ترین ہستی جسے آسمانی مذاہب اللہ کہتے ہیں وہی ایٹمی قوت

---

[1] اسلام اور اشتراکیت، از صادق محمد احسن، ملخصاً ص ۲۶ تا ۲۸، طبع ۱۹۷۸ء۔

کو قابو میں رکھتی ہے اور اُن مُحیّر العُقُول و خارق العادت اشیاء کو بھی کنٹرول کرتی ہے جو اس کائنات میں موجود ہیں[1]"۔

ایک مُلحد کی کتاب :

مشہور مُلحد جولیان ہکسلے نے ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام تھا" اَلاِنسَانُ یقُومُ وَحُدہٗ" یعنی انسان خود بخود اور اپنی قوّت پہ زندہ ہے ۔ اس کتاب کے جواب میں نیویارک کی سائنسی اکیڈمیوں کے سربراہ "کریسی مورلیسن" نے ایک کتاب لکھی جس کا عنوان ہے : اَلاِنسانُ لَایقُومُ وَحُدہٗ " یعنی انسان اپنی قوّت پہ زندہ نہیں رہ سکتا ۔ استاد محمود صالح فلکی نے اس کتاب کا عربی میں ترجمہ کیا ہے جس کا نام ہے" اَلعِلم یَدعوا اِلیَ الایمان" ۔ (سائنس ایمان کی طرف بلاتی ہے) اس کتاب میں جدید ایٹمی سائنس کی روشنی میں ثابت کیا گیا ہے کہ کائنات کا خالق موجود ہے اور جدید علم اسے ثابت کرتا ہے ۔جو شخص بھی اس کتاب کا مطالعہ کرے گا اسے معلوم ہو جائے گا کہ حقیقی سائنسدان دہریہ نہیں ہو سکتا ۔ ناخدا شناس وہی ہو سکتا ہے جو کائنات کے رموز و اسرار کو سمجھ نہ سکا ہو اور غلط فہمیوں میں پھنس کر خود اپنی عقل و مشاہدے کا دشمن بن گیا ہو ۔

امریکہ کے ۳۰ سائنسدانوں کی رائے :

امریکہ کے ۳۰ ممتاز ماہرینِ فلکیّات و طبیعیّات نے مل کر ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے " اَللّٰہُ یَتَجَلّٰی فِیْ عَصْرِ العِلم " (اس سائنسی دور میں اللہ کی ذات ہمارے سامنے جلوہ گر ہو گئی ہے) انگریزی سے اس کتاب کا عربی میں ترجمہ ڈاکٹر دمرداش سرحان نے کیا ہے ۔ امریکہ میں ان ۳۰ ماہرین کو سند کی حیثیت حاصل ہے ۔ ان میں سے ہر ایک نے یہ اقرار کیا ہے کہ جدید سائنس نے مجھے ایمان باللہ کا راستہ دکھایا

---

[1] عقیدۃ المسلم، ص۳۴ ۔

ہے[1]

خلانورد جان گلین کی شہادت :

یہ امریکی خلانورد جب خلائی سفر سے واپس آیا تو اس نے ایک بیان دیا تھا جو مشہور ماہنامہ ریڈرز ڈائجسٹ میں شائع ہوا تھا۔ بعدازاں اس بیان کا اردو ترجمہ امریکہ کے ماہنامہ سیربین میں شائع ہوا۔ جان گلین خلا کے عجائبات بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"یہی وہ ایک واحد شے ہے جو خلاء میں خدا کے وجود پر دلالت کرتی ہے — اور یہ کہ کوئی طاقت ہے جو ان سب کو مرکز و محور سے وابستہ رکھتی ہے .... ہم جانتے ہیں اور اس بنا پر کہتے ہیں کہ اس کائنات میں ایک رہنما قوت موجود ہے"[2]

علم نفسیات اور وجود باری تعالیٰ

منکرینِ خدا کا دعویٰ ہے کہ دین و مذہب سے آزاد ہونے کا ایک فائدہ یہ ہے کہ اس آزادی کا نفس و عقل کی صحت پہ اچھا اثر پڑتا ہے لیکن مُشاہدہ اِس دعوے کی تکذیب کرتا ہے۔ مثلاً مغرب کا مادّہ پرست مُعاشرہ آج نفسیاتی اور دماغی امراض سے بے حد پریشان ہے۔

جدید علوم کا ممتاز اور مستند عالِم، ڈاکٹر الکسیس کاریل اپنی کتاب "اَلْاِنْسَانُ ذالکَ المجھول" میں لکھتا ہے:

---

[1] تعریف عام بدین الاسلام۔ از علامہ طنطاوی، ص۱۱ و الایمان والحیاۃ ص۳۳۶۔

[2] معارف القرآن۔ از مفتی محمد شفیع مرحوم۔ ج ۶۔ ص۴۸۲، الفرقان، آیت ۶۱۔

"حیرت وتعجب ہے کہ (امریکہ میں) آج کل دماغی امراض دوسری تمام بیماریوں کی مجموعی تعداد سے بھی زیادہ ہیں۔ اسپتال پاگلوں سے بھرے پڑے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق نیویارک کا ہر ۲۲ واں شخص (یعنی تقریباً ۵ فیصد لوگ) دماغی امراض کی اسپتال میں داخل ہونے کا مستحق ہے۔ ۱۹۳۲ء میں سرکاری اسپتالوں میں داخل ہونے والے پاگلوں کی تعداد ۳ لاکھ ۴۰ ہزار تھی۔ علاوہ ازیں ۱۸ ہزار ۵ سو ۸۰ مریض وہ تھے جنہوں نے پرائیویٹ شفاخانوں میں اپنا علاج کرایا۔ نیم پاگل اور ضعیف العقل لوگوں کی تعداد کا اندازہ ۵ لاکھ ہے۔

امریکہ کی قومی کمیٹی برائے دماغی صحت' کی رپورٹ یہ ہے کہ ملک میں ۴ لاکھ بچے ایسے ہیں جو اپنی ذہنی اور دماغی کمزوری کی وجہ سے اسکولوں اور کالجوں میں داخلہ لینے کے قابل ہی نہیں ہیں۔ کمیٹی نے یہ بھی اندازہ لگایا ہے کہ لاکھوں مریض ایسے ہیں جو رسمی اعداد و شمار کی گرفت میں نہیں آسکے، مگر وہ ذہنی اُلجھنوں اور دماغی بیماریوں میں کسی نہ کسی حد تک مبتلا ہیں۔

یہ اعداد و شمار ثابت کرتے ہیں کہ دماغی صحت کا مسئلہ آج کے ترقی یافتہ معاشرے کا مشکل ترین مسئلہ بن گیا ہے۔ اور یہ بات شک و شبہے کے بغیر درست ہے کہ دماغی بیماریاں، سرطان، سِل، طاعون اور امراضِ قلب سے بھی زیادہ خطرناک ہوتی ہیں۔ نیز یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیئے کہ ضعیف العقل اور پاگل لوگ صرف جرائم پیشہ طبقوں ہی میں نہیں پائے جاتے، بلکہ عام آبادی اور امن پسند شہریوں میں ان کی تعداد جرائم پیشہ طبقوں سے کچھ زیادہ ہی ہے۔

دماغی مریضوں کی کافی تعداد جیل خانوں میں ہے، مگر آزاد پھرنے والے پاگلوں کی تعداد بھی کافی ہے جو" جدید ثقافت" کو ترقی دے رہے ہیں۔ اب اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں کوئی بات مانع نہیں کہ اعصابی اور ذہنی مریضوں" کی تعداد میں یہ اضافہ اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ

ہمارے معاشرے میں کوئی بہت بڑی خرابی ہے اور یہ کہ جدید زندگی کے معمولات ہم کو دماغی سکون اور عقلی حُسن نہیں دے سکتے"[1]

یہ اعداد و شمار کئی سال پُرانے ہیں اور ظاہر ہے کہ جدید ترین اعداد و شمار اس سے بہت زیادہ ہوں گے۔

مسلمانوں کے وہ ممالک جن میں خدا سے باغی تہذیب کے جراثیم پھیل رہے ہیں اُن میں بھی دماغی بیماروں کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے اور اس کی اصل وجہ معاشی پریشانیاں یا مادی وسائل کی کمی نہیں، بلکہ روحانیت کا فقدان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خودکشی کی وارداتیں معاشی طور پر خوشحال ملکوں میں غریب اور پس ماندہ ملکوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہوتی ہیں۔ قاہرہ کے جریدے الاخبار میں ۱۲ فروری ۱۹۶۰ء کے شمارے میں" الافیون والقرف" کے عنوان سے یہ خبر شائع ہوئی تھی :

" امریکہ کی پولیس نے ادیبوں اور شاعروں کے ایک گروہ کو گرفتار کیا ہے جو افیون اور چرس کا استعمال اور کاروبار کرتا تھا اور اس نشے کے دفاع اور حمایت میں کوشاں تھا۔ گرفتاری کے بعد ان میں سے ایک ملزم نے کہا: زندگی تلخ ہو چکی ہے اور لوگ دائمی پریشانی اور ذہنی گھٹن کا شکار ہیں[2]"

فرانسیسی ادیب چارلس مولے نے تین جلدوں میں ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے" ادب القرن العشرین والمسیحیۃ" (۲۰ ویں صدی کا ادب اور مسیحیت) یہ کتاب بیسویں صدی کے ادب پر جامع ترین مانی گئی ہے۔ اس کے تیسرے حصے میں مؤلف نے ایک ادیب کے یہ تأثرات نقل کئے ہیں "یورپ سخت ذہنی پریشانیوں سے دوچار ہو چکا ہے جو انسانیت کے لئے سب سے بڑا المیہ ہے"

---

[1] "الانسان ذالک المجھول" عربی ترجمہ ص ۱۸۷-۱۸۸۔

[2] الایمان والحیاۃ، ص ۳۴۔

اس کتاب میں ایک خاتون ادیبہ کے دو افسانوں کا حوالہ بھی دیا گیا ہے جن میں سے ایک کا نام ہے "مَرْحباً اَیُّھَا الحُزْنُ" (خوش آمدید اے غم!) اس افسانے میں مغربی معاشرے کو ایسی تصویر کی شکل میں پیش کیا گیا ہے جو چلتی پھرتی ہے، غم واندوہ میں مبتلا ہے، جھگڑتی ہے اور اندھیروں میں چلا رہی ہے کہ کوئی ہے مجھے راستہ بتانے والا اور روشنی فراہم کرنے والا!"[1]

اس بلا قید اور بے مقصد زندگی کا مشاہدہ خود میں نے بھی کیا ہے جب ۱۹۷۸ء کے آخری ہفتے میں یو کے اسلامک مشن کی دعوت پہ برمنگھم (انگلینڈ) میں منعقد ہونے والی بین الاقوامی سیرت کانفرنس (۲۷-۲۸-۲۹ مئی) میں تقریر کرنے کے لئے گیا تھا۔ کانفرنس ختم ہونے کے بعد دوستوں کے کہنے پہ ایک مہینے تک برطانیہ کے شہروں اور قصبات کا دورہ کیا اور ان میں آباد مسلمانوں کے اجتماعات سے خطاب کرنے کا موقع ملا۔ وہاں مادہ پرستی اور نفس پرستی کے امراض میں مبتلا حیوانی معاشرے کو دیکھ کر ذہن میں یہ آیت بار بار آتی تھی:

وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا یَتَمَتَّعُوْنَ وَیَاْکُلُوْنَ کَمَا تَاْکُلُ الْاَنْعَامُ۔ (۱۲) سورۃ محمد

(کافر لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں اور کھاتے ہیں جیسا کہ جانور کھاتے ہیں)

ڈارون اور فرائڈ کے اثرات

ڈارون (۱۸۰۹ء-۱۸۸۲ء) نے انسان کو جانور ہی کی ایک ترقی یافتہ صورت سمجھ کر صرف مادی اجزاء کا ایک مرکب قرار دیا جس کے اندر کوئی روحانی قوت موجود نہیں ہے۔

ڈارونزم کی تقلید میں فرائڈ (۱۸۵۶ء-۱۹۳۹ء) نے انسان کو حیوانی خواہشات وشہوات کا ایسا مظہر قرار دیا جس کی زندگی کا واحد مقصد شہوانی اور حیوانی لذتوں کی تکمیل ہے۔

---

[1] الایمان والحیاۃ، ص۳۴۲۔

فرائڈ کی تحلیلِ نفسی پہ تنقید کرتے ہوئے محمد قطب مدظلہٗ فرماتے ہیں :

"فرائڈ کا پہلا جرم یہ ہے کہ اُس نے انسانیت کی تحقیر اور تذلیل کی ہے، اس نے انسان کی تصویر یہ پیش کی ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی اُن لذّتوں کی تکمیل میں لگا رہتا ہے جن پہ اُسے وہ شہوانی قوت مجبور کرتی ہے جو اپنی منہ زوریوں سے باز نہیں آتی"[1]

دوسری جگہ لکھتے ہیں :

"فرائڈ بڑے اصرار کے ساتھ کہتا ہے : ان الجریمۃ اتجاہ طبیعی للبشریۃ[2] (جُرم انسان کے لئے ایک طبیعی داعیہ ہے)"۔

یہ ہے وہ تحلیلِ نفسی جس کا داعی جدید علمِ نفسیات کا یہ نام نہاد امام' فرائڈ تھا۔

فرائڈ کے نظریات کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان صرف ایک جانور ہے۔ مادی ترقی کی منزل اور نفسانی و جنسی شہوات کی تکمیل اس کی زندگی کا مقصد ہے وہ یہ بات بہت یقین کے ساتھ کہتا ہے کہ جرم انسان کی جبلت اور فطرت کا تقاضا ہے اور حدود و قیود مقرر کرنا اخلاقی تعلیمات و اقدار نیز جرائم کے ارتکاب پہ تعزیر نافذ کرنا فرسودہ خیالات، بلکہ انسانی جبلّت پہ ظلم کے مترادف ہے۔

ظاہر ہے کہ رُوحانی اور اخلاقی اقدار سے بغاوت کا نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ لوگ جنسی تسکین کی تلاش میں سرگرداں رہیں اور جب اس تگ و دو میں ناآسودہ رہیں تو دماغی امراض میں مبتلا ہو کر قسم قسم کے جرائم کے عادی ہو جائیں۔

فرائڈ نے تو کہا تھا کہ آزادی سے لوگوں کی ذہنی حالت اچھی ہو جاتی ہے، لیکن نتائج اس کے برعکس نکل رہے ہیں اور یہ قانونِ فطرت کے عین مطابق ہے۔ تہذیب سے دامن چھڑا کر انسان مہذب کس طرح رہ سکتا ہے!

فرائڈ کے جنسی فلسفے کا نتیجہ یہ بھی ہے کہ آج کے انسان نے خود اپنے نفس

---

[1] الانسان بین المادیہ و الاسلام، طبع مصر ۱۹۶۲ء، ص ۳۱، ۳۲۔

[2] ایضاً۔ ص ۱۸۵۔

کو اپنا معبود بنا لیا ہے ۔ ہکسلے نے اپنی کتاب " الانسان فی العالم الحدیث" (انسان دورِ جدید میں) میں لکھا ہے کہ دورِ جدید کا انسان اپنا خدا خود بن گیا ہے، اور طوافِ کعبہ کی جگہ اب طوافِ نفس نے لے لی ہے ۔ جدید انسان کی مثال تیلی کے اس بَیل کی سی ہے ـــــ جو دن بھر کولھو کے اِردگرد گھومتا ہے، لیکن جہاں سے چلتا ہے واپس پھر اُسی جگہ آ جاتا ہے، یا پھر اُس کی مثال اُس کتے کی سی ہے جو اپنی ہی دُم پکڑنے کے لئے اپنے جسم کے اردگرد گھومتا ہے، لیکن دُم پھر بھی اس کے منہ میں نہیں آتی ۔

قرآنِ کریم نے مادہ پرست اور نفس پرست انسان کی یہی مثال بیان کی ہے :

" اور سُنا دے ان کو حال اُس شخص کا جس کو ہم نے اپنی آیتیں دی تھیں، پھر وہ اُن کو چھوڑ نکلا تو اُس کے پیچھے پڑ گیا شیطان، تو وہ ہو گیا گمراہوں میں۔ اور اگر ہم چاہتے تو بلند کر دیتے اُس کا رتبہ اِن آیتوں کی بدولت، لیکن وہ تو ہو گیا زمین کا (مادہ پرست) اور تابعدار ہو گیا اپنی خواہش کا، تو اس کا حال ایسا ہے جیسے کتے کا حال ہے کہ اس پر تو بوجھ لادے تو ہانپے اور چھوڑ دے تو بھی ہانپے ۔ یہ مثال ہے اُن لوگوں کی جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو ۔ سو بیان کر یہ احوال تاکہ یہ لوگ غور و فکر کریں ۔ بری مثال ہے ان لوگوں کی جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو اور وہ اپنے نفس پر ظلم کرتے رہے "

(اعراف ۱۷۵ تا ۱۷۷)

فرائڈ کے یہی وہ شیطانی نظریات ہیں جو سرطان کی طرح مغربی معاشرے میں سرایت کر چکے ہیں ۔ قرآنِ کریم نے انہی لوگوں کے بارے میں فرمایا ہے :

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَأْكُلُوْنَ كَمَا تَأْكُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ (محمد ۱۲)

(جو لوگ خدا کی توحید کو نہیں مانتے وہ صرف زندگی کے فوائد حاصل کرتے ہیں اور کھاتے ہیں جس طرح کہ جانور کھاتے ہیں، اُن کا ٹھکانا آگ ہے)

جہنم کی آگ میں یہ لوگ دنیا میں بھی گر چکے ہیں، اُن کی زندگی تلخ سے تلخ تر ہوتی جا رہی ہے اور یہ تباہی کے کنارے پر پہنچ چکے ہیں ۔ ۳ مئی ۱۹۶۵ء کو الاہرام قاہرہ میں یہ خبر شائع

دی تھی کہ امریکہ میں ۷ کروڑ ۲۰ لاکھ (۷۲ ملین) افراد شراب پیتے ہیں ان میں سے ۲ کروڑ ہیں جو کثرتِ مے نوشی کی وجہ سے کام چوری اور بے روزگاری کا شکار ہیں، جن کی وجہ سے امریکی حکومت کو سالانہ ۲ ارب ڈالر خرچ کرنے پڑتے ہیں۔

۲۴ اپریل ۱۹۶۵ء کو قاہرہ کے اخبار الیوم میں یہ خبر شائع ہوئی تھی:

" سویڈن میں ایک لاکھ عورتوں نے سڑکوں پہ مظاہرہ کیا ہے۔ اُن کا مطالبہ تھا کہ جنسی آزادی پہ پابندی لگائی جائے۔ یہ عورتیں آوارہ لڑکوں سے تنگ آکر احتجاجی مظاہرہ کر رہی تھیں۔"

لبنان کے جریدے الشہاب میں امریکی رسالہ ٹائم کے حوالے سے یہ خبر شائع ہوئی تھی۔ ۱۹۶۶ء میں امریکہ میں چوری کی ۳۰ لاکھ وارداتوں کی رپورٹیں درج کی گئی تھیں، گویا امریکہ کے ہر ستر آدمیوں میں سے ایک چور ثابت ہوا۔

صدر جانسن کے زمانۂ اقتدار میں اُن کی مقرر کردہ کمیٹی نے ۱۸ ماہ کی تحقیق کے بعد رپورٹ دی تھی کہ " پولیس کے رجسٹر ڈاکہ زنی، جیب تراشی اور دیگر جرائم کی رپورٹوں سے بھرے پڑے ہیں۔ سورج غروب ہونے کے بعد بہت سے علاقوں کے لوگ ڈاکوؤں کے خوف سے گھروں کے دروازے بند کر کے محبوس ہو جاتے ہیں۔ اجنبی چہرے دیکھتے ہی لوگ ڈر جاتے ہیں کہ کہیں ڈاکو نہ ہو۔ آتشیں اسلحہ اور بندوقیں خریدنے کی سالانہ شرح بڑھ رہی ہے۔ عوام میں یہ احساس بڑھتا جا رہا ہے کہ حکومت ہمارے جان و مال کی حفاظت نہیں کر سکتی۔" اس کمیٹی نے لکھا تھا کہ " عام شہری اب یہ تمنا کر رہا ہے کہ کاش امریکہ کے تمام بڑے بڑے شہروں کو مسمار کر دیا جائے، اس لئے کہ ۶ فی صد قاتل اور ۳ فی صد چور انہی بڑے شہروں میں رہتے ہیں۔ شہری یہ بھی چاہتے ہیں کہ بالغ لڑکوں اور لڑکیوں کے اختلاط پر پابندی لگا دی جائے۔"[1]

اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ زندگی کا مقصد خالق کی رضا کا حصول ہے اور اس کا ذریعہ اللہ کی عبادت اور اخلاقی اقدار کی پابندی ہے، لیکن چونکہ جسمانی قوت کے بغیر عبادت

---

[1] الایمان و الحیاۃ۔ ص ۲۴۴ تا ۲۴۶۔

بھی نہیں ہو سکتی اس لئے اخلاقی اور شرعی حدود کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے جسم کی ضرورتیں پوری کرنا بھی ضروری ہیں۔ جسمانی حوائج پورے کرنے کے لئے اللہ نے نعمتوں کے خزانے پیدا کئے ہیں اور رُوحانی ترقی کے لئے احکام اور اخلاقی ضابطے بتائے ہیں۔ یہ دونوں ضروری ہیں، لیکن جسم کو روح کا تابع ہونا چاہئے!

ساتواں باب

نفس اور رُوح

لغوی معنوں کے اعتبار سے لفظِ رُوح کا اطلاق کئی چیزوں پہ ہوتا ہے ۔ قرآنِ کریم میں وحی کو بھی روح کہا گیا ہے، اور جبریلِؑ امین کو بھی روح کہا گیا ہے، لیکن اس لفظ کا کثیر الاستعمال اور متداول مفہوم رُوحِ انسانی ہے، جسے اُردو میں 'جان' کہا جاتا ہے۔
اِسی طرح لفظِ نفس کے بھی لُغت میں کئی معنے آتے ہیں ۔خون کو بھی نفس کہا جاتا ہے۔ نظرِ بد کو بھی نفس کہا گیا ہے، مثلاً عربی میں محاورہ ہے" اَصَابَتْ فُلَانًا نَفْسٌ اى عین" یعنی فلاں کو نظرِ بد لگ گئی ہے ۔ ذات کے معنوں میں بھی یہ لفظ آتا ہے، جیسے فَسَلِّمُوْا عَلٰی اَنْفُسِكُمْ (النور ۔ ۶۱) لَا تَقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ (النساء ۔ ۲۸) میں نیز قرآن کریم کی دوسری آیات میں بھی نفس ذات کے معنوں میں آیا ہے، مگر نفسِ انسانی روحِ انسانی کے مفہوم میں زیادہ استعمال ہوتا ہے یہ دونوں ہم معنی الفاظ ہیں، البتہ روح جب جسم سے متعلق ہو تو اس کو بالعموم نفس کہا جاتا ہے اور جب جسمانی تعلق سے کٹ کر مجرّد ہو جائے تو پھر روح کا اطلاق اس پہ زیادہ ہوتا ہے ۔
محقّقینِ اہلِ سنّت والجماعۃ کی تحقیق یہ ہے کہ نفس ایک ہے جس کی صفات متعدِد ہیں ۔ جب بہیمیّت اور حیوانی خواہشات کے غالب ہونے کی بنا پہ نفس برائی کی جانب مائل ہوتا ہے، تو نفسِ امّارہ کہلاتا ہے ۔ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْءِ (یوسف ۵۳) ۔
جب مَلَکِیّت اور روحانیت کے غلبے کی وجہ سے نفس برائی اور بے اعتدالی سے پریشان ہوتا ہے اور اپنے آپ کو ملامت کرتا ہے تو نفسِ لَوّامہ بن جاتا ہے ! وَلَا اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ (القیامہ ۔ ۲)

جب مَلکیّت اور رُوحانیّت میں مزید قوّت پیدا ہو جاتی ہے کہ عبادت، اطاعت، اَخلاقِ حَسَنہ اور بھلائی کے کام اُس کی غذا بن جاتے ہیں، یعنی جب انسان صورتاً بشر اور سیرتاً فرشتہ ہو جاتا ہے اور اللہ کی فرمانبرداری اور شریعت کی پیروی میں سکون و چین اور فرحت وسُرور محسوس کرتا ہے، تو اس نفس کو مُطْمَئِنَّہ کہتے ہیں:

يٰاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِىٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً

(الفجر ۲۸)

(اے وہ نفس جس نے چین پکڑ لیا، پھر چل اپنے رب کی طرف، تو اُس سے راضی وہ تجھ سے راضی)

دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ نفس اگر عالَمِ بالا کی جانب مائل ہو تو مُطْمَئِنَّہ ہے۔ عالَمِ سِفلی (مادہ) کی طرف جھک کر لذّات وخواہشات میں پھنس گیا ہو، تو اَمّارہ ہے اور اگر کبھی عالَمِ سِفلی کی طرف جھکتا ہو اور کبھی عالَمِ بالا کی طرف مائل ہو کر برائی پر شرمندہ ہوتا ہو، تو پھر لَوّامہ کہلاتا ہے۔ یہ تین نام اس کے اسماءِ صفاتی ہیں جو اس کی تین حالتوں کے اعتبار سے دیئے گئے ہیں۔ اللہ کے مقرّب اور خاص بندوں کا نفس مُطْمَئِنَّہ ہوتا ہے۔ عام ابرار کا نفس لَوّامہ ہوتا ہے اور فُجّار کا نفس اَمّارہ ہوتا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دعا ہے: اَللّٰھم انی اسئلك نفسًا بك مطمئنةً تؤمن بلقائك وترضىٰ بقضائك وتقنع بطاعتك۔ تفسیر ابن کثیر جلد ۴۔ ص۵۱۱ مطبعہ مصطفیٰ محمد مصر۔ بحوالہ ابن عساکر۔

(اے اللہ! میں تجھ سے ایسا نفس طلب کرتا ہوں جو تجھ پر مطمئن ہو، تیرے حضور حاضر ہونے پہ ایمان رکھتا ہو، تیرے فیصلے پر راضی ہو اور تیری اطاعت پہ قانع ہو)۔

انسانیّت کی اساس روحانیّت ہے

قرآن کریم میں جسم اور رُوح کے مجموعے کو انسان کہا گیا ہے، لیکن انسان کی انسانیّت

اُس کے تعقّل، وادراک، اور دیگر فضائل وخصوصیات کا دارومدار روحِ انسانی پر ہے۔
قرآنِ کریم کی آٹھ آیتوں میں روحِ انسانی کا ذکر آیا ہے :

النّساء - ۱۷۱ ـــــ الحجر - ۲۹ ـــــ بنی اسرائیل - ۸۵
مریم - ۱۷ ـــــ السجدہ - ۹، ص - ۷۲،
ـــــ التحریم - ۱۲ ـــــ

بطورِ مثال سورۃ السجدہ کی آیت کا بغور مطالعہ کیجئے :

ذٰلِكَ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ٥ الَّذِي أَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهُ وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنسَانِ مِن طِينٍ ٥ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ مِن سُلَالَةٍ مِّن مَّاءٍ مَّهِينٍ ٥ ثُمَّ سَوَّاهُ وَنَفَخَ فِيهِ مِن رُّوحِهِ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ ٥ (السجدہ - ۶ - ۷ - ۸ - ۹، پارہ ۲۱)

(یہ ہے جاننے والا پوشیدہ اور ظاہر کا زبردست رحم والا ـــ جس نے خوب بنائی جو چیز بھی بنائی اور آغاز کیا انسان کی پیدائش کا گارے سے ـــ پھر بنائی اُس کی اولاد نچڑے ہوئے بے قدر پانی سے ـــ پھر اس کو برابر کیا اور پھونکی اُس کے اندر اپنی روح اور بنا دیے تمہارے لئے کان اور آنکھیں اور دل، تم بہت تھوڑا شکر کرتے ہو)

یعنی اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو تو براہِ راست مٹی سے بنایا اور اُس کے اعضاء و جوارح کو موزوں اور متناسب ـــ کر کے اُس کے جسم میں اپنی پیدا کردہ رُوح پھُونک دی، لیکن اولادِ آدمؑ کی تخلیق کا سلسلہ اس طرح قائم کیا کہ جسم تو نطفے سے بنتا ہے جو بہت سی غذاؤں کا نچوڑ ہے۔ غذائیں سب زمین کی مٹی سے حاصل ہوتی ہیں اس طرح اولادِ آدمؑ بھی بالواسطہ مٹی ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ شکمِ مادر میں جب بچّے کا جسم بن جاتا ہے، اُس کے اعضاء کا توازن وتناسب مکمل ہو جاتا ہے، تو خداوندِ قدّوس اپنی

رُوح اُس میں ڈال دیتا ہے، ________ اور اِس کے بعد وہ انسان کہلانے کا مستحق ہوتا ہے۔

بے جان جسمِ انسانی مُجسّمہ تو ہوتا ہے، مگر انسان نہیں ہوتا۔ روحِ انسانی کو اللہ نے اپنی جانب اس لئے منسوب کیا ہے کہ یہ مادی عناصر سے نہیں بنائی گئی، جیسا کہ مادہ پرستوں کا خیال ہے، بلکہ عالمِ بالا سے آئی ہے۔ دُوسری وجہ اس نسبت کی یہ ہے کہ جسمِ انسانی ایک زمینی اور مادی چیز ہے اور اِس کا وجود اور بقا بھی زمینی غذاؤں پہ موقوف ہے، لیکن روحِ انسانی آسمانی مخلوق ہے اور اِس کی ترقی کا دارومدار بھی آسمانی غذا پہ ہے، یعنی وہ علوم و معارف اور اخلاق و احکام جو بذریعہ وحی نازل ہوئے ہیں، کسی دانشور اور فیلسوف کے معلوم کردہ نہیں ہیں اُس کی غذا ہیں۔ تیسری وجہ اللہ کی جانب منسوب ہونے کی یہ ہے کہ اللہ کی ملاقات کا شوق اور اُس کی دیدار کی خواہش روحِ انسانی کی فطرت اور سرشت میں شامل ہے۔ چوتھی وجہ یہ ہے کہ مادی اجسام کی طرح روح بھی اللہ کی مخلوق ہے، کوئی قدیم، اَزلی اور غیر مخلوق چیز نہیں ہے، تو یہ مخلوق کی نسبت ہے اپنے خالق کی جانب جیسے اَرْضُ اللّٰہِ اور نَاقَۃُ اللّٰہِ کی نسبت ہے۔

نفسِ انسانی اور روح کا جسدِ انسانی کے ساتھ تعلّق اور اس کا وجود بدیہیات میں سے ہے جس طرح ہر شخص جانتا ہے کہ میری آنکھ میں بینائی موجود ہے۔ کان کے اندر سُننے کی قوّت موجود ہے، اسی طرح بغیر کسی استدلال کے ہر شخص علمِ حضوری کے ساتھ جانتا ہے کہ میرے جسدِ خاکی میں کوئی چیز موجود ہے جو غور و فکر، تعقّل و تفکّر، علم و ادراک اور حرکاتِ ارادیہ کا منبع ہے، اور یہ چیز صرف روحِ حیوانی، یعنی نَسمہ ہوائیہ نہیں ہے جو دورانِ خون اور حرارتِ طبیعیّہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ یہ تو ہر جاندار کے اندر موجود ہے، بلکہ کوئی اور چیز ہے، بس اسی کا نام روحِ انسانی اور نفسِ ناطقہ ہے۔ تمام انبیاءؑ اور قدیم و جدید فلاسفہ و حکماء روح کے وجود کے قائل ہیں جو جسمِ انسانی پر حکمران تو ہے، لیکن اپنی حقیقت کے اعتبار سے جسم سے ممتاز و منفرد ہے۔

زندگی اور حیات، روح اور جسم کے تعلق کا نام ہے اور موت اس تعلق کے ختم ہونے

سے واقع ہوتی ہے۔ جسم سے نکلنے کے بعد روح باقی رہتی ہے، فنا نہیں ہوتی۔

ابو نصرؒ فارابی کی تحقیق :

ابو نصرؒ فارابی (۲۵۹ھ - ۳۳۹ھ) اپنی کتاب "السیاسۃ المدنیۃ" الملقّب "بمبادی الموجودات" میں لکھتے ہیں :

فالقوة الناطقه هی التی بها یحوز الانسان العلوم و الصّناعات، وبها یُمَیِّزُ بین الجمیل والقبیح من الافعال والاخلاق[1]

(پس نفسِ ناطقہ، یعنی قوّتِ مُدرکہ اور رُوحِ انسانی ہی وہ قوّت ہے جس کی وجہ سے انسان مختلف علوم اور صنعتوں کا ذخیرہ جمع کرتا ہے اور اسی کی وجہ سے اچھے اور بُرے افعال و اخلاق میں تمیز کرنے کے قابل ہوتا ہے)

ابو علیؒ ابن سینا :

ابنِ سینا (۳۷۵ھ - ۴۲۸ھ) نے نفسِ انسانی کے موضوع پر قدیم و جدید فلسفیوں کے مقابلے میں زیادہ تفصیل سے بات کی ہے اِس موضوع سے اُس کی دلچسپی کا یہ عالم ہے کہ اُس کی تمام اہم کتابوں میں نفسِ ناطقہ اور روحِ انسانی پر بڑی عمیق اور دقیق بحثیں اور تحقیقات موجود ہیں۔ اپنی کتاب " القانون" میں قوائے نفسیّہ کی وضاحت طِبّی طرز و اسلوب پر کی ہے "الشِفَا" میں اس موضوع پر مستقل اور طویل فصل قائم کی ہے۔ "النّجاۃ" میں اسی فصل کا خلاصہ نئے تدریسی انداز میں بیان کیا ہے "الاشارات" کی قسم دوم میں النمط الثالث کے سارے مباحث نفس ہی سے متعلق ہیں۔ ابنِ سینا نے ارسطو کی کتاب النفس پر تعلیقات و حواشی بھی لکھے ہیں جس کا قلمی نسخہ مصر کے

---

[1] السیاسۃ المدنیہ - از فارابی، طبع بیروت ۱۹۶۴ء۔ ص ۳۲، ۳۳ -

دارالکُتب العربیہ میں موجود ہے۔ علاوہ ازیں اس موضوع پر ابنِ سینا نے مستقل رسالہ بھی لکھا ہے جس کا نام ہے" رِسَالَۃٌ فِی القُویٰ النَّفسَانِیَہ" یہ رسالہ اُس نے امیر نوح بن منصور سامانی کو تحفے کے طور پر بھیجا تھا۔ اس کے ایک دوسرے سالے کا عنوان ہے" مَعْرِفَۃُ النَّفْسِ النَّاطِقَۃِ وَاَحْوَالُھَا" نفس کے ہبوط و نزول کے موضوع پر ابنِ سینا کا قصیدہ تو بہت زیادہ مشہور ہے۔" الاشارات والتنبیہات" میں لکھتے ہیں :

"اے انسان! گہری نظر سے غور و فکر کر۔ تیری جسمانی حالت درست ہو یا اس میں کچھ خلل واقع ہوگیا ہو اگر تیری سوچ درست ہے تو تُو اپنی ذات کے وجود سے انکار نہیں کر سکتا۔ یہاں تک کہ نیند اور نشے کی حالت میں بھی انسان اپنے وجود سے غافل نہیں رہ سکتا۔

فرض کرو کہ تم خلا میں ہو۔ نہ تم اپنے جسمانی اعضاء کو دیکھ سکتے ہو اور نہ یہ اعضاء ایک دوسرے سے ٹکراتے ہوں اس حالت میں تم ہر چیز سے غافل اور بے خبر رہو گے، سوائے اپنی ذات اور وجود کے"[1]

اس کے بعد عقلی دلائل سے ثابت کیا ہے کہ" انسان اپنی ذات اور وجود کا ادراک جس قوت کے ذریعے کرتا ہے وہ جسم کے اعضاء و جوارح نہیں ہیں، بلکہ کوئی دوسری چیز ہے جس کو ہم نفسِ انسانی کہہ سکتے ہیں۔ یہی وہ جوہر ہے جو قوتِ محرکہ کا منبع اور ادراک کا مرکز ہے اور یہی اعضاء میں بھی تصرّف کرتا ہے، بلکہ کل بدن میں تصرّف کرتا ہے"[2]

امام فخر الدینؒ رازی

(۱) رازیؒ (۵۴۴ھ - ۶۰۶ھ) نے اس موضوع پر مستقل کتاب لکھی ہے جس کا

---

[1] الاشارات مع شرح الطوسی، طبع دار المعارف مصر جلد-۲-
ص۳۴۳ تا ۳۴۵ -

[2] ص۳۴۵ تا ۳۵۵ -

نام ہے "کِتَابُ النَّفْسِ وَالرُّوْحِ وَشَرْحِ قُوَاهَا" اِس کتاب کی فصلِ رابع میں چھ عقلی دلائل اور فصلِ خامس میں دس نقلی دلائل (قرآن وسنّت سے) اس بات کے ثبوت میں بیان کئے گئے ہیں کہ نفسِ انسانی اور روحِ انسانی جسمِ انسانی سے منفرد ایک قوّت ہے اور یہی اصل انسان ہے۔ جسم صرف اس کی سواری ہے جس پر انسان حکمرانی کرتا ہے"[1]

کائنات میں انسان کے مرتبے اور مقام کی تشریح کرتے ہوئے امام رازیؒ فرماتے ہیں:

مخلوق کی چار قسمیں ہیں:

۱۔ جو عقل وحکمت تو رکھتے ہیں، مگر ارادہ اور شہوت نہیں رکھتے، یعنی فرشتے۔

۲۔ جو عقل وحکمت سے تو محروم ہیں، لیکن ارادہ وشہوت رکھتے ہیں یعنی حیوانات۔

۳۔ جو عقل وحکمت اور ارادہ وشہوت سب سے خالی ہیں، یعنی جمادات ونباتات۔

۴۔ جو عقل وحکمت بھی رکھتے ہیں اور ارادہ وشہوت سے بھی محروم نہیں، یعنی انسان۔

فرشتوں اور انسانوں کے درمیان ایک فرق یہ بھی ہے کہ روحِ انسانی ——— کے اندر خدا کی معرفت کا شوق موجود ہے جبکہ فرشتے اس جذبے سے محروم ہیں۔ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ جو چیز بالکل نامعلوم ہو اس کے حصول کا میلان بھی دل میں پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ مجہولِ مطلق کی طلب محال ہے۔ اور جو چیز مکمل طور پر معلوم ہو اُس کے حصول کا داعیہ بھی دل میں پیدا نہیں ہوتا، اس لئے تحصیلِ حاصل بھی محال ہے۔ فرشتوں کو چونکہ خدا کی کامل معرفت بالفعل حاصل ہے اور اس کامل معرفت میں کسی قسم کی غفلت اور وہم وتخیّل نقص پیدا نہیں کرسکتا اس لئے شوقِ معرفت کے جذبے کی اُن کو ضرورت ہی نہیں ہے، لیکن انسان کو اللہ کی توحید کا استدلالی علم تو حاصل ہے، مگر مکمل معرفت بالفعل حاصل نہیں ہے۔ اس لئے شوق وجذب اور طلب کا داعیہ اِس کے اندر موجود ہے"[2]

امام رازیؒ نے جسم وروح کے تعلق کو بعض حکماء کی بیان کردہ مثالوں کے ذریعے سمجھایا

---

[1] کتاب النفس۔ طبع اسلام آباد ۱۹۶۸ء، ص۳۰ تا ۵۰۔

[2] ایضاً، ص۳ تا ۶ ملخصاً۔

ہے چند مثالیں ملاحظہ کیجئے :

۱۔ "رُوح جسم کے اس عالَمِ اصغر کی حکمران ہے، عقل حکمران کی مُشیر اور شہوانی قوّت کی مثال اُس غلام کی سی ہے جو خوراک سپلائی کرتا ہے۔ اسی طرح قوتِ غضب کی مثال پولیس اور فوج کی سی ہے، جو دفاع وحفاظت کا کام کرتی ہے۔

خوراک اور اشیائے صَرف بہم پہنچانے والا غلام بعض اوقات مکّار اور خبیث النفس ہوتا ہے۔ وہ بظاہر خیرخواہ اور وفادار نظر آتا ہے، لیکن درپردہ نقصان پہنچانے پہ تُلا رہتا ہے، بلکہ کبھی کبھی تو بادشاہ کے مُخلص وزیر و مُشیر کے مقابلے پہ آمادہ ہوجاتا ہے۔ عاقل ودانا بادشاہ کا فرض ہے کہ کسی وزیر کو اس غلام پہ پوری طرح بااختیار بنادے۔ اسی طرح پولیس اور باڈی گارڈ پہ بھی وزیر کو بالادست بنانا ضروری ہے تاکہ وہ ان سے بھی دھوکہ بازی اور فریب کاری نہ کرسکے۔ بادشاہ کو چاہئے کہ مخلص اور خیرخواہ وزیر ومشیر کے خلاف شہوت اور غضب کی سازشوں سے باخبر رہے، اسی صورت میں اس کی مملکت کا نظم درست اور برقرار رہ سکتا ہے۔ اگر قوّتِ شہوانی اور قوّتِ غضبی عقل وحکمت کے وزیر کے قابو میں ہو تو زندگی خوشگوار رہتی ہے ورنہ تباہی آجاتی ہے[1]"

۲۔ "جسم ایک مُلک ہے ــــ رُوح اس کی حکمران ہے ــــ حواس وعقل اس کی فوج ــــ اعضاء وجوارح اس کی رعیّت ــــ اور شہوت وغضب اس کے دشمن ہیں۔ جو ملک اور رعیت دونوں کی تباہی کے درپے رہتے ہیں۔ اگر حکمران یعنی روح نے ان دونوں دشمنوں پہ غلبہ حاصل کرکے ان کو قابو میں کرلیا، تو ملک کا نظم درست رہے گا ورنہ بربادی یقینی ہے ملک کی بھی اور حکمران کی بھی"

۳۔ "رُوح ایک شاہسوار ہے جو شکار کے لئے نکلا ہے ــــ شہوت اس

[1] کتاب النفس۔ از امام رازی ص۸۔

کا گھوڑا ہے، غضب اس کا شکاری کتّا ہے۔ اگر سوار دانا، گھوڑا فرمانبردار اور کتّا سدھایا ہوا ہو، تو شکاری شاہسوار کامیاب رہے گا ورنہ شکاری، گھوڑا اور کتّا تینوں تباہی و بربادی کے ایسے گڑھے میں گر جائیں گے جس سے نکلنے کا کوئی راستہ نہ ہوگا۔[1]

اِن مثالوں سے یہ سمجھانا مقصود ہے کہ جسدِ خاکی کی اہمیّت اپنی جگہ مسلّم ہے، مگر اصل جوہرِ انسانیّت نفس و روح ہے۔ مادی جسم کتنا بھی صحت مند ہو، لیکن اگر رُوحانی قوّت کمزور ہو، تو انسان کی امتیازی حیثیت ختم ہو جاتی ہے اور وہ عام جانوروں کی طرح کا ایک جانور رہ جاتا ہے۔

ابنِ قیّمؒ :

ابنِ قیّمؒ (۶۹۱ھ - ۷۵۱ھ) نے "کتابُ الرُّوح" میں رُوح سے متعلق مباحث بڑی تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ کتاب میں ۲۱ مسائل ہیں اور ہر ایک مسئلے کے تحت ذیلی عنوانات اور فصُول ہیں جن میں اَحادیث و آثار کی مدد سے بہت قیمتی معلومات مُہیّا کی گئی ہیں۔

المسئلۃ الاُولیٰ کے زیرِ عنوان یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اَرواح نہ صرف یہ کہ موجود ہیں، بلکہ زیارت کرنے والے زندہ لوگوں کو پہچانتی بھی ہیں اور ان کا سلام بھی سنتی ہیں۔ اس کے ثبوت میں ابنِ قیّمؒ نے کچھ احادیث نقل کی ہیں جن کی سندوں پر بعض محدّثین نے تنقید کی ہے، مگر ابنِ قیّمؒ کے نزدیک قابلِ قبول ہیں۔[2]

المسئلۃ الثانیہ میں قوی دلائل سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ عالمِ ارواح میں اہلِ ایمان کی روحیں ایک دوسرے سے ملتی بھی ہیں اور ایک دوسرے کو پہچانتی بھی

---

[1] کتاب النفس۔ صہ ۸۱-۸۲۔

[2] کتاب الروح۔ طبع بیروت ۱۹۶۶ئ، صہ ۵ تا ۱۶۔

ہیں۔[1]

المسئلة الثالثہ میں قرآن وسنت کے دلائل سے ثابت کیا گیا ہے کہ خواب میں زندہ لوگوں کی روحیں مُردوں کی ارواح سے ملتی ہیں اور اُن سے ایسی معلومات حاصل کرتی ہیں جو اکثر صحیح ثابت ہوتی ہیں۔ اس سلسلے میں خواب کے گیارہ واقعات نقل کئے گئے ہیں۔

ابنِ قیمؒ نے خواب کی حالت میں زندوں اور مردوں کی روحوں کی ملاقات ثابت کرنے کے لئے سورۃ الزُّمر کی یہ آیت پیش کی ہے :

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰى اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى ط اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ (الزمر۔۴۲)

(اللہ قبض کر لیتا ہے جانیں جب وقت ہو اُن کے مرنے کا اور جو نہیں مریں اُنکی روح قبض کر لیتا ہے اُن کی نیند میں۔ پس روک لیتا ہے جن پہ مرنا ٹھہرا دیا ہے اور بھیج دیتا ہے اوروں کو ایک وقت مقرر تک ۔ اس بات میں نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لئے جو فکر کرتے ہیں)

شیخ الاسلام ابنِ تیمیہؒ اور جمہور مفسرین نے اس آیت کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ جس شخص کا نیند کی حالت ہی میں مرنے کا فیصلہ ہو چکا ہو اُس کی روح روک لی جاتی ہے لیکن جس کی زندگی کے دن ابھی باقی ہوں اُس کی روح واپس بھیج دی جاتی ہے اور انسان بیدار ہو جاتا ہے، مگر ابنِ قیمؒ نے اپنے استاذ سے اختلاف کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس سے مردوں اور زندوں کے ارواح کی باہمی ملاقات مراد ہے۔ بیدار ہوتے وقت مُردے کی روح روک لی جاتی ہے اور زندہ کی واپس ہو جاتی ہے۔ انہوں نے اس مفہوم پر حافظ

---

[1] کتاب الروح۔ طبع بیروت ۱۹۶۶ء، صہ ۱۷ تا ۲۰۔

ابنِ مَندہؒ کی سند کے ساتھ حضرت ابنِ عباسؓ کا قول بھی نقل کیا ہے[1]

قدیم و جدید فلاسفہ اور رُوحِ انسانی

رُوحِ انسانی کے موضوع پر مصر کے مشہور محقّق محمد فرید وَجدی (متوفی ۱۹۵۴ء) نے دائرۃ المعارف میں ۸۰ صفحات پر مشتمل طویل مقالہ لکھا ہے جس میں اس مسئلے کے ہر پہلو پر تفصیلی معلومات ملتی ہیں۔ قدیم و جدید فلاسفہ کے عقائد بھی نقل کئے گئے ہیں اور جدید مادی دلائل سے بھی روح کا وجود ثابت کیا گیا ہے۔ اس مقالے کے بعض اقتباسات ملاحظہ کیجئے:

اہلِ ہند کا عقیدہ:

"ہزاروں سال سے ہندی قوم کا یہ عقیدہ رہا ہے کہ روحِ انسانی ایک "نَفخۂ الٰہیۃ" ہے (یعنی جسم کے اندر اللہ کا پیدا کردہ ایک جوہر ہے) جسے موت کے بعد ایسے نورانی، صاف وشفاف اور لطیف جسم کا لباس پہنایا جاتا ہے جس کو انسان کی یہ مادی آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں، موت کے بعد یہ نورانی جسم عالمِ بالا کی جانب پرواز کر جاتا ہے۔ ہم عصر محقّقین کی تحقیق بھی اسی سے ملتی جلتی ہے۔"[2]

مصرِ قدیم کا عقیدہ:

"۵۰۰۰ سنہ ق م میں مصر کے لوگوں کا عقیدہ یہ تھا کہ روح جب جسم سے نکل جاتی ہے تو اس کو ایک ایسے جدید جسم کا لباس پہنایا جاتا ہے جو دنیوی جسم سے بلند بھی ہوتا ہے اور

---

[1] کتاب الرّوح۔ ص ۲۰ تا ۴۳۔

[2] دائرۃ المعارف۔ از فرید وَجدی، ج ۴، ص ۳۲۴۔

لطیف ترین بھی - اس جسم پہ مادی اثرات مرتب نہیں ہوتے - مصری اسی روحانی جسم کو (کا) کہتے تھے[1]"

چینی قوم کا عقیدہ :

" قدیم چینی قوم نہ صرف یہ کہ روح کے وجود کی قائل تھی، بلکہ ارواح کی پرستش بھی کرتی تھی - چینی فلسفی کنفیوشس (متوفی ۴۹۸ ق م) کہا کرتا تھا کہ روح غیر مادی غلاف میں پوشیدہ ہے جس پہ فنا کے اثرات مرتب نہیں ہو سکتے - ارواح ہمارے اردگرد گھیرا ڈالے ہوئے ہیں اور ان کے اندر جسمانی شکل میں ظاہر ہونے کی قدرت بھی موجود ہے[2]"

اہلِ ایران کا عقیدہ :

" ایران و فارس کے قدیم ترین لوگوں کا عقیدہ یہ تھا کہ روحِ انسانی جسمِ انسانی کی محافظ ہے جو موت کے بعد آسمان پہ چلی جاتی ہے اور ابدی زندگی کے فوائد حاصل کر لیتی ہے[3]"

فلاسفۂ یونان کا نظریہ :

" قدیم یونانی قوم روح کے وجود کی سب سے زیادہ قائل رہی ہے - قدیم ترین یونانی شاعر " ہیومیروس " ارواح کی ملاقات کا بھی قائل تھا - موری نے اپنی کتاب " الَسِحْرُ وَ التَّنْجِیم " میں لکھا ہے کہ جمہور فلاسفۂ یونان کا عقیدہ یہ تھا کہ ہر انسان کی ایک روح ہے جو اس کی محافظ ہے - تالیس، سُقْرَاط، افلاطون اور ارسطو سب

---

۱ دائرۃ المعارف - از فرید وجدی، ج ۴، ص ۳۲۴ -

۲ ایضاً ، ملخصاً

۳ ایضاً "

کے سبب روحِ مُجَرّد کے قائل تھے اور اسی کو غور و فکر اور تعقل و ادراک کا سرچشمہ قرار دیتے تھے۔ خُلاصہ یہ ہے کہ وجودِ روح کا عقیدہ دنیا کی قدیم و جدید قوموں میں بالعموم موجود رہا ہے[1]۔"

اہلِ یورپ کا عقیدہ :

یورپ کے جدید فلاسفہ بھی کسی قدر جزوی اختلافات کے ساتھ جسمِ انسانی سے ممتاز اور علیحدہ روحانی جوہر کے وجود کے بالعموم قائل رہے ہیں۔ جدید فلسفے کے بانی ڈیکارٹ (متوفی ۱۶۵۰ء)، باکوَن، مالبرانش (م ۱۷۱۵ء) لبنتز (م ۱۷۱۶ء) کو دودرش، باسکال اور دیگر مغربی فلسفیوں نے روح کے وجود، اُس کی حقیقت اور دائرۂ کار پہ تفصیلی بحثیں کی ہیں۔ ڈیکارٹ کا عقیدہ یہ تھا کہ روح جسم سے ممتاز ایک جوہر ہے جو فکر اور تعقل کا منبع ہے۔ جسم تو فنا ہو جاتا ہے، لیکن روح باقی رہتی ہے[2]۔

رُوح کا ثبوت حِسّی دلائل کی روشنی میں

فرید وَجدیؒ نے اس عنوان کے تحت جدید ترین فلسفۂ محسوسات کے ممتاز ماہرین کی آراء نقل کی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اَرواح کا وجود نہ صرف عقلی دلائل سے ثابت کیا جا سکتا ہے، بلکہ ان کو "عملِ تنویمِ مِقناطیسی" اور "نفسیاتی اثر آفریني" کے ذریعے دیکھا بھی جا سکتا ہے۔ یورپ میں ایسی انجمنیں اور سوسائٹیاں قائم ہوئی ہیں جو اَرواح کو دیکھنے کے تجربات کرتی رہتی ہیں۔ ۱۸۶۹ء میں اِسی قسم کی ایک انجمن قائم ہوئی تھی جس میں انگلستان، فرانس، امریکہ، المانیا (جرمنی) اور اٹلی کے ۴۷ ممتاز ماہرین شریک تھے۔ اس انجمن نے

---

[1] فرید وَجدی، مُلخصًا، ج ۴، ص ۳۲۴ تا ۳۲۶۔

[2] تفصیلات کے لئے ملاحظہ کیجئے فرید وَجدی، ج ۴، ص ۳۲۷ تا ۳۳۰۔ دائرۃ المعارف۔

مسلسل ۱۸ ماہ تک اپنے تجربات جاری رکھے اور طویل بحث مباحثے کے بعد اپنی رپورٹ میں اعتراف کیا کہ ہم اپنے مشاہدات، تجربات، حسّی اور قطعی دلائل کی بنیاد پر یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اَرواح موجود ہیں اور ان کو محسوس بھی کیا جا سکتا ہے۔ انجمن کے بعض ارکان ابتدا میں مشاہدۂ ارواح کو وہم سمجھتے تھے، لیکن تجربات کے بعد وہ بھی قائل ہو گئے۔ اِن ۴۷ افراد کے نام اور ان کی رپورٹ تفصیلی طور پر وَجدی نے نقل کی ہے[1]۔

یورپ کے مفکّرین اب امنِ عالَم کے لئے روحانیت کی جانب لوگوں کو متوجّہ کر رہے ہیں۔ "ڈاکٹر الیکسس کاریل" اپنی کتاب " الانسانُ ذٰلکَ المجھول" میں لکھتے ہیں :

" ضروری ہو گیا ہے کہ اب آلات وجمادات کی دنیا سے جسمِ انسانی اور روحِ انسانی دونوں کی جانب رجوع کیا جائے[2]۔"

یورپ ہی کے ایک دوسرے ماہر کا بیان اس بارے میں حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ایک مُلحِد ماہرِ نفسیات تھا۔ جو خدا اور آخرت کا قائل نہیں تھا، لیکن آخرِ کار اُس کو ایمان کی دولت نصیب ہو گئی۔ اس نے اپنی سرگزشت ایک کتاب میں لکھی ہے جس کا نام ہے " اَلعَوْدَۃُ اِلیَ الاِیْمانِ " (ایمان کی جانب رجوع) یہ کتاب امریکہ میں ۴۷ مرتبہ طبع ہو کر شائع ہو چکی ہے۔ موصوف لکھتے ہیں :

" ایمان باللہ کی جانب رجوع کی وجہ نہ مالی پریشانی ہے اور نہ معاشی تنگدستی ہے اور نہ بڑھاپا۔ میں ۴۵ سال کی عمر کا صحت مند شخص تھا اور میری آمدنی خرچ سے زیادہ تھی اور میں کسی ذہنی اُلجھن میں بھی مبتلا نہیں تھا۔ میرے دل میں یہ ہدایت غیر محسوس طور پر پیدا ہوئی تھی، یہاں تک کہ مجھے وہ مراحل بھی یاد نہیں ہیں جن سے میرا نفس گزرا تھا۔ میری اس فکری تبدیلی کا اصل

---

[1] ملاحظہ کیجئے دائرۃ المعارف۔ از فرید وَجدی، ج ۴، ص ۳۶۴ تا ۴۰۰۔

[2] رکائزالایمان۔ از محمد الغزالی، طبع بیروت ۱۹۶۷ء، ص ۳۴۔

سبب وہ تجربات ہیں جو نفسیاتی طرز پر علاج کرنے والے ڈاکٹر کے فرائض ادا کرتے ہوئے میرے سامنے آتے رہے ہیں[1]۔

وہ تجربات یہ تھے کہ دماغی اور اعصابی مریضوں کا مؤثر ترین علاج ایمان اور دین ثابت ہو رہا تھا۔ اور یہ حقیقت کھل کر سامنے آ رہی تھی کہ ایمان باللہ انسان کے نفس و روح کا فطری اور جبلّی تقاضا ہے۔ تجربہ چونکہ فلسفے سے زیادہ مؤثر ہوتا ہے اس لئے اس ڈاکٹر کو ایمان نصیب ہو گیا۔

رُوحِ انسان کی ماہیّت

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَ مَا اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا (بنی اسرائیل ۔ ۸۵)

(اور پوچھتے ہیں تجھ سے روح کے بارے میں، کہدے روح ہے میرے رب کے حکم سے اور نہیں دیا گیا تم کو علم مگر تھوڑا سا)

اس آیت کے شانِ نزول کے بارے میں دو روایتیں آئی ہیں۔ بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت یہ ہے کہ میں رسول اللہؐ کے ہمراہ مدینہ منوّرہ کے ایک بنجر اور غیر آباد راستے پر جا رہا تھا۔ آپؐ کے ہاتھ میں کھجور کی ایک شاخ تھی۔ آپؐ یہودیوں کی ایک ٹولی کے پاس سے گزر رہے تھے کہ اُن میں سے ایک نے کہا اس سے روح کے متعلّق سوال کرو۔ دوسرے نے کہا نہ پوچھو کہیں ایسا جواب نہ دے دے جسے تم پسند نہ کرتے ہو، لیکن دوسروں نے کہا ہم تو ضرور پوچھیں گے، چنانچہ اُن میں سے ایک نے اُٹھ کر کہا۔ اے ابوالقاسمؐ! روح کیا چیز ہے؟ آپؐ خاموش ہو گئے۔ مَیں نے دل

---

[1] العودۃ الی الایمان، ص ۱۴ - ۱۵، بحوالہ الایمان والحیاۃ، ص ۳۵۲ - ۳۵۳ -

میں سوچا کہ آپؐ پر وحی آرہی ہے ۔ مَیں کھڑا ہوگیا ۔ جب آپؐ سے نزولِ وحی کی حالت ختم ہوئی تو فرمایا : وَيَسْئَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ ..... الخ[1]

اِس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت مدینہ منورہ میں نازل ہوئی تھی اور سوال کرنے والے مدینہ کے یہودی تھے ۔ لیکن امام احمدؒ، ترمذیؒ اور نسائیؒ نے ابن عباسؓ کی روایت نقل کی ہے کہ مکہ مکرمہ میں قریش نے یہودیوں کے مشورے سے یہ سوال کیا تھا ۔ ابنِ کثیرؒ نے کہا ہے ممکن ہے کہ نزول مکرر ہوا ہو[2]

سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اِسی سوال کے جواب میں یہ آیت پہلے مکہ میں نازل ہو چکی تھی، تو رسولؐ اللہ نے مدینہ کے یہود کے سوال کے جواب میں یہ آیت فوراً کیوں نہ پڑھی اور نزولِ وحی کا انتظار کیوں کیا ؟ حالانکہ بخاری کی مذکورہ روایت میں آیا ہے کہ آپؐ وحی کے انتظار میں خاموش ہو گئے تھے ۔

بعض مفسرین نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ انتظار کی وجہ شاید روح کے متعلق کچھ مزید وضاحت کی خواہش تھی، لیکن اللہ تعالیٰ نے وہی مکی آیت دوبارہ نازل فرمادی اور مزید وضاحت نہیں فرمائی[3]

جمہور مُفسّرین کے نزدیک اس آیت میں روح سے مراد روحِ انسانی ہے ۔ آیت میں یہود و قریش کے اس سوال کے نقل کرنے سے مقصد یہ بتانا ہے کہ دین میں جن چیزوں کا جاننا ضروری ہے اُن سے تو یہ لوگ اعراض کرتے ہیں اور جن چیزوں کا سمجھنا اور اُن کی ماہیئت کا جاننا ضروری نہیں ان میں ضد وعِناد اور تعنُّت کی بنا پہ جھگڑتے ہیں ۔ دوراز کار بحثوں سے ان کو فرصت ہی نہیں ملتی کہ روحِ قرآنی اور وحیِ خداوندی سے ایمانی اور روحانی زندگی حاصل کرسکیں اور اس نسخۂ کیمیا اور شِفاءِ روحانی سے فائدہ اٹھائیں ۔ روحِ انسانی

---

[1] بخاری شریف ۔ کتاب العلم وکتاب التفسیر وکتاب الاعتصام وکتاب التوحید ۔

[2] تفسیرابنِ کثیر ۔ ج ۴ ، ص ۳۴۵ ، بنی اسرائیل ، آیت ۸۵ ۔

[3] تفسیرِ مظھری ۔ ج ۵ ، ص ۴۸۶ ، نقلاً عن ابن حجرؒ ۔

سے روحِ قرآنی کی جانب توجہ دلانے کے لئے سورۂ بنی اسرائیل کی ابعد کی چار آیتوں (۸۶-۸۷-۸۸-۸۹) میں قرآنِ کریم کی شان کا ذکر ہوا ہے کہ یہ اللہ کی رحمت ہے، بے مثال معجزہ ہے اور اس میں ضروری مضامین بار بار مختلف پیرایوں میں بیان ہوئے ہیں۔

روحِ انسانی کیا ہے؟ جوہر ہے یا عرض؟ مادّی ہے یا مجرّد؟ بسیط ہے یا مرکب؟ اس قسم کے غامض اور غیر ضروری سوالات کا حل کرنا نہ نجات کے لیے ضروری ہے اور نہ یہ انبیاء کے فرائضِ دعوت و تبلیغ سے تعلق رکھتا ہے۔ روح کی اصل ماہیّت اور کُنہ کا قطعی علم حاصل کرنا انسان کے بس میں نہیں ہے، اس لئے کہ یہ ایک غیر مادی اور غیر محسوس چیز ہے اور عقل کا دائرۂ کار مادیات و محسوسات ہیں، لیکن اس آیت میں روح سے متعلق جو ضروری باتیں بیان ہوئی ہیں اُن کا جاننا مفید بھی ہے اور ضروری بھی۔ وہ اُصولی باتیں یہ ہیں :

۱۔ انسان کے اندر اس محسوس اور مادی جسم کے علاوہ کوئی اور چیز بھی موجود ہے جسے روح کہتے ہیں۔ یہ کوئی قدیم، غیر مخلوق اور ازلی چیز نہیں ہے، بلکہ اللہ کے حکم سے بغیر مادے کے جسم کے اندر پیدا کی گئی ہے، جس کی وجہ سے جسم کو زندگی ملتی ہے : ثُمَّ اَنۡشَاۡنٰهُ خَلۡقًا اٰخَرَ (المؤمنون) یہی روح ادراک و شعور اور غور و فکر کا سرچشمہ ہے۔

۲۔ روح کا شعور و ادراک بھی اللہ کا عطیّہ ہے، قلیل ہے، محدود ہے۔ مُحیط اور لامحدود نہیں ہے : وَمَاۤ اُوۡتِيۡتُمۡ مِّنَ الۡعِلۡمِ اِلَّا قَلِيۡلًا ۔

آیت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ روح کا اجمالی علم بھی کسی کو حاصل نہیں ہو سکتا؛ یہی وجہ ہے کہ علماءِ اسلام نے اس موضوع پر بحثیں کیں اور کتابیں لکھیں ہیں۔

روح کی اجمالی تعریف ابن العربیؒ (متوفی ۵۴۳ھ) نے اس طرح کی ہے :

والروح خلق من خلق اللّٰه جعله اللّٰه فی الاجسام فاحیاها به وعلمها واقدرها وبنی علیها الصفات الشریفة والاخلاق الکریمة وقابلها باضدادها النقصان الادمیّة

فاذا اراد العبد انکارها لم یقدر لظهور آثارها و اذا اراد معرفتها وهی بین جنبیه لم یستطع[1]۔

(روح اللہ کی مخلوق میں سے ایک مخلوق ہے جسے اس نے اجسام کے اندر ڈال دیا ہے۔ اجسام کو اسی روح کی وجہ سے زندگی دی ہے، علم دیا ہے اور قدرت و قوّت عطا فرمائی ہے۔ صفاتِ شریفہ اور اخلاقِ کریمہ کی بنا اسی پہ رکھی ہے)

اِن صفات کے بالمقابل بُری صفات انسان میں آدمی کے ناقص ہونے کی وجہ سے پیدا کی ہیں۔ اگر کوئی شخص روح کے وجود سے انکار کرنا چاہے بھی تو نہیں کرسکتا، اس لئے کہ اس کے آثار ظاہر اور محسوس ہیں، لیکن جب اس کی اصل ماہیّت جاننا چاہے تو اپنے دونوں پہلوؤں کے درمیان موجود ہونے کے باوجود جان نہیں سکے گا

علاّمہ آلوسیؒ نے روح المعانی میں، قُلِ الرُّوحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّی کی تفسیر میں ا صفحات پہ تفصیلی بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس سلسلے میں مشہور و متداول قول دو ہیں :

۱۔ "روحِ انسانی جسم نہیں ہے، بلکہ جوہرِ مجرّد ہے (غیر مادّی ہے) جو جسم میں داخل بھی نہیں ہے اور بالکل خارج بھی نہیں ہے۔ جسم کا ایک حصّہ بھی نہیں ہے (مُتّصِل بالجِسْم) اور بالکل جدا بھی نہیں ہے (مُنْفَصِل عَنِ الْجِسْم)، بلکہ خارج سے اس کا تعلق جسم سے قائم ہے اعضاءِ انسانی کی حرکات اسی تعلق کی وجہ سے صادر ہوتی ہیں اور یہی جوہرِ مجرّد جَسد میں تصرّف کرتا ہے"

الٰہیّات کے فلسفیوں کی بالعموم یہی رائے ہے۔ اہلِ علم کی ایک جماعت نے بھی یہی رائے قائم کی ہے (حدُوثِ روح کے عقیدے

---

[1] احکام القرآن۔ از ابن العربی، ج ۳، صہ ۱۲۲۴، طبع بیروت، لبنان۔

کے ساتھ) امام راغب اصفہانیؒ، امام غزالیؒ، امام رازیؒ، معتزلہ میں سے مَعْمر بن عَبّاد السلمی، اہلِ تشیع میں سے "الشیخ المفید" اور اہلِ کشف صوفیاء کی اکثریت کی یہی رائے ہے[1]۔"

۲۔ جمہور اہلِ سنّت والجماعۃ کی تحقیق یہ ہے کہ روح ایک جسمِ لطیف ہے۔ امام ابنِ قیمؒ لکھتے ہیں:

"اصل انسان، یعنی روحِ انسانی ایک جسم ہے جو اپنی ماہیّت کے لحاظ سے محسوس مادی جسم سے مختلف ہے۔ یہ ایک نورانی، آسمانی (عُلوی) لطیف، زندہ اور متحرّک جسم ہے جو جسدِ خاکی کے اندر نُفُوذ کئے ہوئے ہے اور جسم کے اندر اس طرح جاری و ساری ہے جیسے گلاب کے پتوں میں پانی یا زیتون کے دانے میں روغن یا انگارے میں حرارت ہوتی ہے۔ جب تک جسم اور اعضاءِ روحانی جسم کے آثار قبول کرنے کے قابل ہوتے ہیں اُس وقت تک یہ جسمِ لطیف جسمِ کثیف کے اندر رہتا ہے، لیکن جب فسادِ مزاج اور اِخلاطِ غلیظہ کے غلبے کی وجہ سے جسمِ خاکی خراب ہو جاتا ہے (موت واقع ہو جاتی ہے)، تو روح بدن سے نکل کر عالمِ ارواح میں چلی جاتی ہے۔"

یہی قول صحیح ہے، قرآن و سنّت، اجماعِ صحابہؓ اور عقل و فطرت اسی قول کو ثابت کرتے ہیں؛ چنانچہ ہم اس رائے پر ترتیب وار دلائل قائم کرتے ہیں۔"

اس کے بعد امام ابنِ قیمؒ نے اس کے ثبوت میں ۱۱۶ دلائل ذکر کئے ہیں[2]۔ علّامہ آلوسیؒ نے بھی اسی کو "قولِ مُعتمد" قرار دیا ہے۔ امام غزالیؒ کے شیخ امام الحرمینؒ نے اس رائے کو "مذہبِ قوی اور قولِ شریف" کہا ہے[3]۔"

---

[1] روح المعانی ۔ ج ۱۵، ص ۱۵۶، طبع رشیدیہ، لاھور ۔

[2] کتاب الرُّوح ۔ از ابنِ قیمؒ، طبع بیروت ۱۹۷۵ء، ص ۱۷۸ تا ۱۹۶ ۔

[3] روح المعانی ۔ ج ۱۵، ص ۱۵۵۔

مادہ پرستوں کی خود فراموشی

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللّٰهَ فَأَنْسَاهُمْ أَنْفُسَهُمْ ط
أُولٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ٥ (الحشر ١٩ - پارہ ٢٨)
(اور مت بنو اُن جیسے جنہوں نے بھلا دیا اللہ کو، تو بھلا دیئے اللہ نے اُن کو اپنے نفس۔ یہی لوگ ہیں نافرمان)

وَفِي أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ٥ الذاریٰت۔ ٢١
(اور خود تمہارے نفس کے اندر نشانیاں ہیں تو کیا تم کو سوجھتا نہیں)

اصل جوہر انسانی روح ہے، جیسا کہ گذشتہ بحث میں ثابت کیا گیا ہے، لیکن مُلحدوں اور مادّہ پرستوں نے روح و نفس سے توجہ ہٹا کر جسم و مادہ کی پوجا شروع کر دی ہے۔ کھاتے ہیں، پیتے ہیں، مکانات بناتے ہیں، کارخانے لگاتے ہیں، جنسی لذّت حاصل کرتے ہیں اور سو جاتے ہیں اور دوسرے روز اُٹھ کر پھر وہی مصروفیات شروع ہو جاتی ہیں۔ جسم پرستی کے اس چکر سے اُن کو فرصت ہی نہیں ملتی کہ وہ اپنے نفس و روح پر توجہ دیں۔ غفلت اور خود فراموشی کی یہی وہ روش ہے جس کی وجہ سے یہ لوگ مادّے کی تو پرستش کرتے ہیں، لیکن اس مادے کے خالق کے وجود ہی سے انکار کرتے ہیں۔

اُن کے پاس کوئی عقلی، نقلی، تجرباتی یا نفسیاتی دلیل نہیں ہے جس نے اُن کو خدا کی ہستی اور مذہب سے بغاوت پر مجبور کیا ہو۔ ظاہر ہے کہ عقلِ حیوانی سے حیوانیت کا راستہ ہی معلوم ہو سکتا ہے جس پر یہ خود فراموش لوگ جانوروں کی طرح چل رہے ہیں اور پیٹ کی پوجا میں ہر وقت سرگرداں ہیں۔

اعلیٰ انسانی اقدار اور روحانی فضائل کا اِدراک عقلِ حیوانی سے نہیں، بلکہ عقلِ انسانی سے ہی ہو سکتا ہے جس سے یہ بے چارے محروم ہو چکے ہیں۔ دہریہ خدا فراموش

ہی نہیں ہوتا، بلکہ خود فراموش بھی ہوتا ہے :

اَللّٰھُمَّ لَا تَجْعَلْنَا مِنَ الَّذِیْنَ
نَسُوا اللّٰہَ فَاَنْسَاھُمْ اَنْفُسَھُمْ

آمین

آٹھواں باب

انسانوں کی اکثریت کا عقیدہ

قرآنِ کریم اور تاریخ عالم دونوں سے ثابت ہوتا ہے کہ دنیا کی قدیم و جدید قومیں خالقِ کائنات کے وجود کی قائل رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء نے توحید کے مسئلے پر زیادہ زور دیا ہے۔ اصل نزاع خدا کو نہ ماننے میں نہیں، بلکہ اصل نزاع "توحیدِ الٰہ" کے مسئلے پر رہا ہے۔

انسانی تاریخ کے تمام اَدوار میں مُنکرینِ خدا کی تعداد نہ ہونے کے برابر رہی ہے۔ اور اس ناقابلِ اعتنا تعداد نے بھی دہریت پر کوئی دلیل پیش نہیں کی، سوائے اس کے کہ ہم خدا کو دیکھتے نہیں ہیں، حالانکہ تمام سلیم العقل حکماء کا مسلّمہ قول ہے کہ "عدمِ مشاہدہ" "عدمِ وجود" کی دلیل نہیں ہے۔ موجودات کا علم "مشاہدۂ ذات" سے بھی حاصل ہوتا ہے اور "مشاہدۂ آثار" سے بھی۔ ابنِ سینا نے "الاشارات" کے فنِ "الٰہیّات" کے آغاز میں لکھا ہے کہ جزئیات کے مشاہدے سے کُلیّات کا علم حاصل ہو سکتا ہے، حالانکہ حقائقِ کُلیّہ کو حواسِ ظاہری سے محسوس نہیں کیا جاسکتا۔ جدید مغربی فلسفیوں نے بھی اس کی مثالیں بیان کی ہیں، جیسا کہ گذشتہ صفحات میں حوالے دیے جاچکے ہیں۔

قرآن کریم کی بعض آیات ملاحظہ کیجئے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی قوموں نے توحید و رسالت سے تو انکار کیا تھا، لیکن اللہ کی ہستی کی وہ بھی قائل تھیں۔ انبیاء کے ساتھ اُن کا سارا جھگڑا اس بات میں تھا کہ ہم اپنے باپ دادا کے خداؤں کو کیسے چھوڑ دیں اور اپنی طرح کے انسانوں کو اللہ کے رسول کیسے مان لیں!

"کیا نہیں پہنچی تم کو خبر اُن لوگوں کی جو پہلے تھے تم سے۔ قومِ نوحؑ کی اور عاد و ثمود کی اور جو اُن کے بعد گزرے ہیں۔ نہیں جانتا ان کو کوئی بھی سوائے

اللہ کے۔ آئے تھے اُن کے پاس اُن کے رسول نشانیاں لے کر، تو لوٹا دیے تھے اُنہوں نے اپنے ہاتھ اپنے مُنہ میں (یعنی غصّے سے ہاتھ کاٹنے لگے) اور کہنے لگے ہم تو نہیں مانتے جو تم کو دے کر بھیجا گیا ہے اور ہم کو تو شبہ ہے اس بات میں جس کی طرف تم ہم کو بلاتے ہو۔ جو ہم کو خلجان (تردّد) میں ڈالنے والا ہے۔ بولے اُن کے رسول، کیا اللہ کے بارے میں شبہ ہے جو بنانے والا ہے آسمانوں کا اور زمین کا؟ وہ تم کو بلاتا ہے تاکہ بخشدے تم کو تمہارے گناہ اور ڈھیل دے تم کو اُس مدّت تک جو مقرر ہو چکی ہے۔ کہنے لگے تم تو یہی آدمی ہو ہم جیسے، تم چاہتے ہو کہ روک دو ہم کو اُن چیزوں سے جن کو پوجتے رہے ہمارے باپ دادا، تو لاؤ کوئی کھلی دلیل۔ کہا اُن کو اُن کے رسولوں نے ہم تو اسی طرح کے آدمی ہیں جیسے تم ہو، لیکن اللہ احسان کرتا ہے جس پر چاہے اور ہمارے لئے ممکن نہیں کہ لے آئیں تمہارے پاس دلیل (معجزہ)، مگر اللہ کے حکم سے اور اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہئے ایمان والوں کو۔" (ابراھیم ۹ تا ۱۱ - پارہ ۱۳)

اِن آیات میں قومِ نوح، قومِ عاد، قومِ ثمود اور بعد کی قوموں کے صرف دو شبہات کا ذکر کیا گیا ہے:

الف: تم ہم جیسے بشر ہو، تو ہم کیسے مان لیں کہ تم اللہ کے رسول ہو؟

ب: ہم تمہارے کہنے پر اُن خداؤں کو کیسے چھوڑ دیں جنہیں ہمارے باپ دادا پوجتے تھے۔

انبیاء نے جب کہا کہ "کیا اللہ کے بارے میں شبہ ہے جس نے آسمان و زمین بنائے ہیں؟" تو اُن میں سے کسی نے یہ نہیں کہا تھا کہ آسمان و زمین کے بنانے والے کو ہم تو جانتے ہی نہیں، اور اس سے معلوم ہوا کہ وجودِ خالق کا عقیدہ اُن کے ہاں بھی تسلیم شدہ تھا۔ اگر جھگڑا تھا تو توحیدِ الٰہ میں تھا۔

امام قرطبیؒ لکھتے ہیں:

أفی اللّٰہِ شک ای أفی قدرۃ اللّٰہ شک لانھم متفقون علیھا[1]

(کیا تم کو اللہ کی قدرت میں شک ہے؟ اس لئے کہ یہ لوگ اس کے وجود پر متفق تھے)

ابنِ کثیرؒ لکھتے ہیں:

أفی وجودہٖ شک فان الفطر شاھدۃ بوجودہٖ ومجبولۃ علی الاقرار بہٖ ۔ والمعنی الثانی أفی الوھیّتہٖ شک فان غالب الأمم کانت مقرّۃ بالصانع ولکن تعبد معہٗ غیرہٗ[2]

(کیا اللہ کے وجود میں شک ہے؟ اس لئے کہ انسانی فطرتیں اس کے وجود کی گواہ ہیں اور اُن کی جبلتیں اُس کا اقرار کرتی ہیں۔ دوسرے معنے یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ کیا اللہ کی معبودیّت کے بارے میں شک ہے؟ اس لئے کہ قوموں کی غالب اکثریّت خالق کے وجود کی تو قائل رہی ہیں، لیکن وہ اس کے ساتھ دوسروں کی پرستش کرتی رہی ہیں)

عَرب اللہ کی ہستی کو مانتے تھے

قرآنِ کریم سے ثابت ہوتا ہے کہ کفّارِ عَرب خالقِ کائنات کی ہستی کو مانتے تھے، اگرچہ وسطی اور جنوبی عرب میں بعض مادّہ پرست، اور فلسفی مزاج لوگ ایسے بھی موجود تھے جو آخرت کے بھی منکر تھے اور خدا کے وجود کو بھی نہیں مانتے تھے۔ وہ کہتے

---

[1] تفسیر قرطبی، طبع قاہرہ ۱۹۶۷ء، ج ۱، صـ ۳۴۶ ۔

[2] تفسیر ابنِ کثیر، طبع بیروت ۱۹۶۶ء، ج ۴، صـ ۱۱۲ ـ ۱۱۳ ۔

تھے کہ موت و حیات کا یہ سلسلہ مادی اور طبیعی قوانین پر مبنی ہے اور سب کچھ زمانے اور دہر کا چکر ہے۔ نہ کوئی فاعل مختار ہے جو ہمیں زندگی اور موت دیتا ہے اور نہ کوئی دوسرا عالم ہے جہاں ہمیں جا کر حساب دینا پڑے گا۔ انہی مادہ پرستوں کے بارے میں ارشادِ خداوندی ہے:

وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ۝ (الجاثیہ ۲۴ - پ ۲۵)

(اور یہ لوگ کہتے ہیں نہیں ہے کوئی زندگی سوائے موجودہ زندگی کے، مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور نہیں مارتا ہم کو، مگر زمانہ، حالانکہ نہیں ہے اُن کے پاس اس بات پر کوئی دلیل۔ نہیں ہیں یہ، مگر اٹکل پچو باتیں بنانے والے)

اس کے بعد اسی سورت کی آیت ۲۴ میں اللہ نے فرمایا کہ جب ان دہریوں اور آخرت کے منکروں کے سامنے قدرتِ خداوندی کی کھلی آیات اور قطعی دلائل پیش کئے جاتے ہیں تو اُن کے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ کہتے ہیں ہمارے باپ دادا کو زندہ کر کے سامنے لے آؤ۔ حالانکہ اللہ کے رسول نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ میں مردوں کو جب چاہوں گا زندہ کر دوں گا، بلکہ یہ کہا تھا کہ اللہ جب چاہے گا ان کو زندہ کر کے قیامت کے روز اپنے سامنے حاضر کر دے گا۔

حافظ ابنِ کثیرؒ اور امام جصاصؒ نے فرمایا کہ خدا اور آخرت سے انکار پر مشتمل یہ قول عرب کے بعض فلسفیوں اور زندیقوں کا تھا:

وهذا يقوله مشركوا العرب المنكرون المعاد'.....
وتقوله الفلاسفة الدهرية المنكرون للصانع [1]

(یہ ان مشرکینِ عرب کا قول ہے جو دوبارہ زندہ ہونے کو نہیں مانتے تھے'

---

[1] تفسیر ابن کثیر۔ ج ۶، ص ۲۶۹، طبع بیروت ۱۹۶۶ئ۔

اور ان لادین فلسفیوں کا قول ہے جو خالقِ کائنات کے وجود کے منکر تھے)

امام جصاصؒ فرماتے ہیں : " ھذا قول زنادقۃ قریش الذین کانوا ینکرون الصانع الحکیم"۔[1]

(یہ قریش کے اُن زندیقوں کا قول ہے جو صانعِ حقیقی کے وجود کو نہیں مانتے تھے)

ممکن ہے کہ یہ ان لوگوں کا قول ہو جو خالقِ کائنات کی ہستی کے تو قائل تھے مگر موت وحیات اور حوادثِ عالَم کو دہر کی طرف منسوب کرتے تھے اور اللہ کو اپنی مخلوق میں تصرف کرنے سے مُعطّل سمجھتے تھے، جیسا کہ یونان کے فلسفی واقعاتِ عالَم کو عقلِ فعّال کی جانب منسوب کرتے تھے، یعنی خدا اگرچہ موجود ہے، مگر زندگی اور موت، صحت ومرض اور دیگر واقعات طبعی قوانین اور نظامِ شمسی کی وجہ سے رات دن کے اُلٹ پھیر کا نتیجہ ہیں۔ جب اُن پر کوئی مصیبت آتی تو زمانے کو بُرا بھلا کہتے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے انہی مُعَطِّلہ (لادینوں) کے بارے میں فرمایا ہے:

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہؐ یقول تعالیٰ یؤذینی ابن آدم یسبّ الدھر وانا الدھر بیدی الامر اُقلّب لیلہٗ ونھارہٗ (بخاری ومسلم)

(حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ کہ آدم کا بیٹا مجھے ایذا پہنچاتا ہے اور غصہ دلاتا ہے جب وہ زمانے کو گالی دیتا ہے اور بُرا بھلا کہتا ہے، حالانکہ میں ہی دَھر ہوں، میرے ہاتھ میں ہر کام ہے اور رات دن کا اُلٹ پھیر بھی میرے ہی اختیار میں ہے)

مسلم شریف کی ایک دوسری روایت میں آیا ہے: "لا تسبّوا الدھر فان اللہ تعالیٰ ھو الدھر"۔

---

[1] تفسیر جصاص۔ ج ۳، ص ۳۸۹، الجاثیہ۔

(زمانے کو بُرا نہ کہا کرو، اس لئے کہ اللہ ہی تو زمانہ ہے)

امام شافعیؒ، ابوعبیدہؒ معمر بن مثنیؒ اور دیگر ائمۂ تفسیر نے اَنَا الدَّھرُ اور ان اللہَ ھُوَ الدَّھر کا مفہوم یہ بیان فرمایا ہے کہ زمانے کا خالق بھی اللہ ہے اور اس میں رونما ہونے والے حوادث و واقعات کا فاعلِ حقیقی بھی اللہ ہے[1]۔ زمانہ فاعل نہیں ہے بلکہ صرف ظرفِ زمان ہے۔ اس کو گالی دینا دراصل اللہ کو گالی دینا ہے۔ زمانے میں نہ شعور ہے اور نہ ارادہ۔ سعادت و نحوست میں اس کا دخل نہیں ہے۔

اِن مٹھی بھر بے دینوں یا مُعَطّلہ کے علاوہ عرب کے لوگ خدا کے قائل تھے۔

قرآنِ کریم کی متعدد آیات میں کفارِ عرب کے اقرارِ خدا کا ذکر ہوا ہے:

۱۔ قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝ (المومنون پ۱۸-۸۵-۸۴)

(اِن سے کہو کہ کس کے لئے ہے زمین اور جو کچھ اس میں ہے، بتاؤ اگر تم جانتے ہو؟ وہ فوراً کہہ دیں گے کہ سب کچھ اللہ کے لئے ہے۔ اِن سے کہو کہ پھر مانتے کیوں نہیں ہو؟)

یعنی توحید اور آخرت کو کیوں نہیں مانتے ہو؟ اور دوسروں کی پرستش کیوں کرتے ہو؟

۲۔ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ۝ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ (المؤمنون ۸۶-۸۷)

(ان سے پوچھو کہ سات آسمانوں اور عرشِ عظیم کا مالک کون ہے؟ یہ فوراً کہہ دیں گے کہ سب کچھ اللہ ہی کے لئے ہے۔ ان سے کہو پھر ڈرتے کیوں نہیں ہو؟)

۳۔ قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ

---

[1] تفسیر ابن کثیر۔ ج ۶، ص ۲۶۹ ونحوہ فی شرح مسلم للنوویؒ۔

عَلَيْهِ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ٥ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ط قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ ٥ (المومنون ۸۸-۸۹)

(ان سے پوچھو کہ کس کے ہاتھ میں ہے اختیار ہر چیز کا؟ اور کون ہے، وہ جو پناہ دیتا ہے اور پناہ نہیں دے سکتا کوئی کسی کو اُس کے مقابلے میں، بتاؤ اگر تم جانتے ہو؟ فوراً کہہ دیں گے یہ اختیار تو اللہ ہی کے لئے ہے۔ ان سے کہو پھر کہاں سے جادو کر دیا گیا ہے تم پر؟)

یعنی جب اللہ کو آسمانوں کا، عرشِ عظیم کا اور ہر چیز کا خالق، مالک اور مختارِ کُل مانتے ہو تو پھر اُس کے ساتھ دوسروں کو شریک کیوں ٹھہراتے ہو؟ اور حیات بعد المَمات سے کیوں انکار کرتے ہو؟ دوبارہ زندہ کرنا پہلی مرتبہ پیدا کرنے سے مشکل تو نہیں ہے۔ تمہاری عقل کہاں ماری گئی ہے اور کہاں سے تم پر جادو ہوا ہے کہ اتنے مخبوط الحواس ہو گئے ہو؟ مقدمات کو ماننا اور نتیجے کو نہ ماننا۔ دلیل کو تسلیم کرنا اور اُس سے ثابت ہونے والی بات سے انکار کرنا کسی ذی عقل اور سلیم الحواس انسان کا کام تو نہیں ہو سکتا۔

۴۔ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ط فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ٥

(العنکبوت ۶۱ - پ ۲۱)

(اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے، اور سورج اور چاند کو کس نے مسخّر کیا ہے؟ (یعنی کام پر لگا رکھا ہے) تو ضرور کہیں گے اللہ نے۔ پھر کدھر اُلٹے چلے جا رہے ہیں؟)

۵۔ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ط قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ط بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ٥ (العنکبوت ۶۳ - پ ۲۱)

(اگر تم ان سے پوچھو کہ کس نے آسمان سے پانی برسایا اور اس کے

ذریعے مردہ زمین کو زندہ کیا ؟ تو ضرور کہہ دیں گے اللہ نے ۔ کہو سب
تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں، مگر ان میں سے اکثر لوگ سمجھتے نہیں ہیں)

۶ ۔ وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ ؕ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۝ لقمٰن ۔ ۲۵ ۔ پ ۲۱ ۔

(اور اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے، تو یہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔ کہو سب تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں مگر ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں)

۷ ۔ وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ ؕ (الزمر ۔ ۳۸ ۔ پ ۲۴)

(اور اگر تم اُن سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے ؟ تو ضرور کہیں گے اللہ نے)

۸ ۔ وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيزُ الْعَلِيمُ ۝ (الزخرف ۔ ۹ ۔ پ ۲۵)

(اور اگر تم ان سے پوچھو کہ کس نے پیدا کیا ہے آسمانوں اور زمین کو ؟ تو ضرور کہیں گے پیدا کیا ہے ان کو غالب اور جاننے والے خدا نے)

۹ ۔ وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ ؕ فَأَنّٰى يُؤْفَكُونَ ۝ (الزخرف ۔ ۸۷ ۔ پ ۲۵)

(اور اگر تم ان سے پوچھو کہ ان کو کس نے پیدا کیا ہے ؟ تو ضرور کہیں گے اللہ نے ۔ پھر کدھر الٹے چلے جا رہے ہیں ؟)

اِن آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ اہلِ عرب نے اگرچہ دینِ ابراہیمی کو بدل کر نیا مشرکانہ مذہب اختیار کر لیا تھا، لیکن خالقِ کائنات کی ہستی کے وہ نہ صرف یہ کہ قائل تھے، بلکہ اس کے نام، یعنی اللہ سے بھی واقف تھے ۔ اہلِ ایمان کے لئے تو قرآنِ کریم کی تصریحات سے زیادہ قوی اور قطعی دلیل ممکن ہی نہیں ہے، لیکن آثارِ قدیمہ کے جدید ترین انکشافات بھی اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ عرب اللہ کے نام سے باخبر تھے ۔ علامہ شبلیؒ اور علامہ

سیّد سلیمان ندویؒ نے "مذاہب و اخلاق کے انسائیکلوپیڈیا" سے پروفیسر "نولدیکی" کی تحقیق یوں نقل فرمائی ہے :

"اللہ" جو صفا کے کتبوں میں "ھلّہ" لکھا ہوا ہے نابتی اور دیگر قدیم باشندگانِ عربِ شمالی کے نام کا ایک جز تھا مثلاً زبد اللّٰہی، عبد اللّٰہی... نابتی کتبات میں اللہ کا نام بطور ایک علیحدہ معبود کے نہیں ملتا، لیکن صفا کے کتبات میں ملتا ہے۔ متاخرین مشرکین میں اللہ کا نام نہایت عام ہے "ولہاسن" نے عرب قدیم کے لٹریچر میں بہت سی عبارتیں نقل کی ہیں جن میں اللہ کا لفظ بطور ایک معبودِ اعظم کے مستعمل ہوا ہے[1]۔"

---

[1] سیرۃ النبی۔ ج ۱، ص ۱۲۲ طبع سعید کراچی، طبع چہارم۔

نواں باب

مالکیّت

"خالقیّت" اور "مالکیّت" کے درمیان عقلی اور منطقی تلازم ہے، یعنی دونوں لازم وملزوم ہیں۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں؛

"ولا مالكَ الا الخَالقُ" (مالک وہی ہو سکتا ہے جو خالق ہو[1])

عقل اس بات کو جائز نہیں سمجھ سکتی کہ کائنات کو پیدا تو اللہ نے کیا ہے، لیکن اس کا مالک اور بادشاہ کوئی دوسرا ہو۔ یہ ایسا تضاد ہے جس کا کوئی ذی عقل تصور نہیں کر سکتا۔ جب خالق اللہ کی ذات ہے، تو مالک، رب، مختارِ کل، مدبّر، متصرّف، کارساز، حاجت روا اور مشکل کشا بھی وہی ہے۔ موت و حیات، عزّت و ذلّت اور نفع و ضرر اُسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ جسے چاہتا ہے زندگی دے دیتا ہے اور جب چاہے اُس سے زندگی چھین لیتا ہے۔ جسے چاہے دولت و ثروت اور عزّت و قوّت دے دیتا ہے اور جب چاہے اُس سے یہ نعمتیں واپس لے لیتا ہے۔ جب چاہے اولاد دے دیتا ہے اور جب چاہے اُس سے یہ نعمت لے لیتا ہے۔ جب چاہے بارش برسا کر زمین کو سرسبز و شاداب بنا دیتا ہے اور جب چاہے بارش روک کر زمین کو بنجر اور غیر آباد کر دیتا ہے اور اس دنیا میں نفع و ضرر کے

---

[1] المستصفیٰ۔ ج ۱، ص ۵۳، طبع مصر۔

جواسباب اُس نے پیدا کئے ہیں ان کو مؤثر بنانے والا بھی وہی ہے : فَتَعَالَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۔

مَالک اور مَلِک کی لُغوی تحقیق

مالک، مِلک (میم کی زیر) سے لیا گیا ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کو قابو میں رکھنا اور اس پر قبضہ کر لینا اور مَلِک، مُلک (میم کی پیش) سے لیا گیا ہے جس کے معنی ہیں تصرّف کرنا اور حکم چلانا ۔ اللہ کے مالک ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ ساری کائنات اُس کے قبضۂ قدرت میں ہے کوئی چیز اُس کے قبضے سے باہر نہیں ہے اور مَلِک ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ اپنی کائنات پر عملاً حکمرانی کر رہا ہے، حکم چلا رہا ہے، تصرّفات کر رہا ہے اور نظم ونسق چلا رہا ہے، لیکن یہ دونوں لفظ تقریباً ہم معنی بھی استعمال ہوتے ہیں، اس لئے کہ قبضۂ تصرّف واختیار ہی کے لئے ہوتا ہے، اور تصرّف بغیر قبضے کے نہیں ہو سکتا، تو اللہ کا مالک اور مَلِک ہونا تقریباً ہم معنی ہیں ۔

ابنِ منظور افریقی (متوفی ۷۱۱ھ) لکھتے ہیں :

اَلْمَلْكُ وَالْمُلْكُ وَالْمِلْكُ احتواءُ الشيءِ والقدرة على الاستبداد به مَلَكَهُ يملكه مَلْكًا ومِلْكًا ومُلْكًا [1]

(مَلْک، مُلْک اور مِلْک (میم کی زبر، پیش اور زیر کے ساتھ) تینوں کے معنی ہیں کسی چیز کو قابو میں رکھنا ۔ اُس پر قبضہ کرنا اور مستقل بالذات اور بلاشرکتِ غیرے تصرّف کی قدرت رکھنا ۔ مَلَکَ يَمْلِکُ (ماضی مفتوح العین اور مضارع مکسور العین) کے باب سے مَلْک، مِلْک اور مُلْک تینوں مصادر آتے ہیں)

---

[1] لسان العرب ۔ باب الکاف ۔ فصل المیم ۔ طبع بیروت، ج ۱۰، ص ۴۹۲ ۔

مَلِك اور مَلِيْك کی جمع مُلُوك آتی ہے اور مَالِك کی جمع مُلّاك اور مُمَّلك ۔

وَ الْمَلِكُ وَ الْمَلِيْكُ وَ الْمَالِكُ ذُوْ الْمُلْكِ[1]

(مَلِكْ ، مَلِيْك اور مَالِك تینوں کے معنی ہیں اختیار و تصرّف کرنے والا بادشاہ)

ائمۂ تفسیر نے بھی مالکیّت اور مُلکیّت کا یہی مفہوم بیان فرمایا ہے۔

امام المفسّرین محمد بن جریر طبریؒ (متوفی ۳۱۰ھ) فرماتے ہیں :

بیده مُلك الدنیا والآخرة وسلطانهما نافذٌ فیهما امرُهٗ وقضاءُهٗ[2]

(اُسی کے ہاتھ میں ہے دنیا و آخرت دونوں کی بادشاہی اور سلطنت؛ دونوں جہانوں میں اُسی کا حکم اور فیصلہ نافذ ہے)

امام قرطبیؒ (متوفی ۶۷۱ھ) لکھتے ہیں :

لان المالك للشيئ هو المتصرف فی الشيئ والقادرُ علیه والله عزوجل مِلك الاشیاء ومصرّفها علیٰ ارادته[3]

(کسی چیز کا مالک وہ ہوتا ہے جو اُس میں تصرّف کرتا ہو اور اُس تصرّف پر قُدرت رکھتا ہو، اللہ عزّوجل تمام اشیاء کا بادشاہ ہے جو اُن میں حسبِ منشا تصرّف کرتا ہے)

مالک اور مَلِک کا اطلاق اگرچہ انسان پر بھی ہوتا ہے، لیکن اس کے تصرّفات و اختیارات اور اس کی حکومت و سلطنتِ غیبی طاقت پر مبنی نہیں ہوتی، بلکہ سراسر اسباب

---

[1] لسان العرب - ج ۱۵، ص ۴۹۲

[2] تفسیر ابن جریر ، ج ۲۹ ، ص ۱ ، طبع مصر ۱۹۵۴ء ۔

[3] تفسیر قرطبی - ج ۱۸ ، ص ۲۰۶ ۔

ظاہری کے ماتحت ہوتی ہے، اور اسباب فراہم کرنا اور اُن میں اثر پیدا کرنا خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اس لئے بظاہر تو انسان مالک اور مَلِک کہلاتا ہے، لیکن حقیقت میں ہر انسان فقیر، عبد اور عاجز و ناتواں ہے۔ فَقر و احتیاج خاصّۂ مخلوق ہے اور غِنا و صَمَدیّت خاصّۂ خالق ہے۔ یٰاَیُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ اِلَی اللّٰهِ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ۔ (اے لوگو! تم فقیر ہو اور اللہ تعالیٰ بے نیاز اور ستودہ صفات ہے۔ (فاطر-۱۵)

امام فخرالدین رازیؒ (متوفی ۶۰۶ھ) فرماتے ہیں:

"فیا ایھا الملوك لا تغترّوا بما لکم من المال و الملك فانکم اُسَرَاء فی قبضة قدرة مالك یوم الدین۔ و یا ایھا الرعیّة اذا کنتم تخافون سیاسة الملوك افما تخافون سیاسة مَلِكِ الملوك الذی هو مالك یوم الدین"۔[1]

(اے حکمرانو! اپنے مال و دولت اور حکومت و سلطنت سے دھوکہ نہ کھاؤ، تم تو مالکِ روزِ جزا کے قبضۂ قدرت میں قیدی ہو۔ اور اے رعایا! جب تم اپنے حکمرانوں کی قوّت اور سزا سے ڈرتے ہو، تو بادشاہوں کے بادشاہ (اللہ) کی قوّت اور سزا سے کیوں نہیں ڈرتے، جو روزِ جزا کا مالک ہے)

اَلْمَلِكُ الحق اور مَلِكُ الاملاك یعنی حقیقی بادشاہ اور شہنشاہِ عالَم صرف اللہ کی ذات ہے۔ اسی لئے تو رسول اللہ نے انسان کے لئے "مَلِكُ الْاَمْلَاكِ" یعنی شہنشاہ نام رکھنے سے منع فرمایا ہے اور اسے بُرا اور قبیح نام قرار دیا ہے۔

---

[1] تفسیر کبیر۔ ج ۱، ص ۲۳۹۔

دسواں باب

اللہ تعالیٰ کے مالک الملک ہونے کا ذکر قرآنِ کریم میں

اللہ رب العٰلمین کے "ملکِ تکوینی" کا ذکر قرآنِ کریم میں لفظ مُلک اور اُس کے مُشتقات کے ساتھ کم از کم ۳۸ مقامات پر ہوا ہے۔ مُلکِ تکوینی سے مراد کارسازی اور حاجت روائی ہے، یعنی اللہ کے وہ تصرّفات جن سے بغاوت کرنے کی قوّت نہ انس و جنّ کو حاصل ہے اور نہ کسی دوسری مخلوق کو۔ اس باب میں مُلک تشریعی کا ثبوت اور اس کی تشریح کرنا پیشِ نظر ہے، مُلکِ تشریعی سے مراد حاکمیّتِ تشریعیۃ، یعنی قانون سازی ہے۔ اس موضوع پر میری کتاب" اسلامی سیاست" کے باب سوم، فصل ثالث، اَصلِ اوّل میں تفصیلی بحث درج ہے۔

یہاں اُن آیات کا ایک نقشہ پیش کیا جارہا ہے جن میں م۔ل۔ک کے مادے سے مشتق ایسے الفاظ کا ذکر ہوا ہے جن سے اللہ کی تکوینی بادشاہی اور تصرّفات واختیارات کا ثبوت مہیّا ہوتا ہے۔ مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ جس طرح اس عالم کے پیدا کرنے میں اللہ کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے، اِسی طرح اِس کا نظم چلانے اور تصرّفات میں بھی اُس کے ساتھ کوئی شریک وسہیم نہیں ہے۔

نقشہ آیات

نام سورت	نمبر آیت	نام سورت	نمبر آیت	نام سورت	نمبر آیت
الفاتحہ	۳	الاسراء	۱۱۱	حٰمٓ الزخرف	۸۵
البقرہ	۱۰۷	الحج	۵۶	حٰمٓ الجاثیہ	۲۷
آلِ عمران	۲۶	المؤمنون	۸۸	الفتح	۱۴
آلِ عمران	۱۸۹	المؤمنون	۱۱۶	القمر	۵۵
المائدہ	۱۷	النّور	۴۲	الحدید	۲
المائدہ	۱۸	الفرقان	۲	الحدید	۵
المائدہ	۴۰	الفرقان	۲۶	الحشر	۲۳
المائدہ	۱۲۰	فاطر	۱۳	الجمعہ	۱
الانعام	۷۵	یٰسٓ	۸۳	التغابن	۱
الاعراف	۱۵۸	الزّمر	۶	الملک	۱
الاعراف	۱۸۵	الزّمر	۴۴	البروج	۹
التوبہ	۱۱۶	حٰمٓ المؤمن	۱۶	الناس	۲
یونس	۳۱	حٰمٓ الشوریٰ	۴۹		

اِن آیات میں سے چند آیات بطورِ نمونہ پیش کی جاتی ہیں :

۱- اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۝ (البقرہ۔۱۰۷)

(کیا تو نہیں جانتا کہ اللہ ہی کے پاس ہے اختیار آسمانوں کا اور زمین کا، اور نہیں ہے تمہارے لئے اُس کے سوا کوئی خبر گیری کرنے والا اور نہ کوئی مددگار)

۲۔ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ o

(آل عمران ۱۸۹)

(اور اللہ ہی کے پاس ہے اختیار آسمانوں کا اور زمین کا اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے)

۳۔ اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ط

(التوبہ ۱۱۶)

(بے شک اللہ ہی کے پاس ہے اختیار آسمانوں کا اور زمین کا۔ وہی زندگی دیتا ہے اور موت دیتا ہے)

۴۔ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ o (المؤمنون ۱۱۶)

(پس نہایت ہی بلند ہے شان اللہ کی جو حقیقی بادشاہ ہے۔ نہیں ہے کوئی خدا اس کے سوا، جو مالک ہے عرش کریم کا)

۵۔ هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ط سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ o (الحشر ۲۳)

(وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے، جو بادشاہ ہے، نہایت پاک ہے، سراسر سلامتی ہے، امن دینے والا ہے، نگہبان ہے، غالب ہے، زبردست ہے، عظمت والا ہے، پاک ہے اللہ اُس شرک سے جو لوگ کر رہے ہیں)

۶۔ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِى الْمُلْكِ (الفرقان)

(اور نہیں ہے اُس کا کوئی شریک، بادشاہی اور اختیار میں)

۷۔ بيده ملكوت كل شيئ (يٰس ۸۳)

(اُسی کے ہاتھ میں ہے اختیار اور بادشاہی ہر چیز کی)

۸۔ اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذِنِ الْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا ۝ (الفرقان۔۲۶)

(حقیقی اختیار اور بادشاہی اُس روز رحمان ہی کی ہوگی اور وہ کافروں کے لئے بڑا سخت دن ہوگا)

اِن آیات میں حصر و اختصاص کے الفاظ کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ غیبی طاقت اور حقیقی اختیارات اللہ ہی کے پاس ہیں۔ نفع و نقصان پہنچانے میں، کارسازی و حاجت روائی میں، اور کائنات میں حاکمانہ تصرف کرنے میں اُس کا کوئی بھی شریک و حصہ دار نہیں ہے۔ "مالک، مُلک اور "مختارِ کُل" صرف اللہ ربّ العالمین کی ذات ہے۔

فرشتوں اور جن و انس کے اختیارات و تصرفات محدود ہیں۔ عطائی ہیں اور اسباب کے مرہونِ منت ہیں، البتہ اللہ تعالیٰ جب چاہے کسی نبی اور ولی کے ہاتھ سے ایسا کام کرا لیتا ہے اور وہ چیزیں ظاہر کر دیتا ہے جو مافوق الاسباب اور ماوراءِ طبیعت ہوں۔ اگر نبی سے ظاہر ہوئی ہوں تو یہ معجزہ ہے اور اگر ولی سے ظاہر ہوں تو کرامت۔

اللہ تعالیٰ کے مالک الملک ہونے کا ذکر احادیث رسولؐ میں

اِس موضوع پہ احادیثِ رسولؐ اور آثارِ صحابہؓ کا کافی ذخیرہ موجود ہے، ان میں سے بطورِ نمونہ چند احادیث نقل کی جاتی ہیں جن میں صراحت و وضاحت کے ساتھ یہ حقیقت بیان ہوئی ہے کہ حقیقی بادشاہ، مختارِ کُل اور متصرّف مافوق الاسباب، صرف اللہ کی ذات ہے اور اِن تصرفات و اختیارات میں کوئی بھی اُس کا شریک نہیں ہے۔

۱۔ عن عبد اللہ بن عمرؓ ان تلبیۃ رسول اللہ ﷺ لبّیك۔ لبّیك۔ لا شریك لك لبیك۔ ان الحمد و النعمۃ لك۔ والملك لا شریك لك۔[1]

---

[1] بخاری ومسلم۔ کتاب الحج، باب التلبیۃ۔

(ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسولؐ اللہ کا تلبیّہ یہ تھا۔ ہر دم فرمانبردار ہوں اے میرے خدا۔ ہر دم فرمانبردار ہوں اے میرے خدا۔ تیرا کوئی شریک نہیں ہے۔ ہر دم فرمانبردار ہوں۔ بے شک تمام تعریفیں اور نعمتیں تیرے لئے ہیں اور اختیار و بادشاہی بھی تیری ہے اور اس میں تیرا کوئی شریک نہیں ہے)

۲۔ عن ابی ھریرۃؓ قال من قال لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہٗ لا شریک لہ لہ الملک ولہ الحمد وھو علی کل شیءٍ قدیر ماٗۃ مرۃ کانت لہ عدل عشر رکاب وکُتبت لہ ماٗۃ حسنۃ و محیت عنہ ماٗۃ سیئۃ[1]

(رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ جس شخص نے سَو مرتبہ کہا کہ نہیں ہے اللہ کے سوا دوسرا کوئی عبادت کے لائق، وہ ایک ہے، اُس کا کوئی شریک نہیں ہے، اُسی کی بادشاہی ہے اور اُسی کے لئے ہیں سب تعریفیں اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے، تو اس کو دس غلام آزاد کرنے کا اجر ملے گا اور اس کے اعمال نامے میں سَو نیکیاں لکھی جائیں گی اور اُس کے سَو گناہ مٹا دیے جائیں گے)

۳۔ عن عبد اللّٰہ بن مسعودؓ قال کان رسولؐ اللّٰہ اذا امسیٰ قال امسینا وامسی الملک للّٰہ والحمد للّٰہ لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ الحدیث وفی روایۃ اذا اصبح قال ذٰلک ایضاً اصبحنا واصبح الملک للّٰہ[2]

(رسولؐ اللہ شام ہو جانے پر فرمایا کرتے تھے "ہم پر شام آئی اور اس شام کے وقت بھی بادشاہی اور اختیار اللہ ہی کے لئے ہے اور شکر ہے

---

[1] مسلم و بخاری۔ کتاب الدعوات۔

[2] مسلم و ترمذی۔ کتاب الدعوات۔

(کہ دن خیریت سے گزر گیا) اللہ کے سوا کوئی دوسرا خدا نہیں ہے) دوسری روایت میں آیا ہے کہ صبح کے وقت بھی فرماتے تھے ہم پر صبح آئی اور اِس صبح کے وقت بھی بادشاہی اللہ ہی کی ہے)

۴ تا ۸۔ حضرت عمرؓ، حضرت ابوذرؓ، حضرت عبادہ بن صامتؓ، حضرت ابوایوبؓ اور عمرو ابن شعیبؓ عن ابیہ عن جدّہٖ کی علیحدہ علیحدہ روایتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں :

لہ الملك ولہ الحمدُ (خدا ہی کی بادشاہی ہے اور اسی کے لئے سب تعریفیں[1])

۹۔ حضرت علیؓ کی ایک روایت میں تکبیرِ اُولیٰ کے بعد والی ایک دُعا میں رسولؐ اللہ کے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں :

اللّٰھم انت الملك لا الٰہ الا انت ربّی وانا عبدك[2]

(اے میرے اللہ! تو ہی بادشاہ ہے، تیرے سوا دوسرا کوئی خدا نہیں ہے، تو ہی میرا رب ہے اور میں تیرا بندہ ہوں)

۱۰۔ قیامت کے روز اللہ فرمائے گا : انا الملِكُ این ملوك الارض[3]؟ (میں ہی بادشاہ ہوں، کہاں ہیں دنیا کے بادشاہ !)

مسلم شریف کی روایت میں الفاظ یہ ہیں : این الملك این الجبّارون ؟ این المتکبرون ؟ (میں ہی بادشاہ ہوں، کہاں ہیں جابر حکمران ؟ کہاں ہیں اپنے آپ کو بڑا سمجھنے والے ؟)

۱۱۔ مسلم شریف میں ایک طویل حدیثِ قدسی نقل ہوئی ہے ۔ اُس کے کچھ فقرے یہ ہیں :

---

[1] ترمذی شریف ۔ کتاب الدعوات ۔

[2] ایضاً

[3] بخاری شریف ۔ کتاب التفسیر، سورۃ الزمر و کتاب التوحید ۔

یاعبادی لوان اولکم وآخرکم وانسکم وجنّکم کانوا علیٰ اتقیٰ قلب رجل واحد منکم مازاد فی مُلکی شیئاً۔ یاعبادی لوان اوّلکم وآخرکم وانسکم وجنکم کانوا علیٰ افجر قلب رجل واحدٍ منکم مانقص من مُلکی شیئاً[1]

(اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اے میرے بندو! اگر تم میں سے اگلے پچھلے انسان اور جن، سب کے سب اُس شخص کی طرح فرمانبردار بن جائیں جس کے دل میں میرا خوف سب سے زیادہ ہے، تو میری بادشاہی میں ذرّہ بھر اضافہ نہیں کرسکو گے۔ اے میرے بندو! اگر تم میں سے اگلے پچھلے انسان اور جن، سب کے سب اس شخص کی طرح نافرمان بن جائیں جس کے دل میں سب سے زیادہ نافرمانی اور سرکشی ہو، تو میری بادشاہی میں ذرا بھر کمی نہیں کرسکو گے)

۱۲۔ عن الزبیرؓ بن العوام قال النبیؐ مامن صباح یصبحُ العبد الا منادیاً ینادی سبّحوا الملک القدوس[2]

(ہر صبح کو جب بندہ اٹھتا ہے تو ایک اعلان کرنے والا اعلان کرتا ہے: اے لوگو! اس بادشاہِ حقیقی کی پاکی بیان کرو جو ہر عیب سے نہایت ہی پاک ہے)

اِن احادیث اور اس مضمون کی دیگر بیسیوں روایات کا مفہوم یہی ہے کہ کائنات کا بادشاہِ حقیقی اور مختارِ کُل صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ نظامِ شمسی اُسی کے قبضۂ قدرت میں ہے، اور زمین اور اِس کی ہر چیز بھی اُسی کے اختیار میں ہے۔ وہی کارساز

---

[1] مسلم شریف۔ کتاب الظلم، باب فی تحریم الظلم۔

[2] ترمذی شریف۔ ابواب الدعوات۔

ہے۔ حاجت روا ہے، فریادرس ہے اور وہی قانون دینے والا ہے۔ انسان کو اُس نے اسبابِ طبیعیّہ کے تحت کچھ اختیارات، تو دیے ہیں، لیکن غیبی قوّت اور کُلّی طور پر مختارِ کُلّ ہونے میں اُس نے کسی کو اپنا شریک نہیں بنایا۔ لَا یُشْرِكُ فِی حُكْمِهٖٓ اَحَدًا۔

مخلوق کی بیچارگی :

مذکورہ بالا آیات و احادیث سے مثبت طور پہ اللہ کی بادشاہی اور کارسازی کا ثبوت پیش کیا گیا ہے، لیکن قرآن اور احادیث میں صرف ایجابی اور مثبت پہلو پہ ہی اکتفا نہیں کیا گیا، بلکہ پوری صراحت اور تاکید کے ساتھ اللہ کی ذات کے سوا ہر مخلوق سے حقیقی بادشاہت اور کارسازی کی نفی کی گئی ہے۔

مشرکینِ مکّہ خدا کے وجود اور اُس کے مختارِ کُل ہونے کو مانتے تھے، مگر اس کے ساتھ دوسروں کو بھی مختارِ کُل اور متصرّف مافوق الاسباب، یعنی غیبی طاقت کا حامل سمجھتے تھے اور اُن کے عقیدے کا یہی کھوٹ ان کے مشرک ہونے کا ثبوت تھا۔ کیونکہ جب تک غیراللہ سے خدائی صفات کی نفی نہ کی جائے اور غیراللہ کے مختارِ کُل ہونے کی تردید نہ کی جائے، اُس وقت تک صرف مثبت طور پہ خدا کی الوہیّت کا اثبات توحید کی تکمیل کے لئے کافی نہیں ہے۔ توحید صرف اثبات کا نام نہیں ہے، بلکہ نفی اور اثبات کے مجموعے کا نام ہے۔

اِس سلسلے میں بھی بطور نمونہ چند آیات ملاحظہ فرمائیے :

خاتم النبیین رحمۃ للعالمین سید المرسلین شفیع المذنبین محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلّم کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ علی الاعلان کہدو میں مختارِ کُل نہیں ہوں :

۱۔ قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِیْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ

(اعراف - ۱۸۸)

(اے محمدؐ! کہدو! کہ میں تو اپنی ذات کے لئے بھی کسی نفع و نقصان کا اختیار نہیں رکھتا، مگر اللہ جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے)

۲۔ قُلْ لَآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰهُ ط
(یونس۔ ۴۹)

(اے محمدؐ! کہدو! کہ میں تو اپنی ذات کے لئے بھی کسی نقصان اور نفع کا اختیار نہیں رکھتا، مگر اللہ جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے)

۳۔ قُلْ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا (الجن۔ ۲۱)

(اے محمدؐ، کہدو! کہ میں تم لوگوں کے لئے نہ کسی نقصان کا اختیار رکھتا ہوں اور نہ کسی بھلائی کا)

۴۔ وَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا ط (المائدہ۔ ۴۱)

(اور جسے اللہ نے فتنے میں ڈالنے کا ارادہ کر لیا ہو، تو اے محمدؐ، تم اس کو اللہ کی گرفت سے بچانے کے لئے کچھ نہیں کر سکتے)

ان آیات میں بڑی وضاحت اور عموم کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مِلک کی نفی کی گئی ہے۔ نَفْعًا، ضَرًّا، رَشَدًا اور شَيْئًا سب نکرہ کے صیغے ہیں جن پر حرفِ نفی داخل ہوا ہے اور عربی زبان کے قواعد سے معمولی سی واقفیت رکھنے والے طالبِ علم کو بھی معلوم ہے کہ نکرہ سیاقِ نفی میں عموم وشمول کے لئے آتا ہے" یعنی میرے پاس اختیاراتِ مطلقہ میں سے کچھ بھی نہیں ہے۔ اسباب کے دائرے میں رہتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانیت کو بے حد نفع پہنچایا ہے اور آپؐ بلا شبہ محسنِ انسانیت ہیں۔ آپؐ کی دعوت وتبلیغ اور سیرت وخلقِ عظیم سے لوگوں کو ایمان و ہدایت کی دولت ملی ہے۔ اسی طرح اللہ نے آپؐ کے ہاتھ پر معجزات اور خوارقِ عادات بھی ظاہر فرمائے ہیں، لیکن غیبی طاقت اور کُلّی اختیارات آپؐ کو بھی اللہ نے نہیں دیے۔ مافوق الاسباب اختیارات وتصرفات کا مالک و مختارِ کُل وہی ہو سکتا ہے جس کے پاس کُنْ فَيَكُوْنُ کی قوت ہو کہ جب ارادہ کرے، جس چیز کا ارادہ کرے فوراً ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ صفت عقلاً وشرعاً ذاتِ باری تعالیٰ کے علاوہ کسی مخلوق کے لئے ممکن ہی نہیں ہے۔ اگر اللہ کا

شریک ممتنع عقلی ہے جس کے ساتھ قدرتِ الٰہیہ کا تعلق بھی نہیں ہو سکتا، تو مخلوق میں سے کسی کا تکوینی امور کا مالک کُنْ فَیَکُوْنِی طاقت کا حامل اور مختارِ کل ہونا بھی ممتنع عقلی ہے اور ممتنعاتِ عقلیہ کا صدور اللہ تعالیٰ سے محال ہے۔ اس لئے یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ اللہ تعالیٰ نے کسی مخلوق کو کُنْ فَیَکُوْنی طاقت اور کلی اختیارات دیدیے ہیں۔

۵۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے انکارِ جہاد کے موقع پر فرمایا تھا:

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِیْ وَ اَخِیْ فَافْرُقْ بَیْنَنَا وَبَیْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ ۝ (المائدہ ۵۔۲۵)

(کہا موسیٰؑ نے اے میرے رب! مجھے اختیار نہیں ہے، مگر اپنے نفس پر اور اپنے بھائی پر، پس تو ہمارے اور اس نافرمان قوم کے درمیان جدائی فرمادے)

۶۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے والد کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

وَمَآ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ (الممتحنہ ۔۴)

(اور اللہ سے آپ کیلئے کچھ حاصل کرنا میرے اختیار میں نہیں ہے)

۷۔ مشرکینِ عرب اور اہلِ کتاب کے عقیدۂ مشرکانہ کے ردّ میں ارشادِ خداوندی ہے:

قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ؕ وَاللّٰهُ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۝ (المائدہ ۵۔۷۶)

(ان سے کہدو کیا تم اللہ کے سوا اُن کی پرستش کرتے ہو جو تمہارے لئے نہ نفع کا اختیار رکھتے ہیں نہ نقصان کا؟ حالانکہ سب کی سننے والا اور سب کچھ جاننے والا اللہ ہی ہے)

اس آیت میں پہلے حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؓ سے الوہیت کی نفی کی گئی ہے اور اس کے بعد والی آیات میں اہلِ کتاب کو غلو فی الدین سے منع کیا گیا ہے۔ اس سیاق وسباق میں مَا لَا یَمْلِكُ سے حضرت عیسیٰؑ کی جانب اشارہ ہے۔ مقصد یہ ہے کہ عیسیٰؑ اور اُن کی

والدہ دونوں اگرچہ خدا کے مقدّس اور برگزیدہ بندے ہیں؛ لیکن نفع و ضرر کے کلی اختیارات اُن کے پاس بھی نہیں ہیں۔ تم اُن سے پرستش اور عبادت کے طریقے تو حاصل کرو، لیکن اُن کی پرستش نہ کرو۔ پرستش کا حقدار وہی ہوتا ہے جو غیبی اور تکوینی اختیارات کا مالک ہو اور وہ صرف اللہ ہی ہے۔ مفسّرین نے بھی اس آیت کا یہی مفہوم بیان فرمایا ہے جو سیاقِ کلام سے معلوم ہوتا ہے۔

امام المفسّرین محمد بن جریر طبریؒ (المتوفیٰ سنہ ۳۱۰ھ) فرماتے ہیں:

یخبرھم تعالیٰ ذکرہ ان المسیح الذی زعم من زعم من النصاریٰ انہ الٰہ والذی زعم من زعم منھم انہ ابن اللّٰہ لا یملک لھم ضرا یدفعہ عنھم ان احلہ اللّٰہ بھم ولا نفعا یجلبہ الیھم ان لم یقضہ اللّٰہ لھم۔ یقول تعالیٰ ذکرہ فکیف یکون ربّاً والٰھاً من کانت ھذہ صفتہ۔ بل الرب المعبود الذی بیدہ کل شیئ والقادر علی کل شیئ فایاہ فاعبدوا واخلصوا لہ العبادۃ دون غیرہ من العَجَزَۃ الذین لا ینفعونکم ولا یضرّون[1]

(اس آیت میں اللہ تعالیٰ اُن کو سمجھاتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ جسے بعض مسیحی خدا کہتے ہیں اور بعض خدا کا بیٹا کہتے ہیں وہ تو اُن سے نہ کسی مصیبت کو ہٹانے کا اختیار رکھتے ہیں اگر اللہ اسے ان پر نازل کر دے اور نہ اُن کو کوئی نفع پہنچا سکتے ہیں (اگر اللہ نے اس کا فیصلہ نہ کیا ہو تو جس کی یہ حالت ہو وہ مالک و مختار اور خدا کیسے بن سکتا ہے؟ حقیقت میں تمہارا خدا اور عبادت کا مستحق وہی ہے جس کے ہاتھ میں ہے ہر چیز کا اختیار اور جو ہر

---

[1] تفسیر ابن جریر۔ ج ۶، ص ۳۱۶، المائدہ، آیت ۷۶۔

چیز پر قدرت رکھتا ہے لہٰذا اُسی کی پرستش کرو اور اپنی پرستش کو اُسی کے لئے مخصوص کردو اور اُن کمزور و بے اختیار لوگوں کی پرستش نہ کرو جو نہ تم کو نفع پہنچا سکتے ہیں نہ ضرر پہنچا سکتے ہیں)

امام فخر الدین رازیؒ (متوفی ۶۰۶ھ) اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں :

ان الیھود کانوا یُعادونہ ویَقْصِدونہ بالسُّوء فما قدر علی الاضرار بھم وکان النصاری یحبونہ فما قدر علی ایصال نفع من منافع الدنیا والعاجز علی الاضرار و النفع کیف یُعقل ان یکون الٰھًا ۔

الثانی ان مذھب النصاری ان الیھود صلبوہ مزّقوا اضلاعہ ولما عطش وطلب الماء صبّوا الخل فی مَنْخِرَیہ ومن کان فی الضعف ھٰکذا کیف یعقل ان یکون الٰھًا[1]

(یہود حضرت عیسیٰؑ سے دشمنی کرتے تھے اور اُن کو تکلیف پہنچانے کے منصوبے باندھتے رہتے تھے، لیکن وہ (مسیحؑ) اُن کو ضرر پہنچانے کی قدرت نہیں رکھتے تھے۔ اُن کے انصار اُن سے محبت رکھتے تھے، لیکن وہ اُنہیں دنیا کے فوائد میں سے کوئی فائدہ پہنچانے پر قدرت نہیں رکھتے تھے، تو جس کے عاجز و کمزور ہونے کی حالت یہ ہو، کیسے عقل میں آسکتا ہے کہ وہ خدا اور کارساز ہو۔

عیسائیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ یہودیوں نے حضرت عیسیٰؑ کو صلیب پر لٹکا دیا تھا۔ اس کی پسلیاں توڑ دی تھیں اور جب اُس نے پیاس سے مجبور ہو کر پانی مانگا تھا، تو اُنہوں نے اس کی ناک میں سرکہ ڈال دیا تھا۔ غور کرنے کا مقام ہے جس کی کمزوری اور بے بسی کا یہ حال ہو، عقل اسے خدا کیسے تسلیم

---

[1] تفسیر کبیر۔ ج ۱۲، ص ۶۲۔

کر سکتی ہے !)

ابنِ جوزیؒ (متوفی ۵۹۶ھ) امام قرطبیؒ (متوفی ۶۷۱ھ) اور علامہ آلوسیؒ (متوفی ۱۲۷۰ھ) نے بھی لکھا ہے کہ اس آیت میں حضرت عیسٰیؑ کی جانب اشارہ ہے۔[1]

۸۔ قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا ۝ أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا ۝ (بنی اسرائیل۔ ۵۶۔ ۵۷، پ ۱۵)

(کہدو ! پکارو جن کو تم کارساز سمجھتے ہو، سوائے اُس (خدا) کے۔ یہ تو اختیار نہیں رکھتے تم سے مصیبت ہٹانے کا اور نہ بدلنے کا۔ وہ لوگ جن کو یہ پکارتے ہیں وہ تو خود ڈھونڈھتے ہیں اپنے رب تک پہنچنے کا وسیلہ اور ذریعہ کہ کونسا بندہ اُس کے قریب تر ہے، اور امیدر کھتے ہیں اُس کی رحمت کی اور ڈرتے ہیں اُس کے عذاب سے۔ بے شک تیرے رب کا عذاب ڈرنے کی چیز ہے)

ان آیات کے الفاظ اور سیاقِ کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں جن فریادرسوں کا ذکر کیا جارہا ہے اُن سے مراد پتھر کے بت نہیں ہیں، بلکہ برگزیدہ انسان، جن اور فرشتے مراد ہیں۔ بُت تو اُنہی برگزیدہ انسانوں یا فرشتوں کے نام پہ بنائے گئے تھے اور اُن کی پرستش بطور قبلۂ توجّہ کی جاتی تھی، گویا بُت پرستی حقیقت میں اولیاء پرستی تھی۔ ان آیات کی ترکیب میں دو قرائن ایسے ہیں جن سے اس مفہوم کے لیے دلیل مہیا ہوتی ہے۔

ایک یہ کہ عربی زبان میں ذی عقل مخلوق کے لئے بالعموم الّذِینَ کا صیغہ آتا ہے اور جمع کے صیغے میں ذی عقل کے لئے و۔ن لگاتے ہیں، تو اَلَّذِین ۔ فلا یملکُون

---

[1] زاد المسیر لابن جوزیؒ۔ ج ۲، ص ۴۴۔ تفسیر قرطبی۔ ج ۶، ص ۲۵۱۔ روح المعانی۔ از آلوسیؒ۔ ج ۶، ص ۲۰۹۔

یبتغون ۔ یرجون اور یخافون کے الفاظ دلالت کرتے ہیں کہ یہاں بے جان اور بے عقل پتھر اور بُت مراد نہیں ہیں، بلکہ ذی عقل انسان، جن اور فرشتے مراد ہیں ۔

دوسرا یہ کہ وسیلۂ قرب تلاش کرنا، رحمت کی امید رکھنا اور عذاب سے ڈرنا جمادات اور بُتوں کی شان نہیں ہے، بلکہ یہ تو انسانوں، جنوں اور فرشتوں ہی کی صفات ہوسکتی ہیں۔ مُفسّرین نے بھی یہی تفسیر کی ہے اور امام بخاریؒ (م ۲۵۶ھ) اور امام مسلمؒ (م ۲۶۱ھ) دونوں نے اس آیت کی شانِ نزول میں حضرت ابنِ مسعودؓ کا یہ قول نقل فرمایا ہے :

کان ناس من الانس یعبدون ناسًا من الجن فاسلم الجنّ وتمسّك هٰؤلاء بدينهم [1]

(بعض انسان بعض جنّوں کی پوجا کرتے تھے، بعد میں وہ جن تو اسلام لے آئے، مگر اُن کے یہ پرستار حسبِ سابق اپنے دین پر جمے رہے)

امام المفسّرین ابنِ جریر طبریؒ نے حضرت ابنِ مسعودؓ کا درجِ بالا قول چھ سندوں کے ساتھ نقل کیا ہے اور پھر حضرت ابنِ عباسؓ کا ایک قول تین سندوں کے ساتھ نقل کرکے فرمایا ہے کہ اس آیت میں اشارہ ہے حضرت عیسیٰؑ، حضرت عزیزؑ اور فرشتوں کی جانب ۔

امام رازیؒ لکھتے ہیں :

وهذه الاشياء التى يعبدونها وهى الملٰئكة والجن والمسيح وعزير لا يقدرون علىٰ كشف الضرّ ولا علىٰ تحصيل النفع فوجب القطع بانها ليست الهة [2]

(اور یہ چیزیں جن کی یہ لوگ پرستش کرتے ہیں، فرشتے، جن، مسیحؑ اور عزیرؑ ہیں اور یہ سب نہ تو تکلیف ہٹانے کی طاقت رکھتے ہیں اور نہ نفع پہنچانے کی (یعنی غیبی قدرت) اس سے قطعی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ یہ حضرات کارسازِ

---

[1] تفسیر ابنِ جریر ۔ ج ۱۵، ص ۱۰۵ ۔ ۱۰۶ ۔

[2] تفسیر کبیر ۔ ج ۲۰، ص ۲۳۱ ۔

اور مختارِ کُل نہیں ہیں)

قرطبیؒ، ابن کثیرؒ، قاضی ثناء اللہؒ پانی پتی اور علامہ آلوسیؒ سب نے لکھا ہے کہ یہاں جن فرشتے اور انبیاء و اولیاء مراد ہیں اور اُن میں سے کوئی مختارِ کل نہیں ہے۔

۹۔ وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً لَّا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ وَلَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا۔

(الفرقان۔ ۳)

(اُنہوں نے اللہ کے سوا ایسے معبود بنا لئے ہیں جو کسی چیز کو پیدا نہیں کر سکتے، بلکہ خود پیدا کئے گئے ہیں۔ جو اپنی ذات کے لئے بھی کسی نقصان اور نفع کا اختیار نہیں رکھتے، جو نہ موت اور زندگی کا اختیار رکھتے ہیں اور نہ مرنے کے بعد دوبارہ اٹھانے کا اختیار رکھتے ہیں)

اِس آیت میں بھی ذوی العقول کی ضمیریں استعمال ہوئی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اصل مراد اَصنام نہیں ہیں، بلکہ وہ بزرگ ہستیاں مراد ہیں جن کے نام پر بت بنائے گئے تھے۔

قاضی ثناء اللہؒ پانی پتی (متوفی ۱۲۲۵ھ) فرماتے ہیں :

وھذا حال الاصنام بل حال کل شیئ سوی اللہ فان عیسیٰؑ وعزیرؑ والملٰئکۃ مع علو مرتبتھم لا یملکون لانفسھم نفعا ولا ضرا[1]

(بتوں کا یہی حال ہے، بلکہ ہر چیز کی یہی حالت ہے، اس لئے کہ عیسیٰؑ، عُزیرؑ اور فرشتے باوجود اونچا اور بلند مرتبہ رکھنے کے اپنی ذات کے لئے بھی نفع و نقصان کا اختیار نہیں رکھتے) (یعنی غیبی اور مافوق الاسباب طاقت)

۱۰۔ اِنَّمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا وَّ تَخْلُقُوْنَ

---

[1] تفسیر مظہری۔ ج ۷، صـ۱۱۔

اِفْكًا ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ
لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْهُ
وَاشْكُرُوْا لَهٗ ؕ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ (العنکبوت ۱۷)

(تم اللہ کے سوا جن کو پوجتے ہو وہ تو محض بُت ہیں۔ اور تم ایک جھوٹ گھڑ رہے ہو۔ درحقیقت اللہ کے سوا جن کو تم پوجتے ہو وہ تم کو رزق دینے کا اختیار بھی نہیں رکھتے۔ اللہ ہی سے رزق مانگو اور اُسی کی عبادت کرو اور اُسی کا شکر ادا کرو۔ اُسی کے پاس تم پلٹائے جانے والے ہو)

یہ حضرت ابراہیمؑ کی تقریر کا ایک حصہ ہے۔ اُس زمانے میں ستارہ پرستی کا زور تھا۔ تاریخ میں اس کو صابیت کہا جاتا ہے۔ ان صابئین کا عقیدہ یہ تھا کہ سورج، چاند ستارے اور دیگر اجرامِ فلکی اہلِ دنیا کے نفع و نقصان، خیر و شر میں اور رزق کی فراخی میں تاثیر رکھتے ہیں۔ ان اجرامِ فلکیہ کی فرضی تصویریں اور خیالی مجسّمے اُنہوں نے بنا رکھے تھے ظاہر میں ان بتوں کی پرستش کرتے تھے لیکن تصوّر سورج، چاند اور ستاروں کی پرستش کا تھا۔ اسی مشرکانہ خیال کی تردید حضرت ابراہیمؑ نے فرمائی تھی۔ ان اجرام کو چونکہ ذی ادراک چیزیں سمجھا جاتا تھا، اس لئے اس آیت میں بھی ذو العقول کے ضمائر آئے ہیں۔

۱۱۔ قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ لَا يَمْلِكُوْنَ
مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ
فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ ۝
(السبأ ۔ ۲۲)

(اُن سے کہو کہ پکارو اُن کو جنہیں تم اللہ کے سوا خدا سمجھ رہے ہو۔ وہ نہ تو آسمان میں ذرّہ برابر اختیار رکھتے ہیں اور نہ زمین میں۔ اور وہ آسمان و زمین کے اختیار میں حصہ دار بھی نہیں ہیں۔ اور اُن میں سے کوئی اللہ کا مددگار بھی نہیں ہے)

۱۲۔ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَ

سَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِي لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ط ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ط وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ ۝ اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ ۝ (فاطر-۱۳-۱۴)

(وہ دن کے اندر رات کو اور رات کے اندر دن کو پروتا ہوا لے آتا ہے۔ اُسی نے سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے۔ یہ سب وقتِ مقررہ تک چلے جا رہے ہیں۔ یہی اللہ تمہارا رب ہے۔ بادشاہی اور اختیار اُسی کا ہے۔ جن کو تم پکارتے ہو وہ تو ذرہ برابر چیز کا بھی اختیار نہیں رکھتے۔ اُن کو پکارو تو وہ تمہاری آوازیں سن نہیں سکتے اور اگر سن بھی لیں تو جواب نہیں دے سکتے اور قیامت کے روز وہ تمہارے اس شرک کا انکار کر دیں گے۔ حقیقتِ حال کی ایسی خبر تم کو ایک خبردار کے سوا کوئی نہیں دے سکتا)

"قیامت کے روز وہ تمہارے اس شرک سے انکار کریں گے" یہ الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ اِس آیت میں بُت مراد نہیں ہیں، بلکہ انبیاء، اولیا، جن اور فرشتے مراد ہیں۔ یہ سب قیامت کے روز کہہ دیں گے کہ ہم نے کبھی یہ نہیں کہا تھا کہ تم ہماری عبادت کرو، ہمیں مدد کے لئے پکارو اور ہم کو خدا کا شریک ٹھہراؤ۔ ہمیں تو خبر تک نہیں تھی کہ یہ لوگ ہمیں پکار رہے ہیں، ان کی کوئی آواز ہم تک نہیں پہنچتی تھی۔

امام قرطبیؒ اور امام ابنِ کثیرؒ نے لکھا ہے کہ "اس آیت میں اشارہ فرشتوں، جنوں اور انبیاءؑ کی جانب ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالےٰ اُن کے بتوں کو قیامت کے روز زندہ کر کے اُن کی زبان سے شرک کا انکار کروادے[1]"

---

[1] تفسیر قُرطبی۔ ج ۱۴، ص ۳۳۶۔ و تفسیر ابنِ کثیر۔ ج ۵، ص ۵۷۶، سورۂ فاطر۔

اِس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ مختارِ کل اور کارساز وہی ہو سکتا ہے جو درج ذیل صفات سے متّصف ہو:

رات دن کی کمی بیشی اور نظامِ شمسی اس کے قبضے میں ہو۔

جو ہر وقت اور ہر حالت میں ہر قسم کی پکار سن سکتا ہو۔

جو چیز اس سے مانگی جائے اُسے دے بھی سکتا ہو اور روک بھی سکتا ہو۔

ظاہر ہے کہ یہ اختیارات خدا کے سوا کسی کے پاس نہیں ہیں اور جب صورتِ حال یہ ہے تو اُس کے سوا کوئی اور اِس کائنات کا مالک، مختارِ کل اور متصرّف بھی نہیں ہے۔

گیارہواں باب

بائبل میں اللہ کی وحدانیت کا ذکر

حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی دعوت توحید ہی کی دعوت تھی۔ حضرت موسیٰؑ کو کوہِ طور پہ آغازِ وحی ہی میں بتا دیا گیا تھا کہ رب، یعنی مالک، پروردگار، مختارِ کل، کارساز و حاجت رواؑ اور حاکم صرف اللہ کی ذات ہے :

فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ يٰمُوْسٰى ۝ اِنِّيْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۚ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۝ وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى ۝ اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ ۙ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ۝

(طٰہٰ - ۱۱ تا ۱۴)

(پس جب پہنچا آگ کے پاس آواز آئی اے موسیٰؑ! میں ہوں تیرا رب، پس اتار دے اپنی جوتیاں، تو ہے پاک میدان طویٰ میں ۔ اور میں نے تجھے پسند کر لیا ہے، پس سن لے جو حکم دیا جا رہا ہے، یعنی یہ کہ بے شک میں ہی اللہ ہوں، نہیں ہے کوئی عبادت کے لائق، مگر میں ہی ہوں، پس میری ہی عبادت کر، اور نماز قائم کر میری یاد کے لئے)

فرعون نے جب سوال کیا کہ اے موسیٰ تم دونوں کا رب کون ہے؟ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا "ہمارا رب وہ ہے جس نے دی ہے ہر چیز کو اُس کی ساخت پھر راہ دکھائی" (طٰہٰ - ۴۹ - ۵۰ پ ۱۶)

یہودیوں نے تورات کی تعلیمات اور حضرتِ موسیٰؑ کی دعوتِ توحید کو بدل کر شرک کی روش اختیار کر لی ۔ اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کی دعوت بھی توحید تھی :

مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِیْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبَّكُمْ (المائدہ ۔ ۱۱۷)

(میں نے اُن سے نہ کہی تھی، مگر وہی بات جس کا تو نے مجھے حکم دیا تھا کہ اللہ ہی کی عبادت کرو جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے)

پولُس (سینٹ پال) نے اس تعلیم کو بدل کر ایک نیا "مسیحی دین" بنا دیا جو عیسائیت اور مسیحیت نہیں ہے، بلکہ حقیقی معنوں میں پولُسیّت ہے، تاہم تورات و انجیل میں تحریفات کے باوجود توحید کی آیتیں اِن کے اندر اب تک موجود ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے یہود و نصاریٰ کی اُن روایات کی تصدیق و تائید کی ہے اور نقل کرنے کی اجازت دی ہے جو قرآن و سنّت کے مطابق ہوں۔ اس لئے بطورِ اِستشہاد بائبل سے چند ایسی عبارات نقل کی جاتی ہیں جو صراحتاً دلالت کرتی ہیں کہ معبودِ برحق ایک ہے۔ وہی قدرتِ کاملہ کا مالک ہے مختارِ کل ہے۔

عقیدۂ تثلیث کے ابطال اور توحید کے اثبات کے لئے حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے اپنی کتاب "اظہار الحق" میں بائبل سے متعدد اقتباسات نقل کئے ہیں[1]۔

پاکستان بائبل سوسائٹی، انارکلی، لاہور کی طبع کردہ ۱۹۵۹ء کی بائبل سے چند اقتباسات ملاحظہ کیجئے:

۱۔ "سُن اے اسرائیل! خداوند ہمارا خدا ایک ہی خدا ہے، تو اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری طاقت سے خداوند اپنے خدا سے محبت رکھ۔"
(کتابِ استثناء۔ باب ۶۔ آیت ۴)

۲۔ "تاکہ تو جانے کہ خداوند ہی خدا ہے اور اُس کے سوا کوئی ہے ہی نہیں۔"
(استثناء باب ۴۔ آیت ۳۵)

۳۔ "پس آج کے دن تو جان لے اور اِس بات کو دل میں جمالے کہ اوپر آسمان

---

[1] اظہار الحق عربی۔ طبع قطر۔ باب رابع کی دوسری فصل۔

میں یا نیچے زمین پر خداوند ہی خدا ہے اور کوئی دوسرا نہیں"۔ استثناء، باب ۴۔ آیت ۳۹۔

کتاب خروج اور استثناء میں حضرت موسیٰؑ کی تقریر نقل ہوئی ہے اس کا اقتباس درج ذیل ہے:

۱۔ "تب اس نے (اللہ نے) کہا خداوند تیرا خدا جو تجھ کو ملکِ مصر یعنی غلامی کے گھر سے نکال لایا، میں ہوں۔ میرے آگے تو اور معبودوں کو نہ ماننا! تو اپنے لیے کوئی تراشی ہوئی مورت نہ بنانا نہ کسی کی صورت بنانا جو اوپر آسمان میں یا نیچے زمین پر یا نیچے زمین کے پانی میں ہے۔ تو ان کے آگے سجدہ نہ کرنا اور نہ اُن کی عبادت کرنا کیونکہ میں خداوند تیرا خدا غیور ہوں"۔

(خروج باب ۲۰۔ آیت ۲ تا ۱۵۔ استثناء باب ۵۔ آیت ۶ تا ۹)

۵۔ "میں ہی خداوند ہوں اور کوئی نہیں، میرے سوا کوئی خدا نہیں، میں نے تیری کمر باندھی اگرچہ تو نے مجھے نہ پہچانا، تاکہ مشرق سے مغرب تک لوگ جان لیں کہ میرے سوا کوئی نہیں، میں ہی خداوند ہوں، میرے سوا کوئی دوسرا نہیں، میں ہی روشنی کا مُوجد اور تاریکی کا خالق ہوں، میں ہی خداوند یہ سب کچھ کرنے والا ہوں"۔

(یسعیاہ۔ باب ۴۵۔ آیات۔ ۵۔ ۶)

۶۔ "پہلی باتوں کو جو قدیم سے ہیں یاد کرو کہ میں خدا ہوں اور کوئی دوسرا نہیں، میں خدا ہوں اور مجھ سا کوئی نہیں"۔ (یسعیاہ۔ باب ۴۶۔ آیت ۹)

۷۔ "لکھا ہے کہ تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اُسی کی عبادت کر"!

(انجیل متی۔ باب ۴۔ آیت ۱۰)

۸۔ "اور ہمیں آزمائش میں نہ لا، بلکہ برائی سے بچا، کیونکہ بادشاہی اور قدرت اور جلال ہمیشہ تیرے لئے ہی ہے"۔ (انجیل متی۔ باب ۶۔ آیت ۱۳)

۹۔ "اور اُن میں سے ایک عالمِ شرع نے آزمانے کے لئے اُس سے پوچھا۔ اے استاد، توریت میں کونسا حکم بڑا ہے؟ اُس نے (یعنی عیسیٰؑ نے) اُس سے کہا کہ خداوند اپنے خدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری عقل سے محبت رکھ۔ بڑا اور پہلا حکم یہی ہے۔ اور دوسرا اس کی مانند یہ ہے کہ اپنے پڑوسی سے اپنے برابر محبت رکھ۔ انہی دو حکموں پر تمام توریت اور انبیاءؑ

کے صحیفوں کا مدار ہے۔"

(انجیل متی۔ باب ۲۲۔ آیات ۳۵ تا ۴۰ و انجیل مرقس۔ باب ۱۲۔ ۲۸ تا ۳۴)

سب سے زیادہ وضاحت کے ساتھ توحید کا بیان انجیل برناباس میں ہے۔ برناباس حضرت عیسیٰؑ کے ایک شاگرد اور حواری تھے۔ اس نام کے معنے ہیں۔ نصیحت کا بیٹا۔ عیسائی پادریوں کا دعویٰ ہے کہ انجیلِ برناباس جعلی ہے۔ اصلی نہیں ہے، لیکن مولانا مودودی رح نے اور مولانا محمد تقی عثمانی نے ٹھوس تاریخی شواہد سے اس کا اصلی ہونا ثابت کیا ہے۔ اگرچہ تحریف سے خالی یہ بھی نہیں ہے[1]۔

انجیل برناباس کا اقتباس ملاحظہ کیجئے:

۱۰۔ "یسوعؑ عبادت سے فارغ ہو کر اپنے شاگردوں کے ساتھ پہاڑ سے اترا تو اُسے دس کوڑھی ملے جو دور سے چلا اُٹھے "اے داؤدؑ کے بیٹے ہم پر رحم کر۔" یسوعؑ نے اپنے پاس انہیں بلایا اور اُن سے کہا:"اے بھائیو۔ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟ وہ سب چلا اُٹھے۔ ہمیں صحت دے۔ یسوعؑ نے جواب دیا۔ آہ تم کیسے بدنصیب ہو، تم اپنی عقل اتنی کھو چکے ہو کہ یہ کہتے ہو کہ ہمیں صحت دے۔ دیکھتے نہیں کہ میں تمہاری طرح ایک انسان ہوں۔ اپنے خدا کو پکارو جس نے تمہیں پیدا کیا اور وہ قادرِ مطلق اور رحیم ہے، تمہیں شفا دے گا (انجیل برناباس۔ باب ۱۹)

یہ دس اقتباسات بطور نمونہ نقل کئے گئے ہیں ورنہ اس قسم کی بیسیوں آیات بائیبل کے عہد نامۂ قدیم و جدید کی کتب میں موجود ہیں جن میں توحید کا وہی مفہوم بیان ہوا ہے جو قرآن کریم اور احادیثِ رسولؐ میں بیان ہوا ہے۔ توحید کے اس مفہوم کے خلاف جو عبارتیں بائیبل کے قدیم و جدید صحیفوں میں موجود ہیں اُن میں سے بعض تو محرّف ہیں، لیکن بعض متشابہات میں سے ہیں اور چونکہ یہود و نصاریٰ کے دلوں میں کجی اور زیغ نے راہ پالی ہے اس لئے وہ بائیبل کی محکمات کو چھوڑ کر متشابہات سے اپنا مشرکانہ عقیدہ ثابت کرتے ہیں۔

رسولؐ اللہ اور نجران کے نصاریٰ کا مباحثہ

یمن میں نجران مسیحیوں کا بہت بڑا اور قدیم مرکز رہا ہے۔ سنہ ۹ھ میں اس مرکز مسیحیت

---

[1] تفہیم القرآن، سورۃ الصّف۔ از مولانا مودودی و عیسائیت کیا ہے؟ از مولانا تقی الدین عثمانی۔

سے ۶۰ افراد پہ مشتمل عیسائیوں کا ایک وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلّم سے مباحثہ کرنے کے لئے مدینہ منورہ آیا۔ اس وفد میں ان کے ۱۴ ممتاز مذہبی اور سیاسی لیڈر شریک تھے جن میں سے تین سب کے نمائندے اور تمام امور کے ذمہ دار تھے۔ (۱) العاقب عبد المسیح جو وفد کا امیر تھا۔ (۲) الأیہم جو سیاسی اور جنگی امور کا ذمہ دار تھا اور (۳) البو حارثہ ابن علقمہ جوان کا بشپ اور مذہبی پیشوا تھا۔

— رسول اللہ اور اُن کے درمیان جو مکالمہ یا مباحثہ و مناظرہ ہوا، نہایت سبق آموز ہے۔ ملاحظہ ہو:

نصاریٰ : عیسیٰؑ کا باپ کون تھا؟ اُنہوں نے اپنا یہ جھوٹا عقیدہ دہرایا کہ خدا ہی اُس کا باپ ہے۔

رسولؐ اللہ : کیا تم جانتے ہو کہ بیٹا باپ کے مشابہہ ہوتا ہے؟

نصاریٰ : ہاں یہ بات تو ہم کو معلوم ہے۔

رسولؐ اللہ : کیا تم جانتے ہو کہ ہمارا رب زندہ ہے جس پہ موت نہیں آسکتی اور عیسیٰؑ پہ تو موت آئے گی؟

نصاریٰ : ہاں یہ تو ہم کو معلوم ہے۔

رسولؐ اللہ : کیا تم جانتے ہو کہ ہمارا رب ہر چیز کا نگران اور محافظ ہے اور ہر ایک کو رزق دیتا ہے؟

نصاریٰ : ہاں یہ تو مسلّمہ حقیقت ہے۔

رسولؐ اللہ : تو کیا حضرت عیسیٰؑ کو یہ اختیارات حاصل تھے؟

نصاریٰ : نہیں :

رسولؐ اللہ : کیا تم جانتے ہو کہ اللہ سے زمین و آسمان کی کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے؟

نصاریٰ : ہاں یہ بات تو ہم مانتے ہیں۔

رسولؐ اللہ : کیا حضرت عیسیٰؑ زمین و آسمان کی ہر چیز کا علم رکھتے تھے؟

نصاریٰ : نہیں۔

رسولؐ اللہ : کیا تم جانتے ہو کہ عیسیٰؑ کی شکل و صورت اُس کی والدہ کے پیٹ میں

اللہ ہی نے بنائی تھی ؟

نصاریٰ : ہاں ۔

رسولؐ اللہ : کیا تم جانتے ہو کہ ہمارا رب نہ کھانا کھاتا ہے، نہ پیتا ہے اور نہ پیشاب کرتا ہے ؟

نصاریٰ : ہاں ۔

رسولؐ اللہ : کیا تم جانتے ہو کہ عیسیٰؑ کو ایک عورت نے دوسری عورتوں کی طرح اپنے پیٹ میں اٹھائے رکھا، پھر انہیں جنا جیسا کہ دوسری عورتیں بچہ جنتی ہیں ۔ پھر اُن کو دوسرے بچوں کی طرح غذا دی گئی ۔ وہ کھانا کھاتے تھے، پانی پیتے تھے اور پیشاب بھی کرتے تھے ؟

نصاریٰ : ہاں اس بات کو ہم بھی تسلیم کرتے ہیں ۔

رسولؐ اللہ : تو پھر عیسیٰؑ خدا کیسے بن گئے، جیسا کہ تمہارا خیال ہے ؟

حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اِن سوالات سے یہ لوگ سمجھ تو گئے کہ حضرت عیسیٰؑ خدا نہیں ہیں اور محمد رسولؐ اللہ سچے نبی ہیں، لیکن ضد و عناد اور نفس پرستی کی وجہ سے ایمان کی توفیق سے محروم رہے ۔

رسولؐ اللہ نے بحکمِ خداوندی ان کو مباہلے کی دعوت دی، لیکن وہ اس کے لئے بھی تیار نہ ہو سکے اور جزیہ دینے پر راضی ہو گئے ۔ رسولؐ اللہ نے ان پر جزیہ مقرر کر کے معاہدہ کر لیا اور نجران اسلامی حکومت کا ایک صوبہ بن گیا[1]

ابنِ ہشامؒ نے لکھا ہے کہ اس وفد کے مذہبی پیشوا ابوحارثہ نے راستے میں اپنے بھائی کُرز بن حارثہ کو ایک موقع پر کہہ دیا تھا کہ :

واللہ انہ للنبی الذی کنا ننتظرہ ۔

---

[1] تفسیر ابن جریرؒ بروایۃ ربیع بن انس البکری مرسلاً ج ۳، ص ۱۶۳، سورۂ آلِ عمران وتفسیر درمنثور سورۂ آلِ عمران ۔

(خدا کی قسم یہ محمدؐ تو وہی نبی ہے جس کا ہم انتظار کر رہے تھے)

کُرز نے کہا پھر ایمان لانے سے کیا چیز روکتی ہے؟ ابوحارثہ نے جواب دیا:

ماصنع بنا ھٰؤلاء القوم۔ شرّفونا ومولّونا واکرمونا وقد اَبَو الاخلافہ فلو فعلت نزعوا منّا کل ماتریٰ۔

(مجھے ایمان لانے سے وہ نوازشات روک رہی ہیں جو اس قوم نے (نجران کے عیسائیوں نے) ہم پر کی ہیں۔ اُنہوں نے ہم کو شرافت اور کرامت کا منصب دیا ہے۔ دولت دی ہے۔ اور بے شمار احسانات کئے ہیں۔ ہماری یہ قوم محمدؐ کی مخالفت پر تُلی ہوئی ہے، اگر میں یہ کام کرلوں (ایمان لے آؤں) تو یہ لوگ وہ تمام مراعات ہم سے چھین لیں گے جنہیں تم خود دیکھ رہے ہو[1])

---

[1] سیرۃ ابن ہشام۔ طبع ۱۹۵۵ء، ج ۱، ص ۵۷۳۔

صرف اللہ کے مختارِ کل ہونے کے بارے میں احادیثِ رسول ؐ

عن ابن عباسؓ ان رجلا قال یارسول اللّٰہ ماشاء اللّٰہ وشئت فقال جعلتنی اللّٰہ عدلاً (وفی روایۃ ندًا) ماشاء اللّٰہ وحدہٗ [1]

(ایک شخص نے کہا یارسول اللہ ؐ وہی ہوتا ہے جو اللہ چاہے اور آپ ؐ چاہیں۔ رسول اللہ ؐ نے فرمایا تم نے تو مجھے اللہ کے ساتھ برابر کردیا۔ ہوتا وہی ہے جو اللہ چاہے وہ واحد ہے)

ابنِ ماجہ کی روایت میں ہے:

فلا تقولوا ماشاء اللّٰہ وشاء محمدؐ ولکن قولوا ما شاء اللّٰہ وحدہٗ [2]

(یوں نہ کہو کہ وہی ہوتا ہے جو اللہ چاہے اور محمد ؐ چاہے، بلکہ یوں کہو کہ وہی ہوتا ہے جو اللہ چاہے۔ وہ واحد ہے)

بعض دوسری روایات میں "ثُمَّ" کہنے کی اجازت دی گئی ہے:

عن حذیفۃؓ عن النبیؐ قال لا تقولوا ماشاء اللّٰہ و

---

[1] مسند احمدؒ۔ مسند ابن عباسؓ۔ ج ۱، ص۲۸۳۔ طبع بیروت۔ الادب المفرد للبخاری مع شرحہ فضل اللّٰہ الصمد، باب قول الرجل ماشاء اللّٰہ وشئت، ج ۲، ص۲۶۱ — کنزالعمال۔ ج ۳، ص۶۵۹، طبع بیروت۔ (۱۹۷۹ء)

[2] کنزالعمال۔ ج ۳، ص۶۵۹ و ابن ماجہ۔

شاء فلان و لکن قولوا ماشاء اللہ ثم شاء فلان[1]

(یوں نہ کہا کرو کہ وہی ہوتا ہے جو اللہ اور فلاں چاہے، بلکہ یوں کہا کرو کہ وہی ہوتا ہے جو اللہ چاہے اور پھر (اس کے بعد) فلاں چاہے)

دوسری روایت میں ہے:

لا تقولوا ماشاء اللہ وشاء محمدؐ ولکن قولوا ماشاء اللہ ثم شاء محمدؐ[2]

(یوں نہ کہا کرو کہ جو اللہ اور محمدؐ چاہیں وہی ہوتا ہے، بلکہ یوں کہا کرو کہ جو اللہ چاہے اور پھر (اس کے بعد) محمدؐ چاہے)

اِن ارشاداتِ نبویہؐ کا مقصد یہ ہے کہ "ماشاء اللہ وشاء محمدؐ" میں حرف "و" جس کے معنے "اور" آتے ہیں، جمع اور شرکت کے لئے آتا ہے۔ اس حرف کے استعمال سے یہ وہم ہوسکتا ہے کہ اللہ اور رسولؐ دونوں کا ارادہ مل کر کسی چیز کا فیصلہ کرتا ہے، حالانکہ انسان کا ارادہ اللہ کے ارادے کے تحت اور تابع ہے۔ انسان، یہاں تک کہ سرورِ عالمؐ، سارے انبیاء و رُسل، سارے فرشتے اور سارے اولیاء و شُہداء سب کے سب مل کر بھی کچھ نہیں کر سکتے، جب تک کہ خود اللہ رب العالمین کسی کام کا فیصلہ اور ارادہ نہ کرے۔ وہی کام ہوتا ہے جو اللہ چاہتا ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا:

وَمَا تَشَاءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ (التکویر-۲۹)

وَمَا تَشَاءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا

---

[1] ابوداؤد - کتاب الادب - باب لا یقال خَبُثَت نفسی ـــ جامع الاصول - طبع حلوانی ۱۹۷۲ء، ج ۱۱، ص ۳۰، وکنزالعمال - ج ۳ ص ۶۵۶، بحوالہ احمد و ابوداؤد و نسائی -

[2] سنن دارمی - طبع دارالفکر بیروت ۱۹۷۸ء، ج ۲، ص ۲۹۵ وکنزالعمال ج ۳، ص ۶۵۶ و ۶۵۹ -

حَکِیْمًا ۝ (الدھر - ۳۰)

(تمہارے چاہنے سے کچھ نہیں ہوسکتا جب تک اللہ رب العالمین نہ چاہے یقیناً اللہ سب کچھ جانتا ہے اور حکمت والا ہے)

حرف "و" کا استعمال چونکہ مُوہم شرک تھا اس لئے اس سے روک دیا گیا اور اسے شرک قرار دیا گیا، مگر اس کی جگہ "ثُمَّ" کے استعمال کی اجازت دے دی گئی، جس کے معنے "پھر اور" "بعد" آتے ہیں۔ چونکہ اس سے انسان کے ارادے کا ارادہ خداوندی کے بعد ہونا ثابت ہوتا ہے اس لئے اس میں شرک کا وہم نہیں ہے۔ جن الفاظ وافعال سے شرک کا وہم اور شائبہ ہوتا ہو اور وہ شرک کا ذریعہ اور چور دروازہ بن سکتے ہوں شریعت نے اُن سے بھی روک دیا ہے "سَدًّا لِلذَّرِیْعَۃِ"

رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے مروی ایک طویل حدیث میں آیا ہے کہ حضرت رسولؐ اللہ فرمایا کرتے تھے۔ بنی اسرائیل انکارِ تقدیر کی وجہ سے گمراہ ہوئے ہیں۔ میں نے پوچھا۔ اے اللہ کے رسولؐ تقدیر پہ ایمان کیا ہوتا ہے؟ فرمایا:

تؤمن باللہ وحدہٗ وانک لاتملک معہٗ ضرا ولا نفعًا[1]

(اللہ پہ ایمان لاؤ جو یکتا و یگانہ ہے اور اس بات پہ ایمان لاؤ کہ تمہارے پاس اپنے نفع ونقصان کا کوئی اختیار (غیبی طاقت) نہیں ہے)

عن ابن عباس رضی اللہ عنہ قال قال رسولؐ اللہ الامر کلّھا خیرھا وشرھا من اللہ وقال القدر نظام التوحید فمن وحّد اللہ وآمن بالقدر فَقَدِ اسْتَمْسَکَ بِالْعُرْوَۃِ الْوُثْقٰی[2]

(حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

---

[1] مجمع الزوائد۔ طبع بیروت ۱۹۶۷ء، ج ۷، ص ۱۸۹۔

[2] مجمع الزوائد۔ ج ۷، ص ۱۹۷۔

نفع ونقصان کے کلّی اختیارات اللہ کے پاس ہیں اور تقدیر پہ ایمان توحید کی رسّی ہے جو شخص تقدیر پر ایمان لایا اور خدا کو ایک مانا، اُس نے نہ ٹوٹنے والا مضبوط سہارا تھام لیا)

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ میں ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے پیچھے جارہا تھا۔ آپؐ نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

یا غلام انی أُعلمك كلماتٍ:

اِحفظ اللّٰه يحفظك اِحفظ اللّٰه تجده تجاهك اذا سألت فاسئَلِ اللّٰه واذا استعَنْت فاستعن بالله و اعلم ان الامة لو اجتمعت علىٰ ان ينفعوك بشيئٍ لم ينفعوك الا بشيئٍ قد كتبه لك وان اجتمعوا علىٰ ان يضروك بشيئٍ لم يضروك بشيئٍ الا بشيئٍ قد كتبه اللّٰه عليك رُفعت الاقلام وجَفّتِ الصُّحُف۔

(بیٹے! میں تم کو چند ضروری باتیں بتاتا ہوں (توجہ سے سنو) احکامِ خداوندی کے پابند رہو، خدا تمہاری حفاظت کرے گا۔ احکامِ خداوندی کے پابند رہو تو خدا کو اپنے سامنے پاؤ گے۔ جب بھی کچھ مانگو تو خدا سے مانگو اور جب بھی مدد مانگو خدا سے مانگو۔ جان لو کہ اگر ساری دنیا تمہیں نفع پہنچانا چاہے، تو نہیں پہنچا سکتی، سوائے اُس چیز کے جسے خود اللہ نے تمہارے لئے لکھ دیا ہو۔ اور اگر ساری دنیا کے لوگ اکٹھے ہو کر تمہیں نقصان اور ضرر پہنچانا چاہیں، تو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکیں گے، سوائے اُس چیز کے جو تمہارے لئے لکھ دی گئی ہے۔ تقدیر کی قلمیں اٹھادی گئی ہیں اور دفتروں کی سیاہی خشک ہو چکی ہے)[1]

---

[1] ترمذی شریف۔ ابواب صفۃ القیامۃ و اربعین للنووی باب ۲۲ حدیث ۲۶۳۵۔

امام نوویؒ (متوفی ۶۷۶ھ) اذا سئلت فاسئل اللہ کی تشریح میں لکھتے ہیں:

ثم ان کانت الحاجۃ التی یسألہا لم تجر العادۃ بجریانہا علی ایدی خلقہ کطلب الھدایۃ والعلم والفہم فی القراٰن والسنۃ وشفاء المرض وحصول العافیۃ من بلاء الدنیا وعذاب الاٰخرۃ سأل ربہ ذٰلک۔ وان کانت الحاجۃ التی یسألہا جرت العادۃ ان اللہ سبحانہ وتعالیٰ یجریہا علی ایدی خلقہ کالحاجات المتعلقۃ باصحاب الحِرَف والصنائع وولاۃ الامور سأل اللہ تعالیٰ ان یعطف علیہ القلوب[1]۔

(اگر انسان کی حاجت اس قسم کی ہو کہ عادۃً مخلوق کے ذریعے پوری نہ ہو سکتی ہو، مثلاً توفیقِ ایمان وہدایت، توفیقِ علم وفہم، شفاءِ مرض، دنیا کی کسی مصیبت سے عافیت وحفاظت اور آخرت کے عذاب سے نجات، تو ایسی چیزوں کو انسان صرف اللہ سے مانگے، لیکن اگر وہ حاجت ایسی ہو جسے عادۃً اللہ تعالیٰ کسی بندے کے ذریعے پوری کرتا ہے، مثلاً وہ ضروریاتِ زندگی جن کا تعلق اہلِ صنعت وحرفت یا حکام سے ہو، تو پھر انسان اللہ تعالیٰ سے یہ سوال کرے کہ وہ اپنے بندوں کے دلوں کو اس کی جانب مائل کر دے اور نرم بنا دے)

امام نوویؒ کی تشریح کا حاصل یہ ہے کہ جن چیزوں کے اسبابِ عادیہ، یعنی طبیعی وسائل موجود ہوں، تو انسان یہ سوال کرے کہ اے اللہ میرے لئے اسباب ووسائل فراہم کیجئے اور پھر اُن کو مؤثر بنا دیجئے، لیکن اگر کوئی عادی اور طبیعی سبب موجود نہ ہو تو صرف اللہ ہی سے مدد مانگی جائے۔ اس لئے کہ مادّی اور طبیعی اسباب کے بغیر حاجت برآری وہی کر سکتا ہے جس کے

---

[1] شرح اربعین النوویہ۔ ص۵۲ فی مجموعۃ الحدیث النجدیہ طبع قطر ۱۳۸۳ھ۔

پاس غیبی طاقت ہو اور وہ ماورائے طبیعت قدرت رکھتا ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ قوت اللہ ربُّ العالمین کے علاوہ کسی کے پاس نہیں ہے۔

عن ابی ھریرۃ رضؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اَخْنی الاسماء و فی روایۃ اَخْنَع اسم عند اللہ یوم القیٰمۃ رجل تسمی مَلِکُ الاملاک قال سفیانؒ یقول غیرہ تفسیرہ "شاھانِ شاہ"[1]

(حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حقیر ترین اور قبیح ترین نام قیامت کے روز خدا کے نزدیک اُس شخص کا ہوگا جس نے اپنا نام شہنشاہ رکھا ہو)

مسلم شریف کی ایک اور روایت میں اسی طرح کے الفاظ ہیں:

اغیظ رجل علی اللہ یوم القیٰمۃ و اخبثہ و اغیظہ علیہ رجل تسمی مَلِکُ الاملاک لا مالکَ الا اللہ[2]

(بہت زیادہ قہرِ الٰہی کا مستحق قیامت کے روز اور بہت زیادہ گندہ اور قابلِ نفرت شخص وہ ہوگا جس نے اپنا نام شہنشاہ رکھا ہو، اس لئے کہ مالک تو صرف اللہ ہے)

مَلِکُ الاملاک، یعنی بادشاہوں کا بادشاہ اور شہنشاہ کہلانے کا مستحق وہی ہو سکتا ہے جو مختارِ کُل ہو، مقتدرِ اعلیٰ ہو، غیبی قوت کا مالک ہو۔ جسے احکام و فرامین نافذ کرنے کے مطلق اور غیر مشروط اختیارات حاصل ہوں، اور جو کسی اور کے سامنے جوابدہ نہ ہو۔ نیز یہ کہ جس کی بادشاہی کو زوال کا خطرہ نہ ہو۔

ظاہر ہے کہ یہ صفات صرف اللہ رب العالمین ہی کو حاصل ہیں؛ چنانچہ اسی وجہ سے

---

[1] بخاری و ترمذی - کتاب الادب۔

[2] مسلم شریف - کتاب الادب۔

شاہانِ شاہ نام خدا کے نزدیک گندہ، حقیر ترین اور قبیح ترین ہے۔ اس کی جگہ امیر، خلیفہ یا امام وغیرہ وہ نام ہونے چاہئیں جن سے تکبّر و غرور وغیرہ کی بیخ کنی ہو سکے اور عبدیت و فقر و احتیاج کا احساس تازہ رہے۔

تاریخ کے مختلف ادوار میں "شاہ پرستی" کا شرک موجود رہا ہے۔ بادشاہوں کو دیوتا سمجھ کر انہیں سجدے بھی کئے گئے ہیں اور عوام کو بادشاہوں کے غلاموں کی حیثیت بھی دی گئی ہے۔ اِسی غلامانہ اور مشرکانہ ذہنیت کی بیخ کنی کی خاطر مسلمانوں کے لئے "شہنشاہ" بُرا نام قرار دیا گیا۔

شاہ پرستی کی اس موذی بیماری کے خاتمے کے لئے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے آقا اور سردار کو ربّ کہنے سے روک دیا ہے اور خادم کو میرا بندہ اور میری لونڈی کہنے سے بھی منع فرمایا ہے۔ ارشاد ہوا :

عن ابی هریرة رض ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال لا یقل احدکم اطعم ربّك وَضّئ ربك ولیقل سیّدی ومولائ ۔ ولا یقل احدکم عبدی واَمَتی ولیقل فَتَایَ وغلامی[1]

(حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کوئی بھی یوں نہ کہے کہ اپنے رب کو کھانا کھلاؤ یا اپنے رب کو وضو کرواؤ، بلکہ میرا سردار اور میرا آقا کہا کرے۔ اور تم میں سے کوئی بھی اپنے خادم اور غلام کو "میرا بندہ" اور لونڈی نہ کہے، بلکہ یوں کہے میرا خادم، میری خادمہ، میرا غلام)

لغوی معنوں کے اعتبار سے ربّ مالک اور بادشاہ کو بھی کہا جاتا ہے اور عَبد اور اَمَة غلام اور خادمہ کے معنوں میں بھی آتا ہے جو شرک نہیں ہے، لیکن یہ الفاظ چونکہ مُوہِمِ شرک

---

[1] مسلم شریف ۔ کتاب الادب ۔

ہیں یعنی ان میں اسمی مشارکت اور مشابہت پائی جاتی ہے، اس لئے معمولی مشابہت کو بھی ختم کرنے کے لئے ان الفاظ کو استعمال کرنے سے روک دیا گیا، تاکہ شرک کا راستہ بالکل ہی مسدود ہو جائے۔

عن ابی ھریرۃ رض قال قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم :
یا بنی کعب بن لُؤیّ انقذوا انفسکم من النار
یا بنی مُرّۃ انقذوا انفسکم من النار
یا بنی عبد شمس انقذوا انفسکم من النار
یا بنی عبد مناف انقذوا انفسکم من النار
یا بنی ھاشم انقذوا انفسکم من النار
یا بنی عبد المطّلب انقذوا انفسکم من النار
یا فاطمۃ انقذی نفسکِ من النار
فانی لا املک لکم من اللہ شیئا غیر ان لکم رحماً سأبُلُّھا ببلالھا[1]

(ابوہریرہ رضؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :
اے بنو کعب، اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ،
اے بنو مُرّہ، اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ،
اے بنو عبدِ شمس، اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ،
اے بنو عبدِ مناف، اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ،
اے بنو ہاشم، اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ،
اے بنو عبد المطلب، اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ،
اے فاطمہ رضؓ، اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ،

---

[1] مسلم شریف - کتاب الایمان -

مَیں تم کو اللہ کی گرفت سے بچانے کا اختیار نہیں رکھتا،
مگر میں تمہارے رشتے کا حق ادا کرتا رہوں گا)

حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اعلان وارشاد کا مقصد یہ تھا کہ میرے قبیلے کے لوگ اور میری اپنی بیٹی کہیں یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ محمدؐ کو قیامت کے روز مجرموں کو بچانے کا کُلّی اختیار حاصل ہوگا لہٰذا آپؐ نے قریش کے ایک ایک قبیلے کو نام لے کر بتادیا کہ تم سب اپنے ایمان وعمل کی وجہ سے نجات پاؤ گے۔ شفاعت اگرچہ حق ہے، لیکن وہ اہلِ ایمان کے لئے ہوگی مشرکین اور کفار کے لئے نہیں ہوگی۔ اور اہلِ ایمان کے لئے بھی اُسی وقت ہوگی جب اللہ اجازت دیدے گا۔ ورنہ بغیر اجازت کے قیامت کے دن کوئی بھی کسی کے لئے شفاعت نہیں کرسکے گا۔

یہ حدیث صاف اور صریح طور پہ دلالت کرتی ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سیّدِ عالم ہونے کے باوجود مُختارِ کُل نہیں تھے۔

بارہواں باب

مسئلۂ اِلٰہ

اللہ تعالیٰ کے مالک، مَلِک، مختارِ کُل، متصرّف اور کارساز و حاجت روا ہونے کا ذکر لفظِ مُلک کے علاوہ دوسرے ہم معنی الفاظ میں بھی ہوا ہے۔ مفہوم اور مضمون ایک ہے اُسلوبِ بیان اور تعبیر میں تنوّع ـــــ ہے۔ اِن مترادف اور ہم معنی الفاظ میں سے ایک لفظ اِلٰـہ ہے۔

"اِلٰہ" کے معنے ہیں مَعْبُود (یعنی جس کی عبادت اور پوجا کی جاتی ہو۔ اگر وہ عبادت کا مستحق ہو، تو "اِلٰہِ حق"، یعنی معبودِ برحق ہے، جیسے اللہ کی ذات۔ اور اگر عبادت و پوجا کا مستحق نہ ہو تو وہ "اِلٰہِ باطل"، یعنی جھوٹا معبود ہے۔ جیسے مشرکین کے خود ساختہ مَعْبُود تھے۔

اَلَـهَ یَأْلَـهُ اِلَاهَـةً ای عَبَدَ[1] = (عبادت کی، عبادت کرتا ہے۔ اِلَاهَـةً پرستش کرنا)

اِلٰـهٌ عَلٰی فِعَالٍ بِمَـعْنٰی مَفْعُوْلٍ لِاَنَّـهٗ مَـاْلُوْهٌ ای مَعْبُوْدٌ۔[2]

(اِلٰہ وزن فِعال ہے مفعول کے معنوں میں اس لئے کہ اِلٰہ اُس کو کہا جاتا ہے جس کی عبادت کی جائے)

انسان عبادت اور پرستش اُسی کی کرتا ہے جس کو وہ غیبی طاقت اور ما فوق الاسباب اختیارات کا مالک سمجھتا ہو۔ لغت اور تفسیر کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آلٰہ کا اصل

---

[1] مختار الصحاح۔ ص۲۲، مادہ أل ہ۔

[2] لسان العرب۔ ج۱۳، ص۴۶۹، طبع دار صادر بیروت۔ باب الھاء، فصل الھمزہ و مختار الصحاح، ص۲۲۔

مفہوم ہے، وہ ذات جو غیبی طاقت رکھتی ہو، کارساز و حاجت روا ہو اور پناہ دہندہ و مختارِ کُل ہو۔ چند محاورات ملاحظہ کیجئے

۱۔ اَلِہَ یَأْلَہُ اذا تحیر لان العقول تَأْلَہُ فی عظمتہٖ۔

(اَلِہَ یَأْلَہُ ایسے موقع پر بولا جاتا ہے جب حیران و سرگشتہ ہو جائے گویا کہ عقول اس کی عظمت و بڑائی معلوم کرنے میں حیران و سرگشتہ ہو گئی ہیں)

۲۔ اَلِہَ یَأْلَہُ الیٰ کذا ای لَجَأَ الیہ لانہ سبحانہ المفزع الذی یُلْجأُ الیہ فی کل امر قال الشاعر:

اَلِہْتَ اِلَینا والحوادث جُمَّۃٌ

(خوف زدگی اور پریشانی کی حالت میں فلاں کے پاس اُس نے پناہ حاصل کی اور اُس کی جانب متوجہ ہوا۔ اس لئے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ہی وہ پناہ گاہ ہے جس کی پناہ حاصل کی جاسکتی ہے، ہر مصیبت اور حادثے کے وقت۔ ایک شاعر کہتا ہے ؎

تم نے ہمارے پاس پناہ حاصل کر لی ہے اور حوادث بہت زیادہ ہیں)

۳۔ اَلِہْتُ الیٰ فلان ای سکنت الیہ لان القلوب تطمئن بذکرہٖ والارواح تسکن الیٰ معرفتہٖ۔

(اس کی پناہ میں جاکر میں نے سکون حاصل کر لیا۔ اس لئے کہ قلوب کو اس کے ذکر سے اطمینان حاصل ہوتا ہے اور ارواح کو اس کی معرفت سے سکون میسّر آتا ہے)

۴۔ اَلِہَ اذا فزع من امرٍ نزل علیہ و آلَہَہٗ غیرہٗ اجارہٗ اذا العائذ یفزع الیہ وھو یجیرہٗ حقیقۃ او بزعمہ۔

(آدمی کسی مصیبت اور پریشانی کے نزول سے خوف زدہ اور پریشان ہوا اور دوسرے نے اُس کو پناہ دی۔ اس لئے کہ پناہ لینے والا اُس کی پناہ چاہتا

ہے اور وہ اُس کو پناہ دیتا ہے فی الحقیقت یا اُس کے زعم میں)

۵۔ أَلِهَ الفصیل اذا ولع بامه اذا العباد مولعون بالتضرّع الیه فی الشدائد[1]۔

(اونٹنی کا بچّہ ماں کو پاتے ہی اُس سے چمٹ گیا۔ اس لئے کہ لوگ مصائب کے وقت عاجزی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی جانب توجہ کرتے ہیں)

۶۔ لَاهَ يَلِيهُ لَيْهًا وَلَاهًا اذا احتجب وارتفع لانه تعالیٰ محجوب عن ادراک الابصار و مرتفع علیٰ کل شیئ وعما لایلیق به[2]۔

(لَاهَ يَلِيهُ لَيْهًا اور لَاهًا ایسے موقع پر بولتے ہیں جب کوئی چیز پوشیدہ اور بلند ہو جائے' اس لیے کہ اللہ تعالیٰ بھی نظروں سے پوشیدہ ہے اور اُس کی ذات ہر چیز سے بلند ہے اور ہر اُس چیز سے پاک ہے جو اس کی شان کے لائق نہ ہو)

ان عربی محاورات سے معلوم ہوتا ہے کہ اِلٰہ برحق وہی ہو سکتا ہے جو سب سے بڑا ہو' پناہ دیتا ہو' کارساز ہو' سکونِ قلب بخشتا ہو' مقتدرِ اعلیٰ ہو' غیبی طاقت رکھتا ہو۔ مختارِ کُل ہو' قاضی الحاجات ہو' نظروں سے پوشیدہ اور بالاتر ہو۔ ائمۂ لغت اور آئمۂ تفسیر وحدیث دونوں نے مذکورہ بالا محاورات کی روشنی میں اُلوہیّت کا یہی مفہوم متعین کیا ہے۔ مثلاً ابن منظور افریقیؒ فرماتے ہیں :

قال ابو الهیثمؒ ولا یکون الٰه حتی یکون معبوداً وحتی یکون لعابده خالقاً ورازقاً ومدبراً وعلیه مقتدراً فمن لم یکن کذالک فلیس بالٰهٍ وان عُبِد

---

[1] انوار التنزیل واسرار التاویل المعروف البیضاوی' الفاتحہ' لفظ اللہ۔

[2] ایضاً۔

ظلماً بل ھو مخلوق و متعبَّدٌ ۔۔۔۔۔ ان الخلق یُولھُونَ الیہ فی حوائجھم و یضرعون الیہ فیما یصیبھم ویفزعون الیہ فی ما کل ما ینوبھم کما یُولہ کل طفل الیٰ امّہ[1]

(اِلٰہ وہی ہوسکتا ہے جس کی عبادت کی جاتی ہو، اور عبادت و پرستش کا مستحق وہی ہوسکتا ہے جو عبادت کرنے والے کا خالق ہو، رازق ہو، مُدبّر ہو اور مقتدرِ اعلیٰ ہو۔ جو یہ صفات نہ رکھتا ہو وہ اِلٰہ نہیں ہے، اگرچہ ظلماً اُس کی عبادت کی جاتی ہو، بلکہ وہ مخلوق ہے اور کمزور معبود بن بیٹھا ہے لوگ اپنی حاجتوں کے لئے اللہ کی جانب متوجّہ ہوتے ہیں، اسی کے دربار میں فریاد اور زاری کرتے ہیں، مصائب کے وقت اسی کی پناہ چاہتے ہیں، حوادث کے وقت جیسا کہ ایک بچّہ اپنی ماں کے پاس پناہ حاصل کرتا ہے اور اس سے چمٹ جاتا ہے)

امام قرطبیؒ کا ارشاد ہے: انما سمی اللّٰہ اِلٰھًا لان الخلق یَتَاَلَّھُون الیہ فی حوائجھم و یتضرّعون الیہ عند شدائدھم[2]

(اللہ کو اِلٰہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ لوگ اپنی حاجتوں کے لئے اُس کی جانب متوجّہ ہوتے اور مصائب کے وقت اس کے دربار میں فریاد وزاری کرتے ہیں)

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں: فالاِلٰہ ھو الذی یاألھُہُ القلب بکمال الحب والتعظیم والاجلال والاکرام و

---

[1] لسان العرب۔ ج ۱۳، ص ۴۶۸، مادہ اِلٰہ۔

[2] الجامع لاحکام القرآن معروف بتفسیر قرطبی۔ ج ۱، ص ۱۰۳، الفاتحہ لفظ اللّٰہ۔

الخوف والرّجاء[1]

(اِلٰہ وہ ہے جس کی طرف دل مائل ہوتا ہے۔ کامل محبّت، کامل تعظیم اور اعزاز و اکرام کے ساتھ اور خوف و امید کے ساتھ)

امام ابنِ قیمؒ کا ارشاد ہے: تأْلَهُهُ الخلائق محبةً وتعظيماً وخُضوعاً وفزعاً اليه في الحوائج والنوائب وذالك مستلزم لكمالِ ربُوبيَّتِهٖ ورحمته المتضمِّنتَيْن لكمال الملك[2]۔

(اِلٰہ وہی ہوتا ہے جس کی طرف مخلوق محبّت، تعظیم، عاجزی اور خوف کے ساتھ رجوع کرتی ہو، حاجات اور حوادثات کے وقت۔ اِس سے لازم آتا ہے کہ اُس کی ربُوبیّت اور رحمت دونوں کامل ہوں، اور اُس کے کمالِ ربُوبیّت و رحمت سے ثابت ہوتا ہے کہ اُس کی بادشاہی اور فرمانروائی کامل ہے)

حاصلِ بحث یہ ہے کہ "اِلٰہِ حق" وہی ہوتا ہے جو خالق ہو، مالک ہو، حاکم ہو، رازق ہو، غیبی علم کا مالک ہو، کامل قدرت کا مالک ہو، کارساز ہو، قانون ساز ہو، اور تمام صفاتِ کاملہ کا مالک ہو۔ ظاہر ہے کہ ان صفات کا موصوف صرف اللّٰہ ربُّ العالمین ہے۔

---

[1] رسالہ العبودیہ ص۱۲ فی مجموعۃ التوحید، طبع دمشق ۱۹۶۲ء۔
[2] التفسیر القیم۔ طبع ۱۹۴۹ء، ص۳۲۔

اِلٰہ کے بارے میں آیات

قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ کے اِلٰہِ واحد ہونے کا ذکر ۱۲۲ آیات میں ہوا ہے۔ مسئلۂ الوہیت کو سمجھنے کے لئے ان آیات کا نقشہ دیا جارہا ہے جن میں لفظِ اِلٰہ کے ساتھ اللہ کے حاکمِ تکوینی اور حاکمِ تشریعی ہونے کا ذکر ہوا ہے:

نمبر شمار	نام سورت	نمبر آیات	نمبر شمار	نام سورت	نمبر آیات
۱	البقرہ	۱۳۳ - ۱۶۳ - ۲۵۵	۱۴	الکہف	۱۴ - ۱۵ - ۱۱۰
۲	آلِ عمران	۲ - ۶ - ۱۸ - ۶۲	۱۵	مریم	۴۶ - ۸۱
۳	النساء	۷ - ۸ - ۱۷۱	۱۶	طٰہٰ	۸ - ۱۴ - ۸۸ - ۹۷ - ۹۸
۴	المائدہ	۷۳ - ۱۱۶	۱۷	الانبیاء	۲۱ - ۲۲ - ۲۴ - ۲۵ - ۲۹ - ۳۶ - ۴۳ - ۵۹ - ۶۲ - ۶۸ - ۸۷ - ۹۹ - ۱۰۸
۵	الانعام	۱۹ - ۴۶ - ۷۴ - ۱۰۲ - ۱۰۶	۱۸	الحج	۳۴
۶	الاعراف	۵۹ - ۶۵ - ۷۳ - ۸۵ - ۱۲۷ - ۱۳۸ - ۱۵۸	۱۹	المؤمنون	۲۳ - ۳۲ - ۹۱ - ۱۱۶ - ۱۱۷
۷	التوبہ	۳۱ - ۱۲۹	۲۰	الحجر	۹۶
۸	یونس	۹۰	۲۱	الفرقان	۳ - ۴۲ - ۴۳ - ۶۸
۹	ہود	۱۴ - ۵۰ - ۵۳ - ۵۴ - ۶۱ - ۸۴ - ۱۰۱	۲۲	الشعراء	۲۹ - ۲۱۳
۱۰	الرعد	۳۰	۲۳	النمل	۲۶ - ۶۰ - ۶۱ - ۶۲ - ۶۳ - ۶۴
۱۱	ابراہیم	۵۲	۲۴	القصص	۷۰ - ۷۱ - ۷۲ - ۸۸
۱۲	النحل	۲ - ۲۲ - ۵۱	۲۵	العنکبوت	۴۶
۱۳	الاسراء	۲۲ - ۳۹ - ۴۲	۲۶	فاطر	۳

نمبر شمار	نام سورت	نمبر آیات	نمبر شمار	نام سورت	نمبر آیات
۲۷	یٰس	۲۳-۲۴	۳۶	الاحقاف	۲۲-۲۸
۲۸	صافات	۴-۳۵-۳۶-۸۶	۳۷	محمدؐ	۱۹
۲۹	صٓ	۵-۶-۶۵	۳۸	قٓ	۲۶
۳۰	الزمر	۶	۳۹	الذاریات	۵۱
۳۱	المؤمن	۳-۳۷-۶۲-۶۵	۴۰	الطور	۴۳
۳۲	حٰم سجدہ	۶	۴۱	الحشر	۲۲-۲۳
۳۳	الزخرف	۴۵-۵۸-۸۴	۴۲	التغابن	۱۳
۳۴	الدخان	۸	۴۳	نوح	۲۳
۳۵	الجاثیہ	۲۳	۴۴	المزمل	۹
-	-	-	۴۵	الناس	۳
کل تعداد سورت = ۴۵			کل تعداد آیات = ۱۲۲		

اِلٰہ بمعنی حاکمِ تشریعی اور قانون ساز سے متعلقہ بعض آیات کی تشریح مَیں نے اپنی کتاب "اسلامی سیاست" میں کی ہے، اِس جگہ موضوع کی مناسبت سے چند وہ آیات پیش کی جا رہی ہیں جن میں اللہ کے حاکمِ تکوینی اور کارساز وحاجت روا ہونے کا ذکر ہے اور غیر اللہ کے حاکمِ تکوینی اور کارساز ہونے کی نفی کی گئی ہے۔ ویسے تو مذکورہ بالا نقشے کی ساری آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ حاکمِ تکوینی بھی اللہ ہے اور حاکمِ تشریعی بھی اللہ ہی ہے۔ اس لئے کہ اِلٰہ وہی ہوسکتا ہے جو غیبی طاقت کا مالک ہو؛ چنانچہ تکوینی اور تشریعی حاکم بھی وہی ہے جو غیبی طاقت کا مالک ہے۔ تَعَالَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ۔

الٰہ وہی ہو سکتا ہے جو شنوائی اور بینائی چھین سکتا ہو اور واپس دے سکتا ہو

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَ اَبْصَارَكُمْ وَ خَتَمَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ ۝

(الانعام - ۴۶ - پ ۷)

(اے محمدؐ! ان سے کہو کیا دیکھا (سوچا) ہے تم نے کہ اگر چھین لے اللہ تمہارے کان اور تمہاری آنکھیں اور مہر کر دے تمہارے دلوں پر، تو کون ہے دوسرا کارساز اور رب اللہ کے سوا جو یہ چیزیں تم کو واپس دلا سکتا ہو؟ دیکھو ہم کیونکر طرح طرح سے بیان کرتے ہیں اپنی نشانیاں۔ پھر بھی وہ منہ موڑ لیتے ہیں)

اِس آیت کے سیاق و سباق سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ اِلٰہ سے مراد وہ پروردگار، کارساز اور مشکل کشا ہے جو کانوں کی شنوائی، آنکھوں کی بینائی اور دل کی دانائی دے بھی سکتا ہو اور چھین بھی سکتا ہو۔ اِسی مفہوم کی جانب اشارہ کرنے کے لئے شیخ الہندؒ نے اس جگہ اِلٰہ کا ترجمہ "رب" کیا ہے۔ رب کے معنے ہیں پالنے اور ضروریات پوری کرنے والا۔ کان، آنکھ اور دل انسان کی بنیادی ضروریات ہیں جو اس کی نشو و نما کے لئے لازمی ہیں۔ کان سے سننے کی طاقت، آنکھ سے دیکھنے کی طاقت اور دل سے سوچنے کی طاقت اگر بالکل ختم ہو جائے، تو یہ طاقت دوبارہ وہی لوٹا سکتا ہے جو ما فوق الطبیعت اور ما فوق الاسباب قوت رکھتا ہو اور وہ اللہ کے سوا دوسرا کوئی نہیں ہے۔ یہی اللہ کے مختار کُل اور کارساز ہونے کے وہ دلائل ہیں جن سے مشرکین اعراض کرتے ہیں اور اُن سے نظر چُرا لیتے ہیں۔ مُعجزے اور خرقِ عادت کے طور پر حضرت عیسٰیؑ کے ہاتھ پر مادر زاد اندھے بینا اور کوڑھی صحت یاب ہو جاتے تھے بلکہ مردے زندہ ہو جاتے تھے۔ اسی نوع کے معجزات سیّدِ عالم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بھی ظاہر ہوئے اور دیگر انبیاء کو بھی دیے گئے تھے، لیکن کوئی

معجزہ دکھانا انبیاء کے اختیار میں نہ تھا کہ جب چاہیں معجزہ دکھا دیں۔ وہ تو صرف مُظْہَر تھے کام خود خدا کرتا تھا۔ اگر حضرت عیسیٰؑ مختارِ کل ہوتے تو اپنے آپ کو بچا لیتے، حالانکہ آپ نے بہت سے مظالم برداشت کئے۔ انما الآیات عند اللہ (بے شک معجزات اللہ کے اختیار میں ہیں)

سورۂ آلِ عمران۔ آیت نمبر ۴۹ میں حضرت عیسیٰؑ کے مذکورہ بالا معجزات کا ذکر اس طرح ہوا ہے کہ آیت کے آغاز میں بھی ان کو اللہ کی قدرت کی نشانی کہا گیا ہے (قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ) اور آخر میں بھی ان کو نشانی کہا گیا ہے (اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ) "آیت" سے مراد معجزہ ہے جو اللہ کے کارساز اور متصرف مافوق الاسباب ہونے کی دلیل بھی ہے اور رسول کی صداقت ورسالت کی دلیل بھی۔ اِس آیت میں دو مرتبہ بِاِذْنِ اللّٰهِ کا ذکر ہوا ہے۔ انہی معجزات کا ذکر سورۂ المائدہ۔ آیت نمبر ۱۱۰ میں اس طرح ہوا ہے کہ چار مرتبہ بِاِذْنِیْ کا اِعادہ ہوا ہے۔ بِاِذْنِیْ اور بِاِذْنِ اللّٰهِ سے اللہ کا حکمِ تکوینی مراد ہے، یعنی یہ سب کام خود اللہ تعالیٰ نے اپنے تکوینی حکم اور کُنْ فَیَکُوْنِی قوّت سے کئے تھے حضرت عیسیٰؑ تو صرف مُظْہَر یعنی جائے ظہور تھے اور اسی مظہر ہونے کی وجہ سے اُن معجزات کی نسبت حضرت عیسیٰؑ کی جانب کی گئی ہے۔ سورۂ مائدہ کی محوّلہ بالا آیت کی تفسیر کرتے ہوئے امام رازیؒ تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں:

انما اعاد باذنی تاکیداً لکون ذالك واقعاً بقدرة اللہ وتخلیقه لا بقدرة عیسیٰؑ وایجادہ۔

(بِاِذْنِیْ کی تکرار تاکید کے لئے کی گئی ہے، اس لئے کہ یہ کام اللہ کی قدرت اور تخلیق سے ہوئے تھے۔ حضرت عیسیٰؑ کی قدرت اور اُن کی ایجاد سے نہیں ہوئے تھے)

اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے امام رازیؒ مزید لکھتے ہیں: ذکر الاذن فی هذه الافاعیل انما هو علیٰ اضافة حقیقة الفعل الی اللہ۔

(اذنِ خداوندی کا ذکر اِن افعال میں اس لئے ہوا ہے کہ حقیقت میں یہ کام اللہ ہی کے تھے)

الٰہ وہی ہوسکتا ہے جو نظامِ شمسی کو قائم رکھ سکتا ہو

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ الَّيْلَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِضِيَآءٍ ۭ اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ ۝ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِلَيْلٍ تَسْكُنُوْنَ فِيْهِ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝

(القصص۔۷۱۔۷۲۔پ۲۰)

(ان سے کہو کیا دیکھا ہے تم نے اگر طاری کر دے اللہ تم پر رات ہمیشہ کے لئے روزِ قیامت تک، تو کون ہے دوسرا کارساز اللہ کے سوا جو لے آئے تمہارے لئے روشنی؟ پھر کیا تم سنتے نہیں ہو؟ اِن سے کہو کیا دیکھا ہے تم نے اگر طاری کر دے اللہ تم پہ دن ہمیشہ کے لئے روزِ قیامت تک، تو کون ہے دوسرا کارساز جو لے آئے تمہارے لئے رات جس میں تم آرام حاصل کر سکو؟ پھر کیا تم دیکھتے نہیں ہو؟)

اِن دو آیتوں میں کہا گیا ہے کہ اِلٰہ وہی ہو سکتا ہے جو روشنی، تاریکی اور رات دن لا سکتا ہو۔ نظامِ شمسی اور رات دن کی تجدید اُس کے قبضۂ قدرت میں اور وقت اور موسم کی تبدیلی اُسی کے ہاتھ میں ہو۔ اس سیاق و سباق میں اِلٰہ کارساز اور مختارِ کل کے معنوں میں آیا ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ نے اس جگہ اِلٰہ کے معنے "حاکم" کئے ہیں، یعنی تکوینی فیصلے کرنے والا۔

الٰہ وہی ہو سکتا ہے جو بارش برساتا اور درخت اُگاتا ہو

اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ ۚ مَّا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ ۝ (النمل۔ ۶۰ پ ۲۰)

(ان کے خود ساختہ شریک بہتر ہیں، یا وہ جس نے پیدا کئے ہیں آسمان اور زمین اور اتارا ہے تمہارے لئے آسمان سے پانی۔ پھر اگائے ہم نے اس سے باغ رونق والے، تمہارے بس میں نہیں تھا کہ اُگاتے ان کے درخت۔ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور کارساز شریک ہے؟ کوئی بھی نہیں ہے، بلکہ یہ لوگ توحید سے کتراتے ہیں)

کارسازی، مشکل کشائی، فریاد رسی اور حاجت روائی کے لئے وہ خود ساختہ آلہہ بہتر ہیں جن کے پاس کوئی غیبی طاقت اور تکوینی قوت نہیں ہے بلکہ وہ خود مخلوق، عاجز اور محتاج ہیں، یا وہ خدا جس نے آسمان اور زمین پیدا کئے ہیں، بادلوں سے پانی اتارا ہے، تمہاری غذا کے لئے وہ ہرے بھرے، بارونق اور خوش منظر باغ اگائے ہیں جن کے درختوں کو اگانا تمہارے بس میں نہ تھا اور نہ تمہارے خود ساختہ شریکوں کے بس میں تھا؟

کیا تم ثابت کر سکتے ہو کہ ان کاموں میں اللہ کے سوا کوئی دوسرا کارساز اور مختارِ کل شریک ہے؟ کوئی نہیں ہے، بلکہ یہ لوگ توحید کی حقیقت سے منہ موڑتے ہیں۔

جب یہ سب بڑے کام اللہ ہی نے تنہا کئے ہیں، تو پھر دوسروں کو کیوں مدد کے لئے پکارتے ہو؟ کیا ایسے قوی اور قطعی دلائل دیکھ کر کوئی ذی عقل کہہ سکتا ہے کہ دوسرا بھی کوئی کارساز اور حاکمِ تکوینی ہے؟

اِن آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ الٰہ وہی ہو سکتا ہے جو خالقِ ارض وسما ہو، بارش

برساسکتا ہو اور زمین سے درخت اگا سکتا ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ کام نہ کوئی فرشتہ کرسکتا ہے، نہ کوئی نبی اور رسول۔ نہ کوئی ولی اور بزرگ کرسکتا ہے، نہ کوئی جن اور دیوتا۔ نہ چاند سورج اور ستارے کرسکتے ہیں، نہ اَرواح۔ نہ کوئی بُت یہ کام کرسکتا ہے اور نہ کسی مَزار، درگاہ اور خانقاہ سے یہ کام کروائے جا سکتے ہیں، تو پھر اُن کو مدد کے لئے پکارنا، اُن کے سامنے سجدے کرنا، اُن کے نام کی نذر نیاز دینا اور اُن کو کارساز، غیب دان اور مشکل کشا سمجھنا، توحید کی حقیقت سے بلاوجہ کترانا اور منہ موڑنا ہی ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کی تخلیق میں کسی نبی، رسول، غوث، قطب اور ولی کو اپنا شریک نہیں بنایا، تو انسان کی روزمرّہ حاجات و ضروریات پوری کرنے کے لئے کس طرح کسی کو اپنا شریک بناتا؟ سچ یہ ہے کہ تمام فیصلے اللہ خود کرتا ہے، کسی غوث و قطب کو اس نے تکوینی اختیارات نہیں دیے۔

الٰہ وہی ہوسکتا ہے جو ندیاں، پہاڑ اور دریا بنا سکتا ہو

اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّجَعَلَ خِلٰلَهَاۤ اَنْهٰرًا وَّ جَعَلَ لَهَا رَوَاسِیَ وَجَعَلَ بَیْنَ الْبَحْرَیْنِ حَاجِزًا ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ۔ النمل-٦١ پ٢٠

(بھلا وہ بہتر ہے جس نے بنائی ہے زمین ٹھہرنے اور بسنے کی جگہ اور نکالی ہیں اس کے بیچ میں نہریں اور ندیاں اور بنائے ہیں اس کے ٹھہرانے کے لئے پہاڑ اور بنایا ہے دو دریاؤں کے درمیان آڑ اور پردہ۔ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور کارساز شریک ہے؟ کوئی نہیں، بلکہ ان میں سے اکثر لوگ سمجھتے نہیں ہیں۔)

الٰہ وہی ہے جس نے زمین کو ٹھہرنے اور بسنے کے لائق بنایا ہے۔ نہریں، ندیاں اور پہاڑ پیدا کئے ہیں اور دو سمندروں کے درمیان آڑ رکھ دی ہے کہ کھاری اور میٹھے پانی آپس میں ملنے نہ پائیں۔ مشرکین کے جعلی اور من گھڑت خدا یہ کام نہیں کرسکتے، لہٰذا وہ کارساز

بھی نہیں ہیں۔ حضرت شیخ الہندؒ نے سورۂ نمل کی پانچوں آیات میں لفظِ اللہ کا ترجمہ حاکم کیا ہے، یعنی تکوینی فیصلے کرنے والا۔ حاکمِ تکوینی اور کارساز دونوں ہم معنی ہیں۔ آیت کے مضمون اور سیاقِ کلام سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بھی الٰہ سے مراد کارساز ہے۔

الٰہ وہی ہو سکتا ہے جو بے بس کی فریاد سنتا اور مصیبت ہٹا سکتا ہو

أَمَّنْ يُجِيبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَاءَ الْأَرْضِ ۗ أَإِلَٰهٌ مَّعَ اللَّهِ ۚ قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ ۝ (النمل-۶۲-پ ۲۰)

(وہ جو لاچار اور بے بس کی فریاد سنتا ہے جب وہ اُسے پکارے، اور دور کرتا ہے پریشانی اور تکلیف اور بناتا ہے تم کو زمین میں نائب۔ کیا ہے کوئی دوسرا کارساز جو اللہ کے ساتھ شریک ہو؟ کوئی نہیں، مگر تم کم ہی دھیان کرتے ہو اور کم ہی مانتے ہو)

مُضْطَرّ اس کو کہتے ہیں جو اسبابِ عادیہ سے محروم ہو چکا ہو اور کوئی غیبی طاقت ہی اُسے بچا سکتی ہو، اور اُس کی تکلیف دور کر سکتی ہو۔ تو کیا کسی اور کے پاس ایسی قوت ہے کہ وہ اُس کی فریاد سُن سکے اور تکلیف دور کر سکے؟ کوئی بھی نہیں ہے، لیکن یہ لوگ دھیان نہیں کرتے اور توحید کو مانتے نہیں ہیں۔

معلوم ہوا کہ الٰہ وہی ہو سکتا ہے کہ آواز رسانی کے اسباب کے بغیر پکارنے والے کی پکار سن بھی سکتا ہو اور اسباب کے بغیر اس کی مصیبت اور پریشانی دور بھی کر سکتا ہو۔ سیاقِ کلام سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس جگہ الٰہ کے معنے ہیں فریاد رس، غیبی طاقت کا مالک اور پکارنے والے کی پکار سننے والا۔ جو اللہ کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔

الٰہ وہی ہو سکتا ہے جو صحراؤں اور دریاؤں میں راستہ دکھاتا اور ہوائیں چلاتا ہو

اَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًاۢ بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ (النمل-۶۳ پ ۲۰)

(یا وہ جو تم کو راستہ بتاتا ہے خشکی اور دریا کے اندھیروں میں اور بھیجتا ہے خوشخبری لانے والی ہوائیں، اپنی رحمت سے پہلے (بارش سے پہلے) کیا ہے کوئی دوسرا کارساز جو اللہ کے ساتھ شریک ہو؟ اللہ بالاتر ہے ان سے جن کو یہ لوگ اُس کا شریک ٹھہراتے ہیں)

یعنی کارساز وہی ہو سکتا ہے جو صحراؤں اور دریاؤں میں ستاروں کے ذریعے راستہ بتاتا ہو، جس نے اِن ستاروں کی رفتار کو مخصوص اور متوازن مقدار میں قائم رکھا ہے اور جو ہوائیں چلاتا ہے، جو بارش کی آمد کی خوشخبری لاتی ہیں۔

اللہ کی قوت و قدرت خود ساختہ کارسازوں سے بہت برتر اور بلند ہے۔ وُہی یہ نظام قائم رکھے ہوئے ہے، مشرکین کے خیالی اور تصوّراتی خدا مشکل کشائی کیا کریں گے، وہ تو خود اپنے لئے پانی کا ایک قطرہ نہیں اُتار سکتے اور نہ ہوائیں چلا سکتے ہیں۔ اگر یہ دریا یا جنگل میں راستہ کھو بیٹھیں تو ستاروں کے بغیر راستہ تک معلوم نہیں کر سکتے۔ فقیر اور محتاج کو غنی اور قدیر کے ساتھ شریک کرنا ظلمِ عظیم ہے۔

الٰہ وہی ہو سکتا ہے جو زندگی دے سکتا ہو اور روزی رساں ہو

اَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قُلْ

هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ ٥ (النمل۔۶۴،پ۲۰)

(یا وہ جو ابتدا کرتا ہے پیدا کرنے کی، پھر اُسے دوبارہ بنائے گا اور وہ جو تمہیں روزی دیتا ہے آسمان اور زمین سے ۔کیا ہے کوئی اور کارساز جو اللہ کے ساتھ شریک ہو ؟ کہو اِن سے کہ لاؤ اپنی دلیل اگر تم سچے ہو۔)

یعنی الٰہ وہی ہو سکتا ہے جو ابتدا میں بھی کسی چیز کو پیدا کر سکتا ہو اور اُسے فنا کرنے کے بعد دوبارہ بھی پیدا کر سکتا ہو۔اور جو آسمان سے بارش برسا کر اور زمین سے اناج اور پھل اگا کر روزی دے سکتا ہو۔کیا اللہ کے سوا کوئی ایسا کارساز اور حاجت روا دکھا سکتے ہو جس نے یہ کام کیا ہو ؟ یا اب کر سکتا ہو ؟

سورۂ النمل کی اِن پانچ آیات میں اللہ کی الوہیّت وحاکمیّت اور کارسازی کے ثبوت میں جن عقلی دلائل وآیات کا ذکر ہوا ہے یہ وہ آفاقی نشانیاں ہیں کہ جن کو مشرکینِ عرب بھی مانتے تھے ۔یہی وہ بُرھان یعنی قطعی اور ناقابلِ تردید دلیل ہے جس کا مطالبہ مشرکین سے کیا گیا تھا، یعنی اگر تم سچے ہو تو اپنے کارسازوں کی قدرت کی ایسی کوئی نشانی پیش کرو !

الٰہ وہی ہو سکتا ہے جو بغیر اسباب کے پکارنے والے کی پکار سُن سکتا ہو

وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ إِلٰهًا اٰخَرَ ۘ لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهٗ ۚ لَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ٥ (القصص۔۸۸۔پ۲۰)

(اور مت پکار اللہ کے ساتھ دوسرے کو۔نہیں ہے کوئی کارساز اُس کے سوا، ہر چیز فنا ہونے والی ہے سوائے اُس کی ذات کے، اُسی کا اختیار ہے اور اُسی کے پاس تم سب لوٹائے جاؤ گے)

معلوم ہوا کہ اِلٰہ وہی ہو سکتا ہے جو اسباب کے بغیر پکار نے والے کی پکار سن سکتا

ہو، دعائیں قبول کر سکتا ہو، جو ہمیشہ زندہ ہو، اس پر موت نہ آتی ہو، جس کے ہاتھ میں نفع نقصان، موت و حیات، عزّت و ذلّت اور جنت و دوزخ دینے کا اختیار ہو۔ اور جس کے پاس سب کو حساب کے لئے پیش ہونا ہو۔ یہ وہ صفات ہیں جن سے صرف اللہ کی ذات ہی متصف ہے۔ آسمان اور زمین میں کوئی بھی اِن صفات سے متّصف نہیں ہے۔ یقیناً اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو حکم دیا گیا ہے کہ غیبی مدد کے لئے اللہ کے سوا کسی اور کو نہ پکارو۔ اس لئے کہ دوسرا کوئی الٰہ نہیں ہے جو تمہاری پکار سن کر تکوینی فیصلہ کر سکے۔ صرف اللہ کو پکارو۔

وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ۝

(المؤمنون - ۱۱۷ - پ ۱۸)

(اور جو کوئی بھی پکارتا ہے اللہ کے ساتھ دوسرے کو جس کے کارساز ہونے پر اُس کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے، تو یقیناً اُس کا حساب اللہ کے پاس ہے، بے شک کامیاب نہیں ہو سکتے کافر لوگ)

اِلٰہ وہی ہو سکتا ہے جو غیبی مدد کے لئے پکارنے والے کی پکار کو سن بھی سکتا ہو اور مدد بھی کر سکتا ہو اور یہ صرف اللہ کی ذات ہے۔ خیالی، فرضی، تصوّراتی اور خود ساختہ کارسازوں کو پکارنا وہ کفر اور شرک ہے جس پر کوئی دلیل نہیں ہے اور ایسے لوگوں کی خبر اللہ تعالیٰ قیامت میں لے گا، اُس کے پاس اُن کا مکمل ریکارڈ موجود ہے، جس میں اُن کی ساری مشرکانہ آوازوں اور دعاؤں کا حساب بھی موجود ہے۔ معلوم ہوا کہ غیر اللہ کو غیبی اور مافوق الأسباب طاقت کا مالک اور مختارِ کل سمجھ کر غیبی مدد کے لئے پکارنا کفر ہے اور ایسے لوگ اگر بغیر توبہ اور اصلاحِ عقیدہ کے مر گئے تو اُن کو نجات اور فلاح نہیں مل سکتی۔ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ -

ایسے ہی لوگوں کے بارے میں سورۂ احقاف میں ارشادِ خداوندی ہے :

اور کون بڑا گمراہ ہے اُس شخص سے جو پکارتا ہے اُن کو جو قیامت تک اُس

کی پکار نہیں سن سکتے۔ اور وہ اُس کی پکار سے بے خبر ہیں اور جس وقت
سب لوگ اکھٹے کیے جائیں گے تو وہ اُن کے دشمن ہو جائیں گے اور اُن
کی عبادت ہی سے انکار کریں گے "۔

جب اُن کے پاس غیبی طاقت نہیں ہے، تو کیسے سنیں گے اور کس طرح امداد کریں گے
اُن کو خبر ہی نہیں ہے کہ ہم کو کوئی پکارتا ہے۔ قیامت کے روز یہ پکارنے والوں اور پوچنے
والوں سے بیزار ہو جائیں گے، اُن کے خلاف سرکاری گواہ بن جائیں گے، جیسا کہ حضرت عیسیٰؑ
کے بارے میں سورۃ النِّساء میں آیا ہے کہ وہ کہیں گے "مَیں نے تو ان کو توحید کی دعوت
دی تھی، میرے بعد اِنہوں نے از خود مجھے خدا یا خدا کا بیٹا قرار دیا تھا۔ مَیں اِن سے بیزار
ہوں "۔

مولانا سید محمد نعیمؒ الدین صاحب مراد آبادی اِس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ " مراد
بُت ہیں۔ وہ چونکہ بے جان جماد ہیں اس لئے پکار نہیں سُن سکتے اور قیامت کے روز
یہی بُت اپنے پجاریوں کے دشمن ہوں گے "۔

سوال یہ ہے کہ مشرکینِ عرب نے بُت کن لوگوں کے نام پہ بنائے تھے؟ بخاری
شریف میں حضرت ابنِ عبّاسؓ کے قول میں اس سوال کا جواب موجود ہے کہ " وَدّ۔ سواع۔
یغوث، یعوق اور نسر نیک بندوں اور بزرگوں کے نام تھے۔ مشرکینِ عرب نے انہی
بزرگوں کے بت بنا کر اُنہیں پوجنا اور پکارنا شروع کر دیا تھا۔ یہ بت تو صرف قبلۂ توجہ تھے
حقیقت میں وہ لوگ اُنہی بزرگوں کو کارساز سمجھ کر پکارا کرتے تھے۔ اس بحث کی مزید تفصیل
بعد میں بیان ہو گی، انشاء اللہ، یہاں تو صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ غیر اللہ کو پکارنے والوں
کا عقیدہ اور عمل بہر حال خلافِ اسلام ہے۔ ان لوگوں کو سورۃ المؤمنون میں کافر اور سورت
احقاف میں بدترین گمراہ کہا گیا ہے۔ اس لئے کہ اُن کی یہ پکار اور دعا اِس عقیدہ پہ مبنی
ہوتی ہے کہ جنہیں پکارا جاتا ہے وہ غیبی اور تکوینی طاقت کے مالک ہیں اور بلاشبہ ایسا عقیدہ
شرک ہے۔

خرقِ عادت کے طور پہ اگر اللہ تعالیٰ کسی کو کسی کی آواز کسی وقت سنا بھی دے جیسا کہ

بدر کے کنویں میں پھینکے گئے سرداران کفار کو اللہ تعالیٰ نے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سنادی تھی، تو اللہ کے سنانے پہ وہ سن تو لیں گے، لیکن جواب نہیں دے سکتے ۔ اور نہ کسی کی امداد کر سکتے ہیں ۔ وہ نہ سننے میں اختیار رکھتے ہیں اور نہ مدد کرنے کا ، تو ان کو پکارنا بے کار ہے ۔

الٰہ وہی ہو سکتا ہے جو خالق ہو، زندہ ہو اور جس کو قیام قیامت کا علم ہو

وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْئًا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ۝ اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ ۚ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ۝ اِلٰـهُكُمْ اِلٰـهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ۝ (النحل ۔۲۰-۲۱-۲۲-پ۱۴)

(اور جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں اللہ کے سوا وہ کچھ بھی پیدا نہیں کر سکتے اور خود پیدا کئے ہوئے ہیں ۔ مُردے ہیں زندہ نہیں ہیں اور نہیں جانتے کہ کب اٹھائے جائیں گے ۔ کارساز تمہارا ایک ہی ہے ۔ مگر جو لوگ نہیں مانتے آخرت کو ، اُن کے دل توحید کو بھی نہیں مانتے، اور وہ تکبّر اور غرور کرتے ہیں)

سیاقِ کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ الٰہ اور کارساز و مشکل کشا وہی ہو سکتا ہے جو خالق ہو مخلوق نہ ہو ، زندہ ہو مردہ نہ ہو اور جسے یہ علم ہو کہ مردے کب قبروں سے اٹھائے جائیں گے ۔ اور یہ اوصاف چونکہ صرف اللہ کو حاصل ہیں اس لئے ان صفاتِ الوہیت کے ذکر کے بعد فرمایا کہ تمہارا کارساز ایک ہی ہے ۔ دوسروں کو یہ مقام حاصل نہیں ہیں اس لئے اُنہیں غیبی مدد کے لئے پکارنا بے کار ہے ۔ لیکن مشرکین چونکہ فکرِ آخرت اور عقیدۂ آخرت نہیں رکھتے اس لئے تکبّر اور غرورِ نفس میں مبتلا ہیں اور توحید کے دلائل میں غور و فکر کرتے ہی نہیں ہیں، ورنہ یہ تو ایک واضح اور مسلّمہ حقیقت ہے کہ جو خود دوسرے کا پیدا کردہ ہو، بے جان ہو

اور اُسے یہ بھی معلوم نہ ہو کہ میں کب قبر سے اٹھایا جاؤں گا، وہ مختارِ کل کیسے ہوسکتا ہے اور غیبی مدد کے لئے پکارنے والوں کی پکار کیسے سن سکتا ہے ؟

" مردے ہیں زندہ نہیں ہیں اور نہیں جانتے کہ کب اٹھائے جائیں گے" قرآن کے یہ الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ اس آیت میں جن کا ذکر ہے وہ اصحابِ قبور ہیں، یعنی مراد وہ اولیاء، شہداء اور صالحین ہیں جن کو قبر پرست اور اولیاء پرست لوگ فریادرس، مشکل کشا، غریب نواز، گنج بخش، داتا، غوث و قطب اور نہ معلوم کیا کیا قرار دے کر اپنی حاجت روائی کے لئے پکارنا شروع کر دیتے ہیں۔ انہی قبر پرستوں کے بارے میں حضرت رسول اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

اللھم لا تجعل قبری وثنا یعبد اشتد غضب اللہ علی قوم اتخذوا قبور انبیاء ھم مساجد ا۔

(موطا امام مالک)

(اے اللہ میری قبر کو بت نہ بنانا جس کی پوجا کی جائے۔ اللہ کا شدید قہر و غضب ہے اُن لوگوں پر جو اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بناتے ہیں)

نظمِ کائنات کی بنیاد توحید ہے

لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا فَسُبْحَانَ اللَّهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُونَ ۝ (الانبیاء - ۲۲ - پ ۱۷)

(اگر ہوتے زمین و آسمان میں اور کارساز اور مختارِ کل سوائے اللہ کے، تو دونوں خراب ہو جاتے۔ پس پاک ہے اللہ جو عرش کا مالک ہے ان باتوں سے جو یہ بناتے ہیں۔)

مَا اتَّخَذَ اللَّهُ مِن وَلَدٍ وَمَا كَانَ مَعَهُ مِنْ إِلَٰهٍ إِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ إِلَٰهٍ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلَىٰ

بَعْضٍ ط سُبْحَانَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ہ عَالِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ہ

(المؤمنون ـ ۹۱ ـ ۹۲ ـ پ ۱۸)

(اللہ نے نہ کسی کو بیٹا بنایا ہے اور نہ اُس کے ساتھ کوئی دوسرا حاکم اور مختارِ کل ہے، اگر ایسا ہوتا تو ہر حاکم اپنی بنائی ہوئی چیزوں کو لے کر الگ ہو جاتا اور ہر ایک دوسرے پر چڑھ دوڑتا۔ اللہ پاک ہے ان باتوں سے جو یہ بناتے ہیں۔ جو جاننے والا ہے تمام پوشیدہ اور کھلی چیزوں کا۔ پس بہت بلند ہے اللہ اُن سے جن کو یہ اُس کا شریک ٹھہراتے ہیں)

"تعدُّدِ آلِہہ" کے عقلاً ناممکن اور ممتنع ہونے پر یہ نہایت ہی واضح اور پختہ دلیل ہے جو قرآنِ کریم نے اپنے مخصوص، عام فہم انداز میں دی ہے۔ اِس دلیل کی توجیہہ وتشریح یہ ہے:

اِلٰہ جیسا کہ بیان ہو چکا ہے، اُس ذات کو کہا جاتا ہے جو مختارِ کل ہو، قادرِ مطلق ہو، ہر عیب اور احتیاج سے پاک ہو۔ نہ عاجز ہو نہ مغلوب، نہ کسی دوسرے سے دبے اور نہ کوئی اُس کے کام میں رکاوٹ پیدا کر سکے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی مخلوق میں تصرّف کرتا ہو۔ تخلیق بھی اُسی کی ہو اور کل کائنات میں تدبیر بھی اُسی کی کارفرما ہو، یعنی وہ نظمِ کائنات سے لاتعلق، بیگانہ اور معطّل نہ ہو۔ قیُّوم اور قیّم ہو اور سارے عالم کا وجود اور نظام اُسی کے ہاتھ میں ہو۔

اب اگر آسمان وزمین میں ایک سے زائد مختارِ کل اور کارساز ہوں تو درجِ ذیل صورتوں میں سے جو بھی صورت فرض کی جائے عقلاً ناممکن ہوگی۔

۱۔ اگر ان میں سے ایک ہی تنہا عالم کا سارا انتظام چلا رہا ہے، تو اس صورت میں باقی آلِہہ بیکار اور معطّل ٹھہریں گے اور یوں جو بیکار ہوں وہ عقلاً اِلٰہ، مختارِ کل اور کارساز نہیں ہو سکتے۔ اس لئے کہ کارسازی کام کرنے اور تصرف کرنے کا نام ہے۔ بیکاری کو تو کارسازی نہیں کہا جا سکتا۔ بے کار خدا سے نہ کوئی ڈرتا ہے اور نہ اُس سے کچھ مانگتا ہے، تو وہ پھر اِلٰہ کیسے ہو سکتا ہے۔ جب نہ وہ کسی کو نفع پہنچاتا ہے نہ ضرر، بلکہ سرے سے کام

ہی نہیں کرتا، معطّل بیٹھا ہے، تو اس کی پوجا کرنا، اُسے مدد کے لئے پکارنا، اُس کے لئے نذر و نیاز دینا اور اُس کی تعظیم کے لئے سجدے کرنا عقلاً ایک لغو کام ہے۔

۲۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ سب آلہٰہ باہمی اتفاق سے کام کرتے ہیں، تو اس صورت میں سب ایک دوسرے کے محتاج ہوں گے۔ اس لئے کہ اتفاق باہمی تعاون ہی کا دوسرا نام ہے اور باہمی تعاون باہمی احتیاج کو کہا جاتا ہے۔ اتفاق و تعاون کی ضرورت اُسی وقت پیدا ہوتی ہے جب کوئی بھی تنہا کائنات کی تخلیق اور تدبیر نہ کر سکتا ہو، بلکہ سب ایک دوسرے کے محتاج ہوں اور جب ہر ایک دوسرے سے مل کر ہی کوئی کام کر سکتا ہے اکیلا نہیں کر سکتا، تو اُن میں سے کوئی بھی اِلٰہ اور مختارِ کل و کارساز کہلانے کا مستحق نہ ہوا۔ اس لئے کہ مختارِ کل وہی ہو سکتا ہے جو کسی دوسرے کے تعاون کا محتاج نہ ہو۔ حاصلِ کلام یہ کہ اتفاق و اتحاد مستلزم ہے احتیاج کو اور احتیاج اُلوہیت کے منافی ہے۔

۳۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ان کئی خداؤں کے درمیان تصرّفات اور تدبیرِ عالَم میں ایک دوسرے سے اختلاف ہے، تو اس صورتِ مفروضہ میں وہ ایک دوسرے کا مقابلہ کریں گے۔ اور مقابلے میں اگر ایک اِلٰہ دوسروں پہ غالب آگیا تو باقی مختارِ کل اور قادرِ مطلق نہ ٹھہرے۔ اس لئے کہ مغلوب اور عاجز و کمزور ثابت ہونے والا مختارِ کل اور کارساز نہیں ہو سکتا۔ اور اگر سب مساوی اور متوازی طاقت سے آپس میں لڑتے ہوں، تو خداؤں کی اس رسّاکشی کا نتیجہ اوّل تو یہی نکلے گا کہ اس عالَم کی کوئی بھی چیز باقی نہ رہ سکے گی۔ اور تمام موجود چیزیں اس محاذ آرائی کی وجہ سے خراب اور تباہ و برباد ہو جائیں گی۔ اختلاف، باہمی جنگ اور رسّاکشی کا منطقی نتیجہ فساد ہی کی شکل میں نکلتا ہے، لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ زمین و آسمان کا نظم مکمل اعتدال و توازن کے ساتھ ابتداءِ خلق سے لے کر آج تک قائم ہے۔ پس معلوم ہوا کہ عالَم کا خالق، مدبّر اور منتظم ایک ہی ہے۔ نظامِ کائنات کا اعتدال و توازن وحدتِ خالق کی قطعی دلیل ہے۔ دو مختار بادشاہ ایک اقلیم میں نہیں سما سکتے، تو دو قادرِ مطلق

خدا ایک عالم میں کیسے شریک ہو سکتے ہیں !

۴۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ان متعدد خداؤں میں ایک بڑا ہے اور باقی سب چھوٹے، جو بڑے "اِلٰـہُ الاٰلِھَـۃ اور رَبُّ الاَرْبَاب کی ماتحتی میں کارسازی اور حاجت روائی" کا کام کرتے ہیں۔ جیسا کہ ہر دور کے مشرکین کا خیال رہا ہے اور موجودہ دور کے اولیاء پرستوں اور قبر پرستوں کا بھی یہی خیال ہے، تو اس صورت کے باطل اور ممتنع ہونے کی دو دلیلیں ہیں ایک تو یہ ہے کہ جو ماتحت ہو اور تصرفات و اختیارات میں دوسرے کا محتاج ہو وہ مختارِ کل اور کارساز نہیں ہو سکتا۔ کارساز تو وہی ہو سکتا ہے جو خود مختار ہو۔ غالب ہو اور اپنے کام میں کسی کے سامنے جواب دہ نہ ہو۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ بڑے خدا نے جب اپنے لئے ماتحت خدا مقرر کئے ہیں، تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ تنہا عالم کا نظام نہیں چلا سکتا ورنہ اُسے ماتحتوں کی ضرورت نہ پڑتی۔ اور یہ اُس کے ناقص ہونے کا ثبوت ہے۔

دنیا کے برائے نام بادشاہ چونکہ مختارِ کل اور قادرِ مطلق نہیں ہوتے اس لئے اُن کو ماتحت افسروں کی ضرورت پڑتی ہے، لیکن قادرِ مطلق خدا کو اس نوع کے ماتحت خداؤں کی ضرورت نہیں ہو سکتی۔

اِلٰہ کا جو مفہوم گذشتہ بحث میں بیان ہوا ہے اور مذکورہ آیاتِ قرآنیہ سے اِس مسئلے کی جو حقیقت کھل کر سامنے آئی ہے وہ یہ ہے کہ اُلوہیت اور اقتدارِ اعلیٰ لازم و ملزوم ہیں۔ جو مختارِ کل، متصرف، ما فوق الاسباب، کارساز، فریادرس اور حاجت روا ہو، یعنی غیبی اور ما فوق الفطرت طاقت کا مالک ہو، وہی اِلٰہ برحق ہو سکتا ہے اور چونکہ یہ صفات اللہ کے سوا کسی میں بھی نہیں ہیں اور نہ اللہ نے کسی کو اپنے ساتھ اُلوہیت کی ان صفات میں شریک ٹھہرایا ہے، اس لئے مختارِ کل اور کارسازِ حقیقی صرف اللہ کی ذات ہے۔

حیرت بھی ہوتی ہے اور افسوس بھی کہ اپنے آپ کو صحیح العقیدہ مسلمان کہنے والوں میں سے بھی بعض لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی مختارِ کل اور

متصرف علی الاطلاق ہیں، اور نہ صرف رسول اللہؐ بلکہ بہت سے اولیاء بھی سیاہ وسفید کے مختار بنا دیے جاتے ہیں۔ مشہور عالمِ دین مولانا ابو العلاء محمد امجد علی صاحب اعظمی نے اپنی مشہور کتاب "بہارِ شریعت" کے حصۂ اوّل میں وہ عقائد بیان کئے ہیں جن کو وہ سُنّیوں کے سچے اور قابلِ حفظ معتقدات سمجھتے ہیں۔ اس کتاب میں نبوّت اور ولایت سے متعلق جو عقائد بیان کئے گئے ہیں اُن میں سے چند ایک ملاحظہ کیجئے :

غلط عقائد

"عقیدہ : حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اللہ عزّ وجلّ کے نائبِ مطلق ہیں، تمام جہان حضورؐ کے تحتِ تصرّف کر دیا گیا جو چاہیں کریں، جسے جو چاہیں دیں جس سے جو چاہیں واپس لیں۔ تمام جہان میں اُن کے حکم پھیرنے والا کوئی نہیں۔ تمام جہان اُن کا محکوم ہے اور وہ اپنے رب کے سوا کسی کے محکوم نہیں تمام آدمیوں کے مالک ہیں جو اُنہیں اپنا مالک نہ جانے، حلاوتِ سنّت سے محروم ہے۔ تمام زمین اُن کی مِلک ہے، تمام جنّت اُن کی جاگیر ہے۔ ملکوت السموات والارض حضورؐ کے زیرِ فرمان، جنّت و نار کی کنجیاں دستِ اقدس میں دے دی گئیں، رزق و خیر اور ہر قسم کی عطائیں حضورؐ ہی کے دربار سے تقسیم ہوتی ہیں، دنیا و آخرت حضورؐ کی عطا کا ایک حصّہ ہے"[1]۔

اِسی طرح ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں :

"میری تقدیر بری ہو تو بھلی کر دے کہ ہے
محو و اثبات کے دفتر پہ کروڑا تیرا"[2]

---

[1] بہارِ شریعت۔ حصّہ اوّل۔ ص ۱۸۔

[2] حدائقِ بخشش۔ حصّہ اوّل، وصل اوّل۔ ص ۳۔

اِس شعر میں ـــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لوحِ محفوظ میں محو واثبات، یعنی تقدیر بدلنے کا مجاز اور مختار کہا گیا ہے۔

عقیدہ: اولیائے کرام کو اللہ عزّ وجلّ نے بڑی طاقت دی ہے۔ ان میں جو اصحابِ خدمت ہیں اُن کو تصرّف کا اختیار دیا جاتا ہے، سیاہ وسفید کے مختار بنا دیے جاتے ہیں، یہ حضرات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سچّے نائب ہیں، اُن کو اختیارات و تصرّفات حضورؐ کی نیابت میں ملتے ہیں، علومِ غیبیّہ اُن پر منکشف ہوتے ہیں۔ اُن میں بہت کو ما کان وما یکون اور تمام لوحِ محفوظ پر اطلاع دیتے ہیں، مگر یہ سب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے۔ بے وساطتِ رسولؐ کوئی غیر نبی کسی غیب پر مطلع نہیں ہو سکتا۔[1]

شیخ عبد القادر جیلانیؒ کے بارے میں یوں کہا گیا ہے

" بندہ قادر کا بھی، قادر بھی ہے عبد القادر"
سرِّ باطن بھی ہے ظاہر بھی ہے عبد القادر"
ذی تصرّف بھی ہے ماذُون بھی مختار بھی ہے
کارِ عالم کا مدبّر بھی ہے عبد القادر"[2]

گذشتہ صفحات میں قرآن وسنّت کی قطعی الدلالت نصوص کو پڑھیے اور اِن غلط عقائد پر غور فرمائیے اور فیصلہ کیجئے کہ یہ کہاں تک درست ہیں!

---

[1] بہارِ شریعت، حصّہ اوّل، ص ۶۳۔

[2] حدائقِ بخشش۔ حصّہ اوّل، ص ۲۷۔

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے ملفوظات

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ (متوفی ۵۶۱ھ) توحید و سنّت کے داعی اور اہلِ سنّت والجماعت کے وہ عظیم امام تھے جن کے ارشادات و ملفوظات پڑھنے سے ایمان تازہ ہوتا اور عقیدۂ توحید میں رسوخ اور پختگی آتی ہے، لیکن افسوس ہے کہ قبر پرستوں اور پیر پرستوں نے اُن کی جانب ایسے بے سروپا افسانے اور مشرکانہ اشعار و اقوال منسوب کر دیے ہیں جو ایک عام مومن کی شان کے بھی مناسب نہیں ہیں۔ مثلاً "قصیدۂ غوثیہ" اور "وظیفۂ قادریہ" کے نام سے کچھ اشعار آپ کی جانب منسوب کئے گئے ہیں۔ مولانا احمد رضا خان بریلوی نے اپنے نعتیہ کلام میں بھی یہ اشعار نقل کئے ہیں۔ بطور نمونہ چند اقتباسات ملاحظہ کیجئے:

وَوَلَّانِیْ عَلَی الْاَقْطَابِ جَمْعًا
فَحُکْمِیْ نَافِذٌ فِیْ کُلِّ حَالٖ

(اور اللہ نے مجھے سارے قطبوں پہ والی بنایا ہے۔ پس میرا حکم ہر حال میں نافذ ہے)

طُبُوْلِیْ فِی السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ دُقَّتْ
بِلَادُ اللّٰہِ مُلْکِیْ تَحْتَ حُکْمِیْ

(میری ولایت کے ڈھول آسمان و زمین میں بجائے جائیں گے۔ خدا کی زمین میری بادشاہی اور میرے حکم کے نیچے ہے[1])

---

[1] حدائقِ بخشش۔ حصہ دوم۔ ص ۲۰-۲۲-۲۳۔ از مولانا احمد رضا خان۔

اس قسم کے من گھڑت اقوال کے مقابلے میں جو آپ سے منسوب کیے جاتے ہیں امام موصوف کے چند ثابت شدہ اور سچے ملفوظات وارشادات درج ذیل ہیں:

۱- یقطع ان لا فاعل الا اللّٰہ
ولا محرّک ولا مسکن الا اللّٰہ
ولا خیر ولا شر ولا ضر ولا نفع
ولا عطاء ولا منع ولا فتح ولا غلق
ولا موت ولا حیٰوۃ ولا عِزّ ولا ذِلّ
الا بید اللّٰہ[1]

(مُوحّد کا قطعی عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ فاعلِ حقیقی کوئی نہیں ہے، سوائے اللہ کے ــ حرکت میں لانے والا اور حرکت روکنے والا کوئی نہیں ہے، سوائے اللہ کے ــ خیر و شر، نفع ونقصان، کچھ دینا اور روکنا، کھولنا اور باندھنا موت اور زندگی اور عزت و ذلت اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے)

۲- حضرت شیخ عبدالقادرؒ کے صاحبزادے حضرت شیخ عبدالوہابؒ نے آپ کے مرضِ موت میں درخواست کی کہ مجھے ایسی وصیت کیجیے جس پہ میں آپ کے بعد عمل کروں تو اُنھوں نے یہ وصیت فرمائی:

علیك بتقوی اللّٰہ عزّ وجلّ
ولا تخف احدًا سوی اللّٰہ
ولا ترج احدًا سوی اللّٰہ
وَکِلِ الحوائج الی اللّٰہ عزّوجلّ
ولا تعتمد الا علیہ واطلبھا جمیعاً منہ تعالیٰ
ولا تتّکل باحدٍ غیر اللّٰہ سبحانہ

---

[1] فتوح الغیب- مقالہ ثالثہ۔

التوحید ۔ التوحید جماع الکل[1]

(اللہ ہی کے خوف سے برائیوں سے بچو۔ اللہ کے سوا نہ کسی سے ڈرو اور نہ اللہ کے سوا کسی سے کوئی توقع رکھو اور اپنی تمام حاجتیں اللہ کے سپرد کرو۔ اللہ کے سوا کسی کا سہارا نہ لو۔ حاجات اُسی سے طلب کرو۔ اللہ کے سوا کسی پر توکل نہ کرو اور توحید کے عقیدے پر قائم رہو۔ توحید پر سب کا اجماع ہے۔ یا توحید تمام احکام شرعیہ کی بنیاد ہے)

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اپنی دوسری کتاب "غنیۃ الطالبین" میں لکھتے ہیں:

لا تطلب لنفسك ناصرا غیر اللہ ولرزقك خازناً غیرہ ۔

(اپنے لئے اللہ کے علاوہ دوسرے مددگار کی تلاش نہ کرو اور اپنے رزق کے لئے اُس کے علاوہ دوسرے خازن کی تلاش نہ کرو۔)

قصیدۂ دعائیہ

"قصیدہ غوثیہ" اور "وظیفۂ قادریّہ" کے جعلی اشعار کے مقابلے میں توحیدِ باری تعالیٰ کے مضمون پر مشتمل "قصیدۂ دعائیہ" اور اصلی "وظیفۂ قادریہ" پیشِ خدمت ہے۔ اندازِ بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ۱۶ اشعار پر مشتمل اس قصیدے کی نسبت شیخ موصوفؒ کی جانب صحیح ہے۔ اس قصیدے کا مضمون فتوح الغیب کے مقالات سے ملتا جلتا ہے۔ اگر یہ نسبت صحیح نہ بھی ہو پھر بھی ان اشعار کا نقل کرنا فائدے سے خالی نہیں ہے۔ ان کے پڑھنے سے وجدِ ایمانی، شوق اور درد و سوز کی مخصوص کیفیات قلب میں پیدا ہوتی ہیں۔ مشائخ

---

[1] تکملہ، فتوح الغیب، فی ذکر وصایا ۸۔

نے لکھا ہے کہ اس قصیدے کے پڑھنے اور اس اندازِ دعا سے حاجات کے پورے ہونے کا بار بار تجربہ کیا گیا ہے۔ قصیدہ ملاحظہ ہو ؎

١- یا من تحل بذکرہٖ عقد النوائبُ والشدائدُ

(اے وہ خدا جس کی یاد سے حوادث اور مصائب کی گرہیں کھلتی ہیں۔)

٢- یا من الیہ المشتکی والیہ امر الخلق عائدُ

(اے وہ خدا جس کے سامنے فریاد کی جاتی ہے اور مخلوق کے سارے کام اسی کی جانب لوٹتے ہیں۔)

٣- یا حیُّ یا قیّومُ یا صمد تنزہ عن مضادد

(اے وہ خدا جو ہمیشہ زندہ ہے اور مدبّر ہے۔ بے نیاز ہے اور مدمقابل سے پاک ہے۔)

٤- انت العلیم بما بلیتُ بہ وانت علیہ شاھد

(تو ہی جانتا ہے اُس مصیبت کو جس میں۔ مَیں گرفتار ہو گیا ہوں اور تو ہی اس پر خبردار ہے۔)

٥- انت المنزہ یا مبدیعَ الخلق عن ولد ووالد

(تو پاک ہے، اے مخلوق کے پیدا کرنے والے۔ اولاد سے بھی اور باپ سے بھی۔)

٦- انت الرقیب علی العبادِ وانت فی الملکوت واحد

(تو ہی اپنے بندوں کا نگہبان ہے۔ اور تو اپنی بادشاہی میں تنہا ہے)

٧- انت المعز لمن اطاعکَ والمذل لکل جاحد

(تو اطاعت کرنے والوں کو عزت دیتا ہے۔ اور نہ ماننے والوں کو ذلّت دیتا ہے۔)

٨- انی دعوتکَ والھمومُ جیوشھا قلبی تطاردُ

(میں نے تجھے اس حالت میں پکارا ہے کہ ـــ مصیبتوں کے لشکروں نے میرے دل پر حملہ کر رکھا ہے۔)

۹۔ فرج بحول لك كربتي يا من له حسن العوائد

(اپنی قوت سے میری پریشانی کا ازالہ فرمادیجئے ـــ اے وہ خدا جس کے ہاتھ میں اچھے نتائج ہیں)

۱۰۔ انت الميسر والمسبّب والمسهّل والمساعد

(تو ہی آسان کرنے والا ہے اور تو ہی اسباب فراہم کرنے والا ہے ـــ تو ہی سہولت دیتا ہے اور تو ہی مددگار ہے)

۱۱۔ يسر لنا فرجاً قريبا يا الٰهي لا تباعد

(جلد آسان کر دے میری مشکل کو ـــ اے میرے خدا اس آسانی کو مؤخر نہ فرما)

۱۲۔ فخفي لطفك يستعان به على الزمن المعاند

(تیری مہربانی بے انتہا ہے، مدد مانگی جاتی ہے ـــ جس کے وسیلے سے دورِ حاضر کے حاسدوں کے مقابلے میں)

کن راحمی فلقد ایست من الاقارب والاباعد

(تو ہی مجھ پر رحم فرما کہ میں تو ـــ اپنوں اور بیگانوں سے مایوس ہو چکا ہوں)

۱۴۔ وعلى العدیٰ کن ناصری ولا تشمتن بی الحواسد

(دشمنوں کے مقابلے میں تو ہی میری مدد فرما ـــ اور حاسدوں کو میری پریشانیوں سے خوش نہ فرما)

۱۵۔ ثم الصلوة على النبی والہ الغر الاماجد

(اس کے بعد میری دعا یہ ہے کہ اپنی رحمتیں ـــ نبی کریمؐ اور آپؐ کی بلند مرتبہ آل پر نازل فرما)

۱۶۔ ما جن ليل او سجیٰ اوخر للرحمن ساجد[1]

(جب تک کہ رات آتی ہے اور چھا جاتی ہے ـــ اور جب تک رحمان کے لئے کوئی سجدہ کرنے والا موجود ہے)

---

[1] حاشیہ بہجۃ الاسرار۔ مطبوعہ مصر، ۱۳۳۰ھ، ص ۲۳۲۔

سبحان اللہ، ایک ایک شعر اور ایک ایک لفظ سے توحید خداوندی اور اللہ کی کبریائی و صمدیت ثابت ہوتی ہے اور ہر لفظ سے اپنی عبدیت اور فقر و ناتوانی کا اعتراف کیا جا رہا ہے۔

— يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللهِ وَاللهُ هُوَ الْغَنِيُّ —

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی تحقیق

وجماع الامر ان الشرك نوعان ۔ شرك في الربوبية بان يجعل لغيره معه تدبير .... فبيّن انهم لا يملكون مثقال ذرة استقلالاً و لا يشركونه في شيئ من ذالك ولا يعينونه على ملكه ــ وشرك في الالوهية بان يدعو غيره دعاء عبادة او دعاء مسئلة[1]

(خلاصہ کلام اور جامع بات یہ ہے کہ شرک کی دو قسمیں ہیں : ایک ہے "شرك في الربوبية" کہ اللہ کے ساتھ کسی اور کو کائنات کی تدبیر اور تصرف و پرورش میں شریک کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے واضح طور پہ فرما دیا ہے کہ مشرکین کے یہ خود ساختہ خدا نہ تو ذاتی طور پہ کسی چیز کا ذرہ برابر اختیار رکھتے ہیں، نہ اُس کے ساتھ شریک ہیں اور نہ ہی اس کی بادشاہی اور حکومت میں اُس کے مددگار رہیں اور دوسری قسم ہے "شرك في الالوهية" : وہ یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی غیر کو عبادت کے طور پہ یا غیبی مدد کے لیے پکارا جائے)

حافظ ابن قیمؒ کی تحقیق

۱۔ والشرك فاحذره فشرك ظاهر
ذا القسم ليس بقابل الغفران

---

[1] اقتضاء الصراط المستقیم طبع ۱۹۵۰ء ص ۳۵۷۔

۲- وهو اتخاذ الند للرحمٰن أ
يًّا كان من حجر ومن انسان

۳- يدعوه او يرجوه ثم يخافه
ويحبُّه كمحبة الديان[2]

(شرک سے بچو! ایک قسم کا شرک بالکل کھلا شرک ہے، یہ قسم بخشے جانے کے قابل نہیں ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا کے ساتھ کسی اور کو شریک بنا دیا جائے، خواہ وہ پتھر ہو یا انسان۔ اس طرح کہ مصیبت کے وقت اُسے مدد کے لیے پکارا جائے یا اس سے نفع پہنچانے کی امید کی جائے یا غیبی طور پر ضرر پہنچانے کا خوف کیا جائے یا اس کے ساتھ اللہ کی طرح محبت کی جائے)

شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی کی تحقیق (متوفی ۱۱۷۶ھ):

شاہ ولی اللہؒ اپنی معروف تصنیف" حجۃ اللہ البالغہ" میں توحید کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں "توحید کے چار بنیادی اور اساسی عقیدے ہیں:

(۱) واجب الوجود اور ازلی اور ابدی صرف اللہ کی ذات ہے (۲) عرش، آسمانوں، زمین اور تمام جواہر کا خالق اللہ ہے۔ ان دو عقیدوں سے نہ تو مشرکین عرب نے اختلاف کیا اور نہ یہود و نصاریٰ نے (۳) آسمانوں، زمین اور ان کے درمیان کی سب چیزوں کا مدبّر، متصرّف اور منتظم صرف اللہ تعالیٰ ہے (۴) عبادت اور پرستش کا مستحق صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ ان آخری دونوں عقیدوں میں باہمی تلازم ہے اور ان دونوں عقیدوں میں بہت سے گروہوں نے اختلاف کیا ہے[2]"

الفوز الکبیر فی اصول التفسیر میں لکھتے ہیں "شرک یہ ہے کہ خدا کی مخصوص صفات کو اُس کے سوا کسی اور کے لیے ثابت کیا جائے۔ مثلاً وہ تصرّف جو صرف ارادے سے کیا جاتا ہو جسے کُن فیکون سے تعبیر کیا جاتا ہے۔"

---

[1] "الكافية الشافية في الانتصار للفرقة الناجية" المعروف بقصيدة نونية۔ طبع هند ۱۳۰۲ھ، ص ۱۷۰۔

[2] حجة الله البالغة۔ القسم الاول۔ باب التوحيد۔

اللہ کے مختارِ کل ہونے کے بارے میں عربوں کا عقیدہ

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ
السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ
وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ط
فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ج فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ٥ (یونس-۳۱)

(ان سے پوچھو کون ہے جو تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے؟ یا کس کے اختیار میں ہیں تمہارے کان اور آنکھیں؟ اور کون بے جان میں سے جاندار اور جاندار میں سے بے جان کو نکالتا ہے؟ اور کون ہے جو تدبیر کرتا ہے ہر کام کی؟ وہ ضرور کہیں گے کہ یہ سب کچھ اللہ ہی کرتا ہے۔ کہو کہ پھر اُس سے ڈرتے کیوں نہیں ہو؟)

خالقیت کے باب کے آخر میں عربوں کے عقیدے سے متعلق اس مضمون کی متعدد آیات نقل کی گئی ہیں جن سے صاف طور پہ معلوم ہوتا ہے کہ مشرکینِ عرب جانتے تھے، مانتے تھے کہ عالم کا پیدا کرنے والا بھی خدا ہے، بارش برسانے والا اور رزق دینے والا بھی وہی ہے، اور سخت مایوسی اور پریشانی کے وقت غیبی مدد کرنے والا بھی وہی ہے۔ وہ اس بات کے بھی قائل تھے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی کو پکڑے تو کوئی بچا نہیں سکتا ہے۔ یعنی کارساز اور پناہ دہندہ صرف اللہ ہے۔

۵۷۰ء یا ۵۷۱ء میں جب یمن کا عیسائی گورنر "ابرھۃ الاشرم" ۶۰ ہزار فوج لے کر بیت اللہ کو ڈھانے کے لئے منیٰ اور مزدلفہ کی پہاڑیوں میں پہنچا اور قریش مکہ مقابلہ کرنے سے عاجز اور مادی امداد سے مایوس ہو گئے، تو اس سخت وقت میں انہوں نے بت خانوں کی طرف رجوع کرنے اور اپنے خداؤں کو پکارنے کے بجائے ایک اللہ ہی کو مدد کے لئے پکارا تھا۔ اُس وقت کے سردارِ قریش عبد المطلب اپنی قوم کی ایک جماعت کے ساتھ کعبے کے دروازے پہ حاضر ہوئے اور کعبے کا کُنڈا پکڑ کر یہ دعا کی تھی:

يارب لا ارجوا لهم سواكا
يارب فامنع منهم حماكا
إن عدو البيت من عاداكا
امنعهم ان يخربوا قراكا[1]

(اے میرے رب، تیرے سوا میں ان (دشمنوں) کے مقابلے میں کسی سے امید نہیں رکھتا ۔ اے میرے رب ان کے شر سے اپنے حرم کی حفاظت فرما ۔ اس گھر کا دشمن تیرا بھی دشمن ہے، اپنی بستی کی تباہی سے انہیں روک دے)

دوسری روایت میں عبدالمطلب کی دعا اس طرح نقل ہوئی ہے :

لاهم ان العبد يمنع
رحله فامنع حلالك
لا يغلبن صليبهم
ومحالهم غدواً محالك[2]

(اے اللہ! بندہ اپنے گھر کی حفاظت کرتا ہے، تو بھی اپنے حرم کے باشندوں کی حفاظت کر، اے اللہ! کل اُن کی صلیب اور اُن کی تدبیر تیری تدبیر پر غالب نہ آنے پائے)

---

[1] تفسیر ابن جریر ۔ سورۃ الفیل ۔ طبع ۱۹۵۴ء ۔ ج ۳۰، ص ۳۰۲ ۔
[2] سیرۃ ابنِ ھشام ۔ ج ۱، ص ۵۱، طبع مصر ۱۹۵۵ء ۔

تیرھواں باب

دانشورانِ عرب

قبل از نبوت دورِ جاہلیّت میں عربوں میں سے کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو بت پرستی اور دیگر رسوم شرکیہ کے مخالف تھے اور توحید وبعث بعد الموت کے قائل تھے اور عقل و دانش اور فطرتِ سلیمہ رکھتے تھے۔ علّامہ شہرستانیؒ (متوفی ۵۴۸ھ) نے الملل والنحل میں ان کا ذکر محصّلۃ العرب، یعنی" دانشورانِ عرب" کے عنوان سے کیا ہے۔ اُن میں سے بعض مشہور دانشوروں کے ملفوظات بڑے عبرت انگیز ہیں :

قسّ بن ساعدۃ الاِیادی :

یہ معد بن عدنان کی شاخ بنو اِیاد میں سے تھا۔ اس کی عمر کے بارے میں " بلوغ الارب" میں تین قول نقل ہوئے ہیں :

۱۔ " اُس نے ساتؔ سو سال عمر پائی، اور اس نے سمعان حواری کا زمانہ بھی پایا تھا۔"[۱]

۲۔ " ابو حاتم سجستانی کی کتاب المُعمّرین میں ہے کہ قس بن ساعدہ تین سو اسی (۳۸۰) سال تک زندہ رہا۔"[۲]

۳۔ " بہت سے اہلِ علم نے ذکر کیا ہے کہ قسّ چھ سو (۶۰۰) سال زندہ رہا۔"[۳]

---

[۱] بلوغ الارب، اردو ترجمہ، طبع مرکزی اردو بورڈ لاہور۔ ج ۳، ص ۱۵۸۔

[۲] ایضاً، ج ۳، ص ۱۶۰۔

[۳] ایضاً

حافظ ابنِ کثیرؒ نے المعجم الکبیر للطبرانی، دلائل النبوۃ للبیہقیؒ اور دلائل النبوۃ لابی نعیم الاصفہانیؒ کے حوالے سے حضرت ابن عباسؓ کی روایت نقل کی ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: میں قس کو نہیں بھول سکتا جبکہ وہ عکاظ کے میلے میں سُرخ اونٹ پر سوار تھا اور لوگوں سے خطاب کر رہا تھا۔ اِس خطاب میں اُس نے لوگوں سے کہا تھا:

ان للّٰہ دینا ھو احبُّ الیہ من دینکم الذی انتم علیہ۔

(یقیناً اللہ کا ایک دین ہے جو اُسے تمہارے دین سے زیادہ پسند ہے[1])

یہ عرب کا بہت بڑا خطیب اور شاعر تھا، توحید اور یومِ جزا کا قائل تھا اور عربوں کے مشرکانہ مذہب سے متنفر تھا۔

توحید سے متعلق اس کا مقولہ یہ ہے:

کلا بل ھو اللّٰہ اِلٰہ واحد
لیس بمولود ولا والد
اعاد وابدی
والیہ المآب غداً[2]

(ہرگز نہیں! وہی اللہ ہے جو تنہا کارساز اور معبود ہے ــ وہ نہ کسی سے پیدا ہوا ہے اور نہ اُس کی کوئی اولاد ہے ــ وہی دوبارہ پیدا کرے گا اور اُسی نے ابتدا میں ہر چیز کو پیدا کیا ہے ــ اور اُسی کی جانب کل ہر چیز کو لوٹنا ہے)

قبروں میں مدفون مُردوں کے بارے میں قس کہتا ہے:

دعھم فان لھم یوما یصاح بھم
کما ینبہ من نوماتہ الصعق[3]

---

[1] البدایہ والنھایہ۔ از ابن کثیر ج۲، ص۲۳۰ تا ۲۳۷ ملخصاً۔

(بقیہ حواشی بر صفحہ آئندہ)

(چھوڑ دو اُن کو ۔ اُن کے لئے ایک دن مقرر ہے جب انہیں پکارا جائے گا جیسا کہ سوئے ہوئے کو نیند سے بیدار کیا جاتا ہے)

موت اور فکرِ آخرت کے بارے میں عرب کا یہ دانشور کہتا ہے :

فی الذاھبین الاولین من القرون لنا بصائرُ

(پہلی نسلوں کے جو لوگ چلے گئے ہیں اُن میں ہمارے لئے بصیرتیں ہیں)

لمّا رأیت موارداً للموت لیس لھا مصادرُ

(جب مَیں نے دیکھا کہ موت کے گھاٹ پر آنے کی جگہیں تو ہیں، مگر واپس جانے کی جگہیں نہیں ہیں)

ورأیت قومی نحوھا یسعیٰ الاصاغر والاکابرُ

(اور میں نے دیکھا کہ میری قوم کے چھوٹے بڑے سب لوگ اسی گھاٹ کی طرف دوڑ کر جا رہے ہیں)

ایقنت انی لا محالۃ حیث صار القوم صائرُ[1]

(تو میں نے یقین کر لیا کہ میں بھی لازماً وہیں چلا جاؤں گا جہاں میری قوم کے لوگ چلے گئے ہیں)

زید بن عَمرو بن نُفَیل :

یہ قبیلۂ بنو عدی سے تعلق رکھتا تھا اور عمرِ فاروقؓ کا چچا زاد بھائی تھا ۔ اُس نے بُت پرستی اور قریش کے مشرکانہ دین کو چھوڑ دیا تھا ۔ وہ کہتا تھا :

(بقیہ حواشی گذشتہ صفحہ) [2] الملل والنحل للشہرستانی ۔ ج ۲، باب اول، فصل ثانی، طبع مصر ۱۹۶۸ء ۔

[3] ایضاً

[1] (حاشیہ صفحہ ھذا) البدایہ والنھایہ ۔ از ابن کثیر، ج ۲ ص ۲۳۰ و ۲۳۱ ۔

"الٰهي الله ابراهيم وديني دين ابراهيم"

(میرا معبود وہی ہے جو حضرت ابراہیمؑ کا معبود ہے اور میرا دین بھی وہی ہے جو حضرت ابراہیمؑ کا دین ہے[1])

محمد بن اسحٰقؒ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت اسماءؓ بنت ابی بکرؓ سے نقل کیا ہے کہ میں نے زید بن عَمرو بن نُفیل کو کعبے کے ساتھ اپنی پیٹھ لگائے دیکھا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا:

"ما اصبح احد منكم على دين ابراهيم غيري"

(میرے سوا تم میں سے کوئی بھی دینِ ابراہیم پر قائم نہیں ہے[2])

حضرت اسماءؓ کی یہ روایت صحیح بخاری میں بھی لیث بن سعدؒ سے معلّقاً نقل کی گئی ہے[3]۔

امام بخاریؒ نے اپنی جامع صحیح میں عبداللہ بن عمرؓ سے نقل کیا ہے کہ زید بن عَمرو بن نُفیل کہتا تھا "میں ان جانوروں کا گوشت نہیں کھاتا جن کو تم استھانوں اور پرستش گاہوں پر ذبح کرتے ہو۔ میں اُسی جانور کا گوشت کھاتا ہوں جو اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو"۔

زید قریش کے مشرکانہ ذبیحوں پر اعتراض کیا کرتا اور کہا کرتا تھا "تعجب اور حیرت ہے کہ بکری کو تو اللہ نے پیدا کیا ہے، آسمان سے پانی بھی اُسی نے برسایا چارہ بھی زمین سے اُسی نے اُگایا، لیکن تم لوگ اُس کو (بکری کو) اللہ کے سوا دوسروں کے نام پر ذبح کرتے ہو[4]؟"

بخاری شریف میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی دوسری روایت میں آیا ہے کہ زید بن عَمرو بن نُفیل، دینِ حق کی تلاش میں مکّہ سے شام گیا۔ وہاں ایک یہودی عالم سے ملا اور کہا "مجھے اپنا دین سمجھاؤ، شاید میں تمہارا دین اختیار کرلوں"۔

---

[1] البدایہ والنہایہ۔ از ابن کثیر، ج ۲، ص ۲۳۰ و ۲۳۱۔

[2] ایضاً ص ۲۳۷۔ ج۔ ۲۔

[3] صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب حدیث زید بن عمرو۔

[4] ایضاً۔ ج ۱، ص ۵۴۰۔

یہودی عالم نے کہا "اگر تو ہمارا دین اختیار کرے گا تو اللہ کے غضب میں سے اپنا حصّہ لے گا"
زید نے کہا "میں تو خدا کے غضب سے بھاگ کر آیا ہوں، مجھے اور کوئی اچھا دین تم بتلا سکتے ہو؟"
اس نے کہا "دینِ حَنیف کے سوا اور کوئی سچّا دین معلوم نہیں ہے"
زید نے کہا "دینِ حنیف کیا ہے؟"
یہودی عالم نے کہا "حضرت ابراہیمؑ کا دین ہے جو نہ یہودی تھے نہ نصرانی اور وہ کسی کی پرستش نہیں کرتے تھے سوائے اللہ کے"
زید وہاں سے لوٹ آیا اور ایک عیسائی پادری سے ملا اور اس سے بھی یہی گفتگو کی۔
پادری نے کہا "اگر تو ہمارے دین میں آئے گا، تو اللہ کی لعنت میں سے ایک حصّہ پائیگا"
زید نے کہا "میں تو خدا کی لعنت سے بھاگنا چاہتا ہوں۔ کیا تو کوئی اور سچّا دین مجھے بتا سکتا ہے؟"
پادری نے کہا "مجھے دینِ حنیف کے سوا اور کوئی سچّا دین معلوم نہیں"
زید نے کہا "دینِ حنیف کیا ہے؟"
پادری نے کہا "ابراہیمؑ کا دین جو نہ یہودی تھے نہ نصرانی تھے اور وہ اللہ کے سوا کسی کی پرستش نہیں کرتے تھے"
جب زید نے یہودیوں اور نصرانیوں کا یہ قول حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں سنا، تو وہاں سے چل پڑا اور اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر کہنے لگا:

اللّٰھم انی اشھد انی علی دین ابراھیم۔

(یا اللہ، میں گواہی دیتا ہوں اور دل سے اقرار کرتا ہوں کہ میں ابراہیمؑ کے دین پر ہوں)[1]

---

[1] صحیح بخاری۔ باب المناقب، باب حدیث زید بن عمرو بن نفیل، ج ۱ صہ ۲۴، طبع کراچی۔

زید بن عمرو بن نُفیل نے توحید کے اثبات اور اپنی قوم کے مشرکانہ مذہب کی تردید میں ایک قصیدہ لکھا تھا۔ محمد بن اسحٰقؒ کے حوالے سے ابنِ کثیرؒ نے اس کے کچھ اشعار نقل کئے ہیں جو یہ ہیں:

۱۔ ءَ ربّاً واحداً ام الف ربّ ادین اذا تقسّمت الامورُ
(کیا میں ایک خدا کی بندگی کروں یا ہزار کی جب کہ تمام چیزوں کی تقسیم ہو چکی ہے)

۲۔ عزلت اللّات والعزّیٰ جمیعاً کذالک یفعل الجلد الصبورُ
(میں نے لات اور عزّیٰ دونوں کو چھوڑ دیا ہے اور ایک بہادر اور صابر انسان ایسا ہی کرتا ہے)

۳۔ فلا عزّیٰ ادین ولا ابنتیها ولا صنمی بنی عمرو ازورُ
(میں نہ عزّیٰ کو پوجتا ہوں اور نہ اُس کی دو بیٹیوں کو۔ اور نہ میں بنو عمرو کے دونوں بتوں کی زیارت کرتا ہوں)

۴۔ ولا غنماً ادین وکان ربّاً لنا فی الدهر اذ حلمی یسیرُ
(میں غنم کو بھی نہیں پوجتا اور یہ ایک زمانے تک ہمارا رب رہا جبکہ میری عقل کمزور تھی)

۵۔ عجبت وفی اللیالی معجبات وفی الایام یعرفها البصیرُ
(مجھے تعجب ہوتا ہے، اور راتوں اور دنوں میں ایسی تعجب انگیز باتیں ہیں جن کو ہر صاحبِ بصیرت جانتا ہے)

۶۔ بان الله قد افنیٰ رجالاً کثیراً کان شانهم الفجورُ
(کہ اللہ نے بہت سے ایسے لوگوں کو مٹا دیا جن کی حالت نافرمانی کی تھی)

(۷) وابقیٰ آخرین ببرّ قومٍ فیربل منهم الطفل الصغیرُ
(کچھ لوگوں کی نیکی کی وجہ سے دیگر لوگوں کو باقی رکھا، تاکہ ان کے بچے جوان ہو جائیں)

(۸) وبین المرأ یعثر ثاب یومًا کما یتروح الغصن المطیر

(اور جب انسان لغزش کرتا ہے، تو ایک نہ ایک دن لوٹ آتا ہے (حقیقت کی طرف) جس طرح اُس شاخ کے پتے دوبارہ نکل آتے ہیں جس پر بارش برسی ہو)

(۹) ولکن اعبد الرحمن ربی لیغفر ذنبی الرب الغفور

(لیکن میں تو اپنے مہربان رب کی پرستش کرتا ہوں، تاکہ بخش دے میرے گناہوں کو میرا بخشنے والا رب)

(۱۰) فتقوی اللہ ربکم احفظوھا متیٰ ماتحفظوھا لاتبور

(پس تم اپنے اللہ، جو تمہارا رب ہے کے تقویٰ کی نگہداشت کرو جب تم اس کی حفاظت کرو گے، تباہ نہ ہو گے (یعنی اس کی نافرمانی سے بچو اور اس کے احکام کی حفاظت کرو)

(۱۱) تری الابرار دارھم جنان وللکفار حامیۃ سعیر

(تو دیکھے گا کہ نیکو کاروں کا گھر جنت ہے اور کفار کے لیے سخت گرم آگ ہے)

(۱۲) وخزی فی الحیوۃ وان یموتوا یلاقوا ماتضیق بہ الصدور

(اور دنیا کی زندگی میں رسوائی ہے اور اگر وہ اس حالت میں مر گئے تو اس عذاب کا سامنا کریں گے جس سے دل تنگ ہو جائیں گے)[۱]

عامر بن ظرب عَدَوانی :

عامر عرب کا بہترین خطیب اور شاعر تھا۔ اُس کی ایک طویل وصیت ہے جس کے آخر میں وہ کہتا ہے :

"مَیں نے کوئی ایسی چیز نہیں دیکھی جس نے خود اپنے نفس کو پیدا کیا ہو۔ مَیں نے

۱؎ البدایہ والنہایہ لابن کثیر۔ ج ۲ ص ۲۴۲ -

جو چیز بھی دیکھی ہے صانع کی بنائی ہوئی ہے۔ مَیں نے کوئی آنے والی چیز نہیں دیکھی مگر وہ واپس چلی جانے والی ہے۔ اگر بیماری لوگوں کو موت دے سکتی ہے، تو پھر دوائی زندگی بھی دے سکتی ہے (حالانکہ ایسا نہیں ہے)۔ مَیں نے مختلف چیزیں دیکھی ہیں اور اُن سب کا انجام بھی مجھے معلوم ہے!

کسی نے پوچھا "وہ انجام کیا ہے؟" اُس نے جواب دیا "ہر مردہ زندہ ہو جائے گا، اللہ تعالیٰ نے آسمان اور زمین اِسی لئے پیدا کئے ہیں"

یہ تقریر سُن کر لوگ اُس سے ناراض ہو گئے اور واپس چلے گئے، تو اُس نے کہا:

ویل انها نصیحة لو کان من یقبلها۔

(افسوس! یہ تو اچھی نصیحت ہے، کاش اِسے کوئی قبول کرنے والا ہوتا)

یہ شخص شراب نوشی کو بھی حرام اور بری چیز سمجھتا تھا۔

طابخہ بن ثعلب کا غلام:

یہ توحید کا قائل تھا۔ اِس موضوع پر اُس نے کہا ہے:

وادعوك یا ربی بما انت اهله
دعاء غریق قد تشبث بالعصم

(اے میرے رب! میں تجھے پکارتا ہوں ان اوصاف کے وسیلے سے جن کا تو مستحق ہے۔ اُس شخص کی پکار کی طرح جو ڈوبتے وقت بچانے والی چیزوں کو تھام لیتا ہے)

لانك اهل الحمد والخیر کلّه
وذو الطول لم تعجل بسخط ولم تَلُم

(اس لئے کہ تمام تعریفیں تیرے لئے ہیں اور ہر قسم کی خیر اور بھلائی تیرے قبضے میں ہے تو ہی فضل و قدرت کا مالک ہے، اور تو غصّے اور قہر کے وقت

جلد بازی سے کام نہیں لیتا)

نابغۂ ذُبیانی :

یہ توحید اور بعث بعد الموت کا قائل تھا۔ اپنے اس شعر میں اس نے آخرت کا ذکر کیا ہے ؎

نعلتهم ذات الالٰه و دينهم

قويم فما يرجون غير العواقب

(اُن کا ہر کام اللہ کے لئے ہوتا ہے اور اُن کا دین صحیح اور درست دین ہے۔ یہ لوگ اپنے اعمال کے انجام (جزاءِ اعمال) کے علاوہ کچھ نہیں چاہتے)

زُھیر بن ابی سلمی مُزَنی :

جب موسمِ بہار میں جھاڑیاں تر و تازہ اور بارونق ہو جاتیں، تو اُن میں سے گزرتے ہوئے کہا کرتا تھا :

" اگر عرب مجھے گالیاں نہ دیتے تو میں ایمان لے آتا کہ جس ذات نے ان درختوں اور جھاڑیوں کو دوبارہ رونق اور تازگی بخشی ہے، وہ بوسیدہ ہڈیوں کو بھی دوبارہ زندہ کرے گا "

اس شعر سے صاف ظاہر ہے کہ وہ واقعی زندگی بعد از موت پر ایمان لا چکا تھا، اپنے ایک مشہور قصیدے کے ایک شعر میں کہتا ہے :

يؤخر فيوضع فى كتاب فيدخر

ليوم حساب اويُعجّل فينقم

(ملتوی کر دیا جاتا ہے اور ایک دفتر میں محفوظ کر دیا جاتا ہے حساب کے دن کے لئے یا فوری طور پہ عذاب میں گرفتار کر دیا جاتا ہے)

علاف بن شہاب تیمی :

یہ بھی توحید اور جزاءِ اعمال کا قائل تھا۔ اُس کا ایک شعر ہے ؂

وعلمت ان اللّٰہ جازٍ عبدہٗ
یوم الحساب باحسن الاعمال

(میں جانتا ہوں کہ اللہ اپنے بندے کو جزا دے گا حساب کے دن، اُس کے اچھے اعمال کی)[1]

دانشورانِ عرب کے اِن اقوال کو پڑھنے سے انسان کا یہ عقیدہ مزید مضبوط ہو جاتا ہے کہ توحید ایک فطری عقیدہ ہے۔ انسان جب بھی خواہشاتِ نفس، برے ماحول اور تقلیدِ جامد سے آزاد ہو کر سوچتا ہے، تو اس کا قلب فوراً گواہی دیتا ہے کہ خدا ایک ہے، وہی خالق ہے، وہی مالک اور مختارِ کل ہے اور وہی مالکِ روزِ جزا ہے۔

امام ابن کثیرؒ نے مشہور امامِ سیرت و مغازی، محمد بن اسحٰقؒ (متوفی ۱۵۰ھ) سے نقل کیا ہے کہ:

"ایک مرتبہ مشرکین قریش اپنے ایک تہوار کے دن ایک بُت کے پاس قربانیاں پیش کرنے کے لئے جمع ہوئے، اس موقع پر بعض افراد علیحدگی میں ایک دوسرے سے کہنے لگے (کہ آؤ اس مذہبی رسم) کے بارے میں سچی بات کریں لیکن ایک دوسرے کا راز فاش نہ کرنا۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ خدا کی قسم تم جانتے ہو کہ تمہاری اس قوم کا کوئی دین نہیں ہے۔ اِنہوں نے ابراہیمؑ کے دین کو چھوڑ کر اِن بتوں کی پرستش شروع کر دی ہے جو کسی کو نہ کچھ نقصان و ضرر پہنچا سکتے ہیں اور نہ نفع۔ تم اپنے لئے کوئی سچا اور صحیح دین تلاش کرو"۔ اِن افراد کے نام یہ ہیں:

زید بن عمرو بن نُفیل —— ورقہ بن نوفل

---

[1] الملل والنحل۔ ج ۲، باب اول، فصل ثانی، ملخصاً از شہرستانی۔

عثمان بن حویرث ــــــــ عبد اللہ بن جحش
اُمیمہؓ بنتِ عبد المطلب ــــ زینب بنت جحشؓ[1]

ایمانِ مشرکانہ اور ملکیّتِ عطائیّہ

سوال پیدا ہوتا ہے کہ قریشِ مکہ اور مشرکینِ عرب جب خدا کو خالق، رازق اور مُدبّر کائنات مانتے تھے، تو پھر مُوحّدین کے ساتھ ان کا اختلاف کس چیز میں تھا ؟ قرآن مجید میں اس سوال کا جواب یہ ہے :

وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُوْنَ۝

(یوسف - ۱۰۶)

(اور نہیں مانتے ان میں سے بہت سے لوگ اللہ کو، مگر اس طرح کہ اُس کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہیں)

یعنی وہ یہ تو نہیں کہتے تھے کہ اللہ موجود نہیں ہے یا وہ مالک، متصرّف، مُدبّر اور مختار کل نہیں ہے، بلکہ اس گمراہی اور جہالت کا شکار ہو گئے تھے کہ اللہ کے ساتھ تصرّف و اختیار اور استحقاقِ عبادت میں دوسرے بھی کسی نہ کسی طرح شریک ہیں۔ یعنی اُن کا ایمان توحید پر مبنی نہیں تھا، بلکہ مُشرکانہ عقیدہ تھا۔

ان مشرکین کا عقیدہ یہ تھا کہ ہمارے خداؤں کو " مالکیّتِ ذاتیّہ "، یعنی مستقل بالذات اختیارات تو حاصل نہیں ہیں، لیکن " مالکیّتِ عطائیّہ " حاصل ہے۔ خدا نے اُن کو غیبی طاقت دی ہے جس کی وجہ سے وہ نفع اور نقصان پہنچا سکتے ہیں اور مافوق الاسباب تصرّفات کر سکتے ہیں۔ نیز یہ خالق اور مخلوق کے درمیان وسیلۂ قُرب ہیں۔ اِن کی تعظیم کرنا، اُن کی پرستش

---

[1] البدایہ - از ابنِ کثیر - ج ۲، ص ۲۳۷، ۲۳۸ ملخصاً، طبع بیروت ۱۹۶۶ء۔

کرنا، اِن کے نام پہ جانور ذبح کرنا، اِن کے نام پہ نذر و نیاز دینا اور اِن کے نام پہ بنائے گئے بتوں کے سامنے یا ان کی قبروں کے سامنے سجدہ کرنا یہ سب کام دراصل اللہ تک پہنچنے کا ذریعہ اور وسیلہ ہیں۔ مشکلات و مصائب کے وقت جب ہم ان کو پکارتے ہیں تو یہ ہماری پکار سنتے ہیں، خواہ زندہ ہوں یا مردہ، نزدیک ہوں یا دور۔ اس لئے کہ اِن کو سننے کی غیبی طاقت دیدی گئی ہے۔ جب یہ ہماری پکار اور فریاد سنتے ہیں، تو پھر اللہ کے دربار میں ہماری حاجت براری کے لئے سفارش کرتے ہیں۔ اور چونکہ اِن کو اللہ کے دربار میں بڑی وجاہت حاصل ہے، اِس لئے وہ اِن کی سفارش ردّ نہیں کرتا۔

اُن کا عقیدہ تھا ہمارے اِن معبودوں کو شفاعت کے کلی اختیارات حاصل ہیں اور جس کے لئے بھی چاہیں سفارش کر سکتے ہیں اور چونکہ ہمارے کام اِن کی سفارش اور وسیلے سے پورے ہوتے ہیں، اس لئے ہم اِن کی پرستش کرتے ہیں، اِن کے نام پہ نذر و نیاز دیتے ہیں اور ان کو پکارتے ہیں کہ خوش ہو کر ہمارے کام کروا دیں۔ اس ایمانِ مشرکانہ اور عقیدۂ مالکیتِ عطائیہ کا ثبوت اُن کے اس تلبیہ سے بھی فراہم ہوتا ہے جسے مشرکینِ عرب طوافِ کعبہ کے وقت پڑھا کرتے تھے:

لبّیک لا شریک لک الاّ شریکًا ھو لک تملکه وما ملک[1]

(اے اللہ! ہم تیری عبادت کے لئے حاضر ہیں۔ تیرا کوئی شریک نہیں ہے سوائے اُس شریک کے جو تیری مخلوق ہے، تو اُس کا بھی مالک ہے اور اُس کے اختیارات بھی تیرے قبضے میں ہیں)

اِس تلبیئے سے صاف طور پہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن لوگوں کا عقیدہ یہ تھا کہ اگرچہ بالذّات اور مستقل طور پہ اللہ کے ساتھ کارسازی اور فریادرسی اور تصرفات و اختیارات

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الحج، باب التلبیۃ۔ ج ۱، ص ۳۷۶ طبع کراچی۔

میں کوئی بھی شریک اور حصہ دار نہیں ہے، لیکن اس کے بندوں میں ایسے بزرگ اور خدا رسیدہ لوگ بہرحال موجود ہیں جن کو مالکیّت عطائیّہ حاصل ہے اور اسی عطاءِ خداوندی کی وجہ سے وہ تصرّفات و اختیارات اور کارسازی و حاجت روائی میں اللہ کے شریک ہیں۔

یہی وہ ایمانِ مشرکانہ، تصرّفِ عطائی اور شفاعتِ قہری کا عقیدہ ہے جو اُن کے اور مُوحّدین کے درمیان وجہِ نزاع تھا۔ اُن کے اس مشرکانہ عقیدے کی تشریح قرآن کریم کی متعدد آیات میں کی گئی ہے:

۱۔ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَاۗءَ ۘ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ڛ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ (الزمر-۳)

(وہ لوگ جنہوں نے اللہ کے سوا دوسروں کو کارساز بنا رکھا ہے (کہتے ہیں) ہم تو ان کی پرستش صرف اس لئے کرتے ہیں کہ یہ اللہ تک ہماری رسائی کرادیں۔ بے شک اللہ فیصلہ کرے گا ان کے درمیان اُن باتوں کا جن میں وہ اختلاف کر رہے ہیں۔ یقیناً اللہ اُس شخص کو ایمان کی توفیق نہیں دیتا جو جھوٹا، سخت احسان فراموش اور ناشکرا ہو)

اِس آیت میں چار بنیادی باتیں بیان ہوئی ہیں، ان کو اچھی طرح ذہن نشین کرلینا چاہئے تاکہ شرک کی حقیقت معلوم ہوجائے:

۱۔ مشرکینِ عرب اپنے معبودوں کو خالق اور مالک نہیں، بلکہ خدا تک رسائی کا وسیلہ سمجھتے تھے۔ اُن کی غلط فہمی یہ تھی کہ اللہ کی بارگاہ تک ہماری رسائی براہِ راست نہیں ہوسکتی، بلکہ یہی بزرگ ہستیاں ہماری دعائیں اور درخواستیں اللہ تک پہنچاتی ہیں۔

۲۔ اہلِ حق اور اہلِ توحید سے اِن مشرکین کا اختلاف اِسی مسئلے میں تھا کہ مشرک اِن بزرگ ہستیوں کی پرستش کو وسیلۂ قربِ الٰہی سمجھتے تھے۔ اور اہلِ توحید صرف اللہ کی پرستش کو وسیلۂ قرب و نجات مانتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ دلائل سے فیصلہ ہو چکا ہے لیکن قیامت کے روز عملی فیصلہ بھی ہو جائے گا اور اِن کو کھلی آنکھوں سے دکھا دیا جائے گا کہ حق پہ کون تھا ؟

۳۔ مشرکین کا یہ عقیدہ کسی عقلی یا نقلی دلیل پر مبنی نہیں تھا ' بلکہ سراسر جھوٹ تھا ۔ جو اندھی عقیدت اور باپ دادا کی بے سوچے سمجھے تقلید کی بنا پر اختیار کیا گیا تھا ۔ " کَاذِبٌ " میں اسی جانب اشارہ ہے ۔

۴۔ یہ عقیدہ سخت احسان فراموشی اور کُفرانِ نعمت ہے ۔ جب آسمان و زمین کی بے شمار نعمتیں اللہ نے بغیر کسی واسطے کے براہِ راست دی ہیں، تو کیا وہ تمہاری چھوٹی چھوٹی ضروریات بغیر واسطے اور وسیلے کے پوری نہیں کر سکتا ؟

نعمتیں خدا نے دی ہیں اور پرستش کسی اور کی کرتے ہو، یہ تو پرلے درجے کی احسان فراموشی ہے ۔ " کَفَّارٌ " میں اسی جانب اشارہ ہے ۔

باقی رہا یہ سوال کہ سورۂ زُمر کی اس آیت میں کون لوگ مخاطب ہیں یا کونسی اشیاء مراد ہیں جن کو مشرکینِ عرب قُربِ الٰہیٰ کا وسیلہ سمجھتے تھے ۔ ؟ تو اس سوال کے جواب میں امام فخرالدین رازیؒ (متوفیٰ ۶۰۶ھ) فرماتے ہیں :

" اللہ کے سوا جن کی پرستش کی جاتی تھی اُن میں ذی عقل بھی تھے اور غیر ذی عقل بھی ـــ ذی عقل کی مثال حضرت عیسیٰؑ ، حضرت عُزیرؑ ، اور فرشتے ہیں جن کی ایک قوم پرستش کرتی رہی تھی ۔ ان میں بہت سے لوگ سورج ، چاند اور ستاروں کی پرستش بھی اس خیال کی بنا پر کرتے تھے کہ یہ اجرامِ فلکیہ بھی حیات و عقل رکھتے ہیں ۔ غیر ذی عقل معبود وہ بت ہیں جن کی پرستش کی جاتی تھی ۔ کفار کا یہ قول کہ " ہم ان کی پرستش اس لئے کرتے ہیں کہ اللہ تک ہماری رسائی کرا دیں " ، ذی عقل معبودوں کے بارے میں ہے ' اس کی دو وجہیں ہیں :

ایک یہ کہ مَا نَعْبُدُهُمْ میں هُمْ کی ضمیر ذی عقل کی ہے جو غیر ذی عقل (بتوں) کے لئے نہیں آتی ۔

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ کسی عاقل شخص سے یہ بات بعید ہے کہ وہ بتوں ...

پتھروں کو وسیلۂ قربِ خداوندی سمجھ بیٹھے۔ کوئی شخص جو عقل وہوش رکھتا ہو بُت کی پرستش اور تعظیم اس حیثیت سے نہیں کرتا کہ وہ لکڑی ہے یا پتھر ہے۔ بت پرست کا عقیدہ تو یہ ہوتا ہے کہ بُت ستاروں، اَرواحِ سماویہ اور انبیاء وصالحین کے مجسّے اور تصاویر ہیں اور اِن مجسموں اور تصویروں کی پرستش سے اُس کا مقصد حقیقت میں اُن چیزوں اور اُن لوگوں کی پرستش ہے جن کے نام پر یہ مجسّمے اور تصویریں بنائی جاتی ہیں[1]۔"

ابنِ جریرؒ، ابنِ کثیرؒ، ابنِ جوزیؒ اور قاضی ثناء اللہؒ پانی پتی نے بھی اپنی تفاسیر میں لِیُقَرِّبُوْنَا کی تشریح میں یہی لکھا ہے کہ ان معبودوں سے مراد فرشتے، حضرت عیسیٰؑ، حضرت عُزیرؑ اور وہ برگزیدہ لوگ ہیں جن کے نام پر اصنام بنائے گئے تھے۔

۲۔ فَلَوْلَا نَصَرَهُمُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قُرْبَانًا اٰلِهَةً ۚ بَلْ ضَلُّوْا عَنْهُمْ ۚ وَذٰلِكَ اِفْكُهُمْ وَمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝ (الاحقاف۔ ۲۸)

(پھر کیوں نہ اُن ہستیوں نے اُن کی مدد کی جنہیں اللہ کے سوا اُنہوں نے قربِ خداوندی کا ذریعہ سمجھتے ہوئے کارساز بنالیا تھا، بلکہ وہ تو اُن سے گم ہوگئے۔ یہ تھا اُن کے جھوٹ اور مَن گھڑت عقیدوں کا حال جو اُنہوں نے گھڑ رکھے تھے)

اِس آیت سے قبل قومِ عاد کی بربادی کا ذکر ہے۔ اسی عذاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جس وقت ان پر آفت آئی، تو ان ہستیوں نے اُن کی مدد کیوں نہ کی اور وہ کہاں گم ہوگئے جن کو یہ بارگاہِ خداوندی تک رسائی کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ اُن کے خیال میں وہ صاحبِ تصرّف ہستیاں تھیں جو مشکل وقت میں مشکل کشائی، فریادرسی اور دستگیری کرتی تھیں "اِفْكُهُمْ" اور "يَفْتَرُوْنَ" کے الفاظ میں وہی بات کہی گئی ہے جو سورۂ الزمر کے لفظ کَاذِبٌ میں کہی گئی ہے، یعنی اللہ کے سوا دوسروں کو غیبی طاقت کا

---

[1] تفسیر کبیر۔ ج ۲۶۔ ص ۲۴۱۔ سورۃ الزمر۔

مالک سمجھنا اور غیر اللہ کی پرستش کو وسیلۂ قربِ الٰہی سمجھنا۔ یہ سراسر جھوٹ اور خیالی بات ہے جس کی کوئی عقلی اور نقلی دلیل موجود نہیں ہے، اور جسے انہوں نے از خود گھڑ رکھا ہے۔

اِس آیت میں بھی ان کے معبودوں کے لئے "اَلَّذِیْنَ" اور "ضَلُّوْا" کے الفاظ آئے ہیں جو ذوی العقول کے لئے آتے ہیں معلوم ہوا کہ اُن کے معبود بھی بزرگ اور خدا رسیدہ انسان تھے۔ اور یہ بُت صرف قبلۂ توجہ اور یادگار کے طور پر بنائے گئے تھے۔

۳۔ وَ یَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مَا لَا یَضُرُّھُمْ وَلَا یَنْفَعُھُمْ وَیَقُوْلُوْنَ ھٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰہِ ط قُلْ اَتُنَبِّئُوْنَ اللّٰہَ بِمَا لَا یَعْلَمُ فِی السَّمٰوٰتِ وَلَا فِی الْاَرْضِ ط سُبْحٰنَہٗ وَتَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ ہ (یونس۔ ۱۸)

(یہ لوگ اللہ کے سوا اُن کی پرستش کرتے ہیں جو اِن کو نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں نہ نفع، اور (توجیہہ میں) کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔ اے محمدؐ! اِن سے کہو کہ تم اللہ کو اس بات کی خبر دیتے ہو جسے وہ نہ آسمانوں میں جانتا ہے نہ زمین میں؟ پاک اور بالاتر ہے اللہ ان چیزوں سے جنہیں یہ پرستش میں اس کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں)

اِس آیت میں مشرکین کے معبودوں کے لئے ھٰٓؤُلَآءِ کا اسمِ اشارہ آیا ہے جو ذوی العقول کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ معلوم ہوا کہ مراد وہ بزرگ ہستیاں ہیں جن کو یہ لوگ سفارشی سمجھ کر اور جن کے بُت بنا کر پوجتے اور مدد کے لئے پکارتے تھے۔

اگرچہ اس آیت میں لفظ مَا بھی آیا ہے جو بالعموم غیر ذوی العقول کے لئے آتا ہے، لیکن جب مقصد کسی وصف کا اثبات یا نفی ہو، تو پھر ذوی العقول کے لئے بھی مَا کا لفظ استعمال ہوتا ہے، جیسے فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِنَ النِّسَآءِ الاٰیۃ میں۔ چونکہ اصل مقصد حلال اور پاک عورتوں سے نکاح کرنے کی اجازت دینا ہے،

عورتوں کی ذات کا ذکر مقصود نہیں ہے بلکہ ان کے وصفِ پاکیزگی کا ذکر اصل مقصد ہے، اس لئے اُن کے لئے مَا کا لفظ آیا ہے حالانکہ عورتیں عقل رکھتی ہیں، اگرچہ ان کی عقل بالعموم مردوں کے مقابلے میں ناقص ہوتی ہے۔ اس آیت میں بھی چونکہ اُن کے معبودوں سے نفع وضرر پہنچانے کی نفی اصل مقصد ہے، اس لئے ذوی العقول ہونے کے باوجود اُن کے لئے مَا کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ امام رازیؒ اس آیت کی تشریح میں لکھتے ہیں :

"بُت ارواحِ سماویّہ اور اجرامِ فلکیّہ کے نام پہ بنائے گئے تھے۔ اسی طرح بعض لوگوں نے یہ بُت انبیاءؑ اور بزرگوں کے نام پہ بنائے تھے اور اُن کا عقیدہ یہ تھا کہ جب اِن بزرگوں کے مجسّموں کی تعظیم کی جائے تو یہ بزرگ ہمارے لئے سفارش کرتے ہیں۔"

اس کے بعد امام رازی لکھتے ہیں :

ونظیرہ فی ھذا الزمان اشتغال کثیر من الخلق بتعظیم قبور الاکابر علیٰ اعتقاد انھم اذا عظّموا قبورھم فانھم یکونون شفعاء لھم عند اللّٰہ۔[1]

(اس کی نظیر اِس زمانے میں یہ ہے کہ بہت سے لوگ بزرگوں کی قبروں کی تعظیم میں مشغول رہتے ہیں، اس عقیدے کی وجہ سے کہ جب ہم اِن بزرگوں کی قبروں کی تعظیم کرتے ہیں تو یہ اللہ کے ہاں ہماری سفارش کرتے ہیں۔)

حافظ عماد الدّین ابنِ کثیرؒ، سورۂ الزمر کی آیت ۳ کی تفسیر میں لکھتے ہیں :

انما یحملھم علیٰ عبادتھم لھم لأنھم عمدوا الی اصنام اتخذوھا علی صور الملٰئکۃ المقرّبین فی زعمھم فعبدوا تلک الصّور تنزیلا لذالک منزلۃ عبادتھم الملائکۃ لیشفعوالھم عند اللّٰہ تعالیٰ فی نصرھم

---

[1] تفسیر کبیر۔ ج ۱۷۔ ص ۶۰۔ سورۂ یونس۔

ورزقهم وما ينوبهم من امور الدنيا فاما المعاد فكانوا جاحدين له كافرين به .... وهذه الشبهة هي التي اعتمدها المشركون في قديم الدهر وحديثه[1]

(ان مشرکین کو بت پرستی پر اس چیز نے آمادہ کیا تھا کہ انہوں نے اپنے خیال میں مقرب فرشتوں کی تصویریں بنالی تھیں اور اُن تصویروں کی پرستش اِس خیال سے کرتے تھے کہ اُن کی پرستش اور تعظیم اصل میں فرشتوں کی پرستش ہے اور فرشتوں کی پرستش اس لئے کرتے تھے کہ وہ اللہ کے ہاں ان کی سفارش کریں مشکلات میں امداد کرنے کے لئے، روزی رسانی کے لئے اور اُن دوسری دنیوی حاجتوں کے لئے جو وقتاً فوقتاً پیش آتی ہیں۔ آخرت کے یہ لوگ منکر تھے (اس لئے اُخروی شفاعت اُن کی مراد نہ تھی) یہی وہ شبہہ اور غلط فہمی ہے جس میں قدیم زمانے اور جدید زمانے کے مشرکین مبتلا ہیں۔)

یعنی یہ شبہہ کہ ہم اللہ کے سوا جن کی پرستش کرتے ہیں، جنہیں مدد کے لئے پکارتے ہیں اور جن کے نام کی نذر و نیاز دیتے ہیں وہ وسیلہ اور سفارشی ہیں۔

امام اہلِ سنّت سید شریف جُرجانی رح حنفی لکھتے ہیں :

اتخذوها على انها تماثيل الانبياء والزهاد او الملئكة او الكواكب واشتغلوا بتعظيمها على وجه العبادة توصلًا بها الى ماهو إله حقيقة[2]

(مشرکین نے انبیاءؑ زاہد بزرگوں، فرشتوں اور ستاروں کے نام پر مجسمے اور

---

[1] تفسیر ابن کثیر - ج ۶، صـ ۸۷، الزمر و فی خازن - ج ۳ صـ ۱۴، عن ابن عباس رض -

[2] شرح مواقف - طبع نولکشور - صـ ۵۸۰ -

تصویریں بنائی تھیں اور اُن مجسموں کی عبادت کے طور پر تعظیم میں مشغول ہو گئے تھے اس خیال کی بنا پر کہ یہی حقیقی خدا تک پہنچنے کا وسیلہ اور ذریعہ ہیں)

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ؒ اور علامہ آلوسی ؒ نے بھی بُت پرستی کی یہی حقیقت بیان کی ہے کہ یہ بُت اور مجسمے صالحین ؒ اور انبیاء ؑ یا فرشتوں کے نام پر بنائے گئے تھے، اور اُن کی پرستش اس خیال پر مبنی تھی کہ یہ صالحین ؒ وسیلۂ قربِ خداوندی ہیں [1]

علامہ آلوسی ؒ حنفی دوسرے مقام پر لکھتے ہیں :

ومن اولئك عبدة القبور الناذرون لها المعتقدون للنفع والضرّ ممن الله اعلم بحاله فيها وهم اليوم اكثر من الدّود [1]

(انہی میں سے ہیں قبر پرست لوگ جو اہلِ قبور کے لئے نذریں مانتے اور نیازیں دیتے ہیں اور جو اُن لوگوں سے نفع وضرر کا عقیدہ رکھتے ہیں جن کا حال اُن کی قبروں میں اللہ ہی کے علم میں ہے ۔ اس قسم کے قبر پرست آج کل کیڑوں مکوڑوں سے بھی زیادہ ہیں)

بُت پرستی کا آغاز کب اور کیسے ہوا ؟

حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے نبی بنا کر اور توحید کا پیغام دے کر زمین پر اتارا تھا، لیکن اُن کی اولاد میں بُت پرست بھی ہیں اور خدا پرست بھی، تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر شرک و بُت پرستی کا آغاز کب اور کیسے ہوا ؟

پہلے سوال کا جواب تو یہ ہے کہ شرک و بت پرستی کا آغاز حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد میں دس قرنوں کے بعد ہوا ۔ حافظ ابن کثیر ؒ نے صحیح ابنِ حبّان سے صحیح سند کے ساتھ

---

[1] تفسیر روح المعانی ۔ طبع رشیدیہ لاہور ۔ ج ۱۳، ص۶۷ ۔

ابُو اُمامہ باہلیؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ " رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلّم نے فرمایا ہے۔ آدم علیہ السلام اور نوح علیہ السلام کے درمیان دس قرنوں کا فاصلہ تھا "[1]

" ان قرنوں کے بعد خدا بیاں پیدا ہونے لگیں یہاں تک کہ بت پرستی شروع ہوگئی "[2]

صحیح بخاری میں حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے کہ " ان دس قرنوں کے لوگ اسلام پہ قائم تھے "[3]

حافظ ابن کثیرؒ نے ان ابتدائی دس قرنوں کی مدت کے بارے میں لکھا ہے کہ قرن کو اگر صدی (سوسال) کے معنوں میں لیا جائے جیسا کہ یہی معنے مشہور ہیں، تو تقریباً ایک ہزار سال بنتے ہیں، لیکن قرن کا لفظ نسل کے معنوں میں بھی آتا ہے مثلاً :

وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ بَعْدِ نُوْحٍ (اور کتنی نسلیں ہلاک کی ہیں ہم نے نوح کے بعد) ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ (پھر پیدا کی تھیں ہم نے اُن کے بعد دوسری نسلیں) وَقُرُوْنًا بَيْنَ ذٰلِكَ كَثِيْرًا (الفرقان - ۳۸) (اور بہت سی نسلیں ان کے درمیان) وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِنْ قَرْنٍ (اور کتنی ہلاک کی تھیں ہم نے ان سے پہلے کی نسلیں)[4]

ظاہر ہے کہ ان آیات میں صدی کے معنے درست نہیں ہو سکتے، بلکہ نسل اور قوم و قبیلہ کا مفہوم ہی صحیح ہو سکتا ہے۔ صحیح ابنِ حبان میں حضرت ابوہریرہؓ سے اور مسند احمدؒ میں حضرت ابن عباسؓ سے ایک طویل روایت مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا " آدم علیہ السلام کی عمر ایک ہزار سال تھی "[5]

---

[1] البدایہ والنہایہ - ج ۱ - ص ۱۰۱ -

[2] ایضاً - ج ۱ - ص ۱۰۵ -

[3] صحیح بخاری - کتاب التفسیر، سورۂ نوح

[4] البدایہ - ج ۱ - ص ۱۰۱ -

[5] ایضاً - ج ۱ - ص ۸۸-۸۹ -

بہرحال اگر قرن کو نسل کے معنے میں لیا جائے تو ہزاروں سال بنتے ہیں اس لئے کہ اس دور میں عمریں لمبی ہوتی تھیں۔ رہا یہ سوال کہ بت پرستی کا آغاز کیسے ہوا؟ تو اس کا جواب حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی اس روایت میں موجود ہے جسے تقریباً تمام مفسرین اور مؤرخین نے نقل کیا ہے، لیکن یہاں اصحّ الکتُب بعد کتاب اللہ، یعنی صحیح بخاری کی روایت نقل کی جاتی ہے غور فرمائیے:

عن ابن عباس رضؓ صارت الاوثان التی کانت فی قوم نوحؑ فی العرب بعد۔ امّا ودّ کانت لکلب بدومة الجندل۔ واما سُوَاع کانت لھذیل۔ واما یغوث فکانت لمراد ثم لبنی غطیف بالجرُف عند سبأٍ واما یعوق فکانت لھمدان واما نسر فکانت لحمیر لآل ذی الکلاع۔ اسماء رجال صالحین من قوم نوحؑ فلما ھلکوا اوحی الشیاطین الی قومھم ان انصبوا الی مجالسھم التی کانوا یجلسون انصابا وسموھم باسماءھم ففعلوا فلم تعبد حتیٰ اذا ھلک وتنسخ العلم عُبِدت [1]

(عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ جو بُت قومِ نوحؑ میں پوجے جاتے تھے بعد کے کسی دَور میں یہ عرب میں منتقل ہو گئے۔
وَدّ کی پرستش بنو کلب نے "دُومَۃ الجَندل" میں شروع کر دی۔ سُواعؔ بنو ہُذیل کا معبود بن گیا۔ یغُوثؔ بنو مُراد کا۔ بعد میں یہی یغوث سباء کے مقامِ جُرُف پر بنو غُطَیف کا معبود بن گیا۔ یعُوقؔ بنو ہمدان کا معبود تھا اور نَسرؔ بنو حِمیَر کی شاخ ذُوالکَلاع کا خدا قرار پایا۔

---

[1] صحیح بخاری۔ جلد ثانی۔ کتاب التفسیر سورۂ نوح۔

یہ سب اصل میں قومِ نوحؑ کے صالحین (بزرگوں) کے نام تھے ۔ یہ بزرگ جب وفات پاگئے، توشیطان نے اُن کی قوم کے دلوں میں یہ خیال ڈالا کہ جن مقامات پر یہ بزرگ بیٹھا کرتے تھے اُن پر بطور یادگار پتھر کھڑے کر دو اور اِن پتھروں کو اُن بزرگوں کا نام دے دو؛ چنانچہ اُن کے معتقدین نے یہ کام کر ڈالا ۔ ابتدا میں ان پتھروں کی پرستش نہیں ہوتی تھی، حتیٰ کہ جب یہ لوگ بھی وفات پاگئے اور علم بھی ختم ہوگیا تو پھر لوگوں نے اِن پتھروں کو بتوں کی شکلوں میں ڈھال لیا اور ان بتوں کی پرستش شروع کر دی ۔)

ابنِ جریرؒ نے محمد بن قیسؒ کا قول نقل کیا ہے جس سے بتوں کی حقیقت پر مزید روشنی پڑتی ہے :

قال کانوا قوماً صالحین من بنی اٰدم ؑ وکان لھم اتباع یُقتدون بھم فلما ماتوا قال اصحابھم الذین کانوا یَقتدون بھم لو صوّرناھم کان اشوق لنا الی العبادۃ اذا ذکرناھم فصوّروھم فلما ماتوا وجاء اٰخرون دبّ الیھم ابلیس فقال انما کانوا یعبدونھم وبھم یُسقون المطر فعبدوھم[1]

(یہ اولادِ آدمؑ کے صالح لوگ تھے، جن کے کچھ متبعین ان سے عقیدت رکھتے تھے جب یہ لوگ وفات پاگئے، تو اُن نے معتقدین نے کہا کہ اگر ہم اُن کی تصویریں بنالیں، توعبادت میں ہمارا شوق و ذوق زیادہ ہو جائے گا ۔ ہم ان کی تصویریں دیکھ کر اُنہیں یاد کریں گے، چنانچہ انہوں نے یہ مجسّمے بنالئے ۔ جب یہ لوگ (مجسّمے بنانے والے) وفات پاگئے اور دوسری نسل کے لوگ آئے، توشیطان

---

[1] تفسیر ابن جریر ۔ ج ۲۹ ۔ ص ۹۹ ۔ طبع بیروت ۱۹۵۴ء ، سورۂ نوح ۔

اُن کے پاس آیا اور کہا کہ تمہارے باپ دادا توان تصویروں اور مجسموں کی پرستش کرتے تھے اور انہی بتوں کی وجہ سے اُن پہ بارش ہوا کرتی تھی۔ اور یہ یاد رکہ کے نئی نسل والوں نے اُن بتوں کی پرستش شروع کر دی)

صحیح بخاریؒ اور تفسیر ابن جریرؒ کی مذکورہ روایات سے معلوم ہوا کہ بت پرستی کا آغاز بزرگوں، اولیاء اور اصحاب القبور کی اندھی عقیدت سے ہوا تھا اور بت پرستی حقیقت میں اکابر پرستی ہے۔ بُت توصرف قبلۂ توجہ اور یادگار کے طور پہ پوجے جاتے تھے۔ اصل مقصد اُن اولیاء اور اکابر کی پرستش تھا جن کے نام پر یہ بُت اور مجسمے بنائے گئے تھے۔ جس طرح کہ آج کے قبر پرستوں کی نیت اصحاب القبور کی پرستش کرنا ہوتی ہے اور قبور صرف قبلۂ توجہ اور یادگار کی حیثیت رکھتی ہیں۔

حضرت نوحؑ اسی بُت پرستی اور اولیاء پرستی کی تردید کے لئے بھیجے گئے تھے۔ دجلہ اور فرات کے درمیان سرزمینِ عراق میں انہوں نے توحید کی دعوت کا آغاز فرمایا اور ۹۵۰ سال تک یہ کام جاری رکھا۔

ابنِ کثیرؒ نے البدایہ اور تفسیر دونوں میں حضرت ابن عباسؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ حضرت نوحؑ کی رسالت اور دعوت کو ماننے والوں کی تعداد ۸۰ تھی۔ کعب الاحبار کا قول یہ ہے کہ کل تعداد ۷۲ تھی، بہرحال یہی ۸۰ یا ۷۲ لوگ حضرت نوحؑ کے ساتھ کشتی میں سوار ہوئے اور باقی ساری کی ساری قوم نے انکار کر دیا اور اللہ تعالٰی نے پانی کا طوفان بھیج کر سب کو غرقاب اور تباہ و برباد کر دیا۔

حضرت نوحؑ کی کشتی کردستان کے علاقے میں اَرَارَاط کی پہاڑیوں میں سے کوہِ جُودِی پر جاکر رکی اور اس میں سوار ۸۰ یا ۷۲ افراد نے نئی دنیا بسائی اور عقیدۂ توحید پہ قائم رہے، لیکن کچھ مدّت کے بعد پھر وہی بُت پرستی، اولیاء پرستی، ستارہ پرستی اور ارواح پرستی کی رُوحانی بیماریاں نمودار ہوئیں اور انبیاءؑ کی بعثت کا سلسلہ پھر شروع ہوا، جو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہ آکر ختم ہوا۔

حضرت عبداللہ ابنؓ عبّاس کا مذکورہ قول دراصل قرآن کریم کی اُس آیت کی تفسیر ہے جس

ں بتایا گیا ہے کہ اولادِ آدمؑ آغاز میں توحید پہ قائم تھی اور " اُمَّةً وَّاحِدَةً "، یعنی ایک دروا حدامت کے طور پہ زندگی بسر کر رہی تھی۔ اختلاف و تفرق اور شرک و کفر اور فتنہ و ساد بعد میں رونما ہوا۔

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ (البقرہ -۲۱۳- پارہ ۲)

(سب لوگ ایک دین پہ تھے پھر (اختلافات شروع ہوئے تو) بھیجے اللہ نے پیغمبر خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے)

• وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ط

(اور نہیں تھے سب لوگ، مگر ایک ہی امت۔ بعد میں اختلاف رونما ہوا)

(یونس -۱۹ پارہ ۱۱)

علامہ آلوسیؒ فرماتے ہیں: متفقین علی التوحید (روح المعانی)

علامہ نسفیؒ فرماتے ہیں: متفقین علی دین الاسلام (مدارک التنزیل)

یعنی ابتدا میں حضرت آدمؑ کی اولاد حضرت نوحؑ کے زمانے تک توحید اور دینِ اسلام پر متفق تھی۔ بعد میں اختلافات رونما ہوئے، تو اللہ نے حضرت نوحؑ کو توحید کی دعوت دینے کے لئے بھیجا اور اُن کے بعد جتنے بھی انبیاء ورسل مبعوث ہوئے سب نے لوگوں کو توحید کی دعوت دی۔

تاریخِ اسلام اور تاریخِ انسانی سے بے خبر لوگوں نے " مذہب" کی تاریخ مرتب کرتے ہوئے کہا ہے کہ انسان نے زندگی کی ابتدا شرک سے کی تھی اور تدریجی ارتقاء کر کے توحید کے مقام تک پہنچا ہے۔ قرآن کریم کی یہ آیات اور بُت پرستی کے آغاز سے متعلق مذکورہ روایات اس نظریے کی تردید کرتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان نے اپنی زندگی کا آغاز توحید کی روشنی میں کیا تھا، شرک کی تاریکی میں نہیں۔

عرب میں بت پرستی کی تجدید کب اور کیسے ہوئی ؟

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبَارَکًا وَّ ھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ ۝ (اٰلِ عمران - ۹۶)

(بے شک پہلا گھر جو لوگوں کی عبادت کے لئے بنایا گیا تھا وہ گھر ہے جو مکّہ میں ہے، جو برکت والا ہے اور سارے جہان کے لئے ہدایت ہے)

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ مَثَابَۃً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ط (البقرہ - ۱۲۵)

(اور جب ہم نے بیت اللہ کو لوگوں کے لئے مرکز ______ اور جائے امن بنایا)

اِن آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ بیت اللہ زمین پہ پہلی عبادت گاہ اور پہلا مرکزِ توحید تھا۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ مرکزِ توحید بُت خانے اور مرکزِ شرک میں کیسے تبدیل ہوا ؟ اولادِ اسمٰعیلؑ میں بت پرستی کی تجدید کب ہوئی ؟ اور یہ بدعت کس نے ایجاد کی ؟

اس سوال کا جواب اُس روایت میں موجود ہے جسے بخاریؒ اور مسلمؒ دونوں نے نقل کیا ہے اور وہ یہ ہے :

قال ابوھریرۃ رض قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رأیت عمرو بن عامر الخزاعی یجر قصبہ فی النار کان اوّل من سیّب السوائب[1]

(حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں نے عمرو بن عامر خزاعی کو دیکھا ہے کہ وہ اپنی آنتیں آگ میں اپنے پیچھے کھینچ رہا تھا۔ یہ وہ پہلا شخص ہے جس نے (عرب میں) بتوں کے نام پر

---

[1] صحیح بخاری۔ کتاب التفسیر۔ سورۃ المائدہ۔

بعض جانوروں کو آزاد چھوڑنے اور ان پر سواری کرنے کو دیا تھا)

بخاری میں اس مضمون کی روایت حضرت عائشہ رضؓ سے بھی منقول ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ کی مذکورہ روایت میں ان الفاظ کا اضافہ ہے:

وبحرّ البحیرۃ وغیّر دین اسمٰعیلؑ [1]

(عمرو بن عامر خزاعی پہلا شخص ہے جس نے بحیرہ کو حرام ٹھہرایا تھا اور دینِ اسمٰعیلؑ کو بدل دیا تھا۔)

حضرت ابوہریرہؓ کی اس روایت کو مسلم کے اضافے کے ساتھ ابنِ جریرؒ نے بھی نقل کیا ہے، لیکن نام عمرو بن لُحَیّ نقل کیا ہے [2]۔ دراصل لُحَیّ اس کے باپ کا نام تھا اور عامر جدّاعلیٰ کا نام تھا۔

ابنِ جریرؒ نے دوسری سند کے ساتھ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ان الفاظ میں نقل فرمائی ہے: وھو اوّل من غیر دین ابراھیمؑ [3]

(یعنی عمرو بن لُحَیّ وہ پہلا شخص ہے جس نے دینِ ابراہیمؑ کو بدل ڈالا تھا)

علّامہ شہرستانیؒ (م ۵۴۸ھ) لکھتے ہیں:

واوّل من وضع فیہ الاصنام عمرو بن لُحَیّ بن غالوثۃ بن عمرو بن عامر لمّا سار قومہ الی مکّۃ واستولیٰ علیٰ امر البیت۔

(پہلا شخص جس نے بیت اللہ میں بت رکھے تھے وہ عمرو بن لُحَیّ تھا۔ جب اُس کی قوم نے مکّہ میں آکر بیت اللہ کا انتظام سنبھالا اور اُس پر اپنا تسلط جمایا)

---

[1] صحیح مسلم۔ کتاب التفسیر۔ سورۂ مائدہ۔

[2] تفسیر ابن جریر۔ ج ۷۔ ص ۸۶، سورۂ مائدہ۔

[3] ایضاً۔ ج ۷، ص ۸۷۔

اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے علاّمہ شہرستانی ؒ لکھتے ہیں :

"یہ شخص (عمرو بن لُحیّ) ایک مرتبہ شام کے شہر بلقا میں گیا اور وہاں اُس نے لوگوں کو بتوں کی پوجا کرتے ہوئے دیکھا، تو پوچھا "تم یہ کام کیوں کرتے ہو؟" لوگوں نے کہا "یہ ہمارے رب ہیں جنہیں ہم نے آسمانی ہیکلوں اور بنی نوع انسانوں کی شکل پہ بنایا ہے۔ ہم جب ان کے وسیلے سے مدد مانگتے ہیں تو ہماری مدد کی جاتی ہے۔ ان کے وسیلے سے جب ہم بارش مانگتے ہیں تو بارش ہو جاتی ہے۔ ان کے وسیلے سے جب ہم بیماروں کے لئے شفا مانگتے ہیں، تو مل جاتی ہے۔"

عمرو بن لُحیّ کو ان کی یہ بات پسند آئی اور اُن سے ایک بُت طلب کیا۔ اُنہوں نے اُس کو ھُبَل نام کا ایک بت دے دیا جسے اُس نے لاکر کعبے میں نصب کر دیا۔ ھُبَل کے قریب میاں بیوی کی شکل میں اساف اور نائلہ بھی تھے۔ بت نصب کرنے کے بعد عمرو بن لُحیّ نے لوگوں کو دعوت دی کہ ان بتوں کی تعظیم اور پوجا کرو، تاکہ تم ان کا قرب حاصل کر سکو اور پھر ان کے وسیلے سے اللہ کا قرب حاصل کر سکو۔

یہ واقعہ ایرانی بادشاہ شاہ پُور ذالاکتاف کی سلطنت کے ابتدائی دور میں رونما ہوا تھا۔ غلبۂ اسلام کے زمانے تک یہ بُت پرستی جاری رہی، یہاں تک کہ فتحِ مکہ کے وقت بیت اللہ سے یہ بت نکالے گئے۔"[1]

ابنِ ہشام ؒ (متوفی ۲۱۳ھ یا ۲۱۸ھ) کی تحقیق ملاحظہ فرمائیں :

سیرت ابنِ ہشام اصل میں سیرتِ ابنِ اسحٰق (متوفی ۱۵۰ھ) کی تلخیص و تشریح ہے اور محققین میں زیادہ مقبول و مشہور ہے۔ عرب میں بت پرستی کی ابتدا کے بارے میں ابنِ ہشام لکھتے ہیں :

"عمرو بن لُحیّ مکہ مکرمہ سے شام گیا اور بلقاء کے مقام "مآب" پہ اُس نے وہاں کے بت پرستوں سے ھُبَل نام کا بت حاصل کیا اور لاکر بیت اللہ کے اندر نصب

[1] الملل والنحل۔ از شہرستانی ؒ، طبع مصر ۱۹۶۷ء، ج ۲ ص ۲۳۳۔۲۳۴۔

کر دیا۔ جن لوگوں سے یہ بت حاصل کیا گیا تھا وہ عملیق بن لاوُذ بن سام بن نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے ''

اس کے بعد ابنِ ہشام رحمہ اللہ نے ابنِ اسحٰق رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ :

'' بعض لوگوں کا خیال ہے عرب میں بت پرستی کا آغاز اس طرح ہوا کہ جب کوئی شخص حرمِ مکّہ سے باہر جاتا، تو حرم کے عام پتھروں میں سے ایک پتھر ساتھ لے جاتا اور جہاں بھی جاتا اُس پتھر کو سامنے رکھ کر اُس کا طواف کرتا۔ اس طواف اور پرستش سے اُس کا مقصد حرمِ کعبہ کی تعظیم ہوتا تھا (یعنی پتھر کی حیثیت سے نہیں بلکہ حرم کی نسبت سے یہ پرستش ہوتی تھی) کچھ مدت گذر جانے کے بعد لوگوں نے اصل مقصد کو بھلا دیا اور ہر خوبصورت پتھر کی تعظیم شروع کر دی۔ ان لوگوں کے بعد جب نئی نسل آئی تو اُس نے ابراہیم علیہ السلام اور اسمٰعیل علیہ السلام کے دین کو یکسر بدل ڈالا اور ہر طرف بتوں کی پرستش شروع ہو گئی اور اُنہوں نے گذشتہ قوموں کی ساری گمراہیاں اختیار کر لیں[1] ''

یہ قول ابنِ اسحٰق رحمہ اللہ نے یُزعمون کے الفاظ میں نقل کیا ہے جو بالعموم (ہمیشہ نہیں) غلط یا مشکوک بات کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ دوسری طرف صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی روایت ہے جس میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عَمرو بن لُحَی کو اس گمراہی کا مُوجِد کہا ہے۔ ویسے اِن دونوں میں یہ تطبیق بھی ہو سکتی ہے کہ حرمِ کعبہ کے پتھروں کی تعظیم و پرستش کا طریقہ بھی اِسی نے جاری کیا ہوگا اور باقاعدہ بت پرستی کو بھی اِسی مُبتدِع نے عرب میں پھیلایا ہوگا۔

ابنِ ہشام کی تحقیق (م ۲۱۳ھ یا ۲۱۸ھ) :

سیرت ابنِ ہشام اصل میں سیرت ابن اسحٰق (متوفی ۱۵۰ھ) کی تلخیص و تشریح ہے اور محققین میں زیادہ مقبول و مشہور ہے۔ عرب میں بت پرستی کی ابتدا کے بارے میں ابنِ ہشام لکھتے ہیں :

---

[1] سیرۃ ابن ھشام۔ طبع ۱۹۵۵ء۔ ج ۱، ص ۷۷۔ وھکذا فی البدایۃ لابن کثیر۔ ج ۲، ص ۱۸۷-۱۸۸۔

"عمرو بن لُحَیَ مکّہ مکرمہ سے شام گیا اور بلقاء کے مقام "مآب" پر اُس نے بت پرستوں سے "ھُبَل" نام کا بُت حاصل کیا اور لاکر بیت اللہ کے اندر نصب کر دیا۔ جن لوگوں سے یہ بُت حاصل کیا گیا تھا وہ عملیق بن لاؤذ بن سام بن نوح کی اولاد میں سے تھے"۔

اس کے بعد ابنِ ہشام رح نے ابنِ اسحٰق رح سے نقل کیا ہے کہ :

"بعض لوگوں کا خیال ہے کہ عرب میں بُت پرستی کا آغاز اس طرح ہوا کہ جب کوئی شخص حرمِ مکّہ سے باہر جاتا، تو حرم کے عام پتھروں میں سے ایک پتھر ساتھ لے جاتا اور جہاں بھی جاتا اُس پتھر کو سامنے رکھ کر اُس کا طواف کرتا۔ اس طواف اور پرستش سے اُس کا مقصد حرمِ کعبہ کی تعظیم ہوتا تھا (یعنی پتھر کی حیثیت سے نہیں بلکہ حرم کی نسبت سے یہ پرستش ہوتی تھی) کچھ مدت گزر جانے کے بعد لوگوں نے اصل مقصد کو بھلا دیا اور ہر خوبصورت پتھر کی تعظیم شروع کر دی۔ ان لوگوں کے بعد جب نئی نسل آئی تو اُس نے ابراہیم ؑ اور اسمٰعیل ؑ کے دین کو بدل ڈالا۔ کھلے انداز میں بتوں کی پرستش شروع ہو گئی اور انہوں نے گذشتہ قوموں کی ساری گمراہیاں اختیار کر لیں"۔

یہ قول ابنِ اسحٰق رح نے "یَزْعُمُوْنَ" کے لفظ میں نقل کیا ہے جو بالعموم (ہمیشہ نہیں) غلط یا مشکوک بات کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ دوسری طرف صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی روایت ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے عمرو بن لُحَیَ کو اس گمراہی کا مُوجِد کہا ہے ویسے ان دونوں میں یہ تطبیق بھی ہو سکتی ہے کہ حرمِ مکّہ کے پتھر کی تعظیم و پرستش کا طریقہ بھی اُسی نے جاری کیا ہو گا اور باقاعدہ بُت پرستی کو بھی اُسی مُبتدع نے عرب میں پھیلایا ہو گا۔

علّامہ ابُو القاسم سُہیلی رح کی تحقیق :

ابو القاسم سُہیلی رح اپنی کتاب "اَلرَّوضُ الاُنُف" میں لکھتے ہیں :

ل سیرۃ ابنِ ہشام۔ طبع ۱۹۵۵ء ص۷۷ ج۱۔ وھکذا فی البدایہ لابن کثیر ص۱۸۷-۱۸۸ ج۲

"جب مکّہ مکرّمہ سے" بنو جُرہم" کو نکال کر" بنو خزاعہ" نے بیت اللہ پہ اپنا تسلط قائم کیا، تو عربوں نے عمرو بن لُحَی کو اپنا رب، یعنی مطلق العنان بادشاہ بنا لیا۔ یہ شخص جو بدعت (رسم) جاری کرتا لوگ اس کو اپنے لئے شریعت اور قانون بنا لیتے۔ اس مقبولیت کی وجہ یہ تھی کہ عمرو بن لُحَی لوگوں کو کھانا کھلاتا اور کپڑے پہناتا تھا۔ حج کے موسم میں بعض اوقات تو یہ دس ہزار اونٹ ذبح کرتا اور دس ہزار جوڑے کپڑوں کے حاجیوں میں مفت تقسیم کرتا تھا۔

ایک بڑی چٹان تھی جس پہ بیٹھ کر طائف کے قبیلۂ ثقیف کا ایک شخص ستُّو گھول کر حاجیوں کو کھلایا کرتا تھا۔ اس چٹان کو لوگوں نے اسی وجہ سے "صَخرۃُ اللّات" (ستو گھول کر پلانے والے کا پتھر) نام دے دیا تھا۔ جب یہ شخص فوت ہو گیا تو عمرو بن لُحَی نے لوگوں سے کہا کہ یہ مرا نہیں ہے بلکہ چٹان کے اندر داخل ہو گیا ہے۔ اُس نے لوگوں کو یہ حکم دیا ہے۔ اس چٹان پہ عمارت بناؤ اور اس کی پرستش کرو؛ چنانچہ اس عمارت کو بیت اللّات کا لقب دیا گیا اور پوجا شروع ہو گئی"[1]

حافظ ابنِ کثیرؒ کی تحقیق :

حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں :

" بنو خزاعہ ۳۰۰ یا ۵۰۰ سال تک بیت اللہ کے متولّی اور مکّہ مکرّمہ کے حکمران رہے۔ اُن کا دور تولیّت و حکومت کے لحاظ سے بدترین دور شمار ہوتا ہے' اس لئے کہ اُن کے رئیس عمرو بن لُحَی نے سب سے پہلے بت پرستی کو عربوں میں رائج کیا۔ یہ عمرو انتہائی سخی ہونے کی وجہ سے اپنی قوم کا مقبول ترین لیڈر تھا۔ مؤرخین کا کہنا ہے کہ اس کی ہر بات اور اُس کا ہر فعل قابلِ اتباع اور حجت سمجھا جاتا

---

[1] حاشیہ سیرت ابن هشام ۔ ج ۱، ص۷۸ ۔

تھا۔[1]

کسی قوم اور معاشرے میں جب کوئی بیماری رونما ہوتی ہے تو جب تک اس کا علاج نہ کیا جائے اس وقت تک وہ بڑھتی ہی رہتی ہے؛ چنانچہ بت پرستی کی اس بدعت کو جب عمرو نے اُمّ القریٰ، یعنی مکہ میں اور بیت اللہ میں رائج کیا تو یہ پھیلتی ہی چلی گئی، یہاں تک کہ عربوں کا کوئی بھی اہم شہر بُت کدے سے خالی نہ رہا۔ ۱۹ یا ۲۰ مشہور بت خانوں کا ذکر تو ابنِ ہشام نے سیرت میں کیا ہے۔

ہشام کلبی نے کتاب الاصنام میں ۳۰ مشہور بت خانوں کے نام لکھے ہیں اور علامہ زکی پاشا نے "تکملۂ کتاب الاصنام" میں ۴۶ نام مزید بتائے ہیں (کل ۷۶ بت کدے ہوئے)[2]

سیّد سلیمان ندوی نے ۶۰ بت خانوں کے نام اور اُن کے مختصر کوائف سیرت النبی جلد چہارم میں درج کئے ہیں اور "ارض القرآن" میں ان کی مزید تفصیلات بھی بیان کی ہیں۔

خلاصہ یہ ہے مُحرّف دینِ ابراہیمی اور مجدّدِ شرک و بدعت عمرو کی وجہ سے مرکزِ توحید یعنی بیت اللہ کو بتوں سے بھر دیا گیا اور بنو اسمٰعیل نے اپنے علاقوں بلکہ اپنے گھروں کو بھی اس نجاست سے آلودہ کر لیا۔

شرک و بدعت کی اس طویل اندھیری رات کے بعد نبوّتِ محمدّیہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا سورج طلوع ہو۔ اس شمسِ نبوّت ؐ اور سراجِ منیر ؐ کی روشنی ماحول کو منوّر کرتی رہی۔ اس سورج کے اردگرد اسی سے روشنی حاصل کرنے والے ستارے نمودار ہوئے (صحابۂ کرام رض) یہ سورج اپنے ستاروں کو ساتھ لے کر گردش کرتا رہا اور اندھیری رات کی تاریکیوں کو مٹاتا رہا۔ یہاں تک کہ یہ "روحانی نظامِ شمسی" ظلمتوں پر غالب ہوا اور عرب کی سرزمین شمسِ نبوّت کی روشنی

---

[2] ماخوذ از سیرۃ النبیؐ۔ از سیّد سلیمان ندویؒ۔ ج ۳ ص ۲۵۵ طبع ۱۹۳۵ء۔

[1] البدایہ والنّھایہ۔ ج ۲ ص ۱۸۷ وھکذا فی سیرتِ ابنِ ہشام۔ ج ۱ ص ۷۷ تا ۷۸۔

اور نجومِ ہدایت کے نور سے منوّر ہوئی۔ مکّہ فتح ہوا اور بیت اللہ شریف دوبارہ مرکزِ توحید بنا۔ باطل مٹا اور حق غالب ہوا۔ بُت پرستی، اوہام پرستی، قوم پرستی، ستارہ پرستی، شاہ پرستی، قبر پرستی، اَحبار پرستی، پیر پرستی اور نفس پرستی کے سارے بت ٹوٹ گئے، مٹ گئے اور خالص خدا پرستی پر مبنی اسلامی نظام قائم ہوا اور اللہ کا حکم نافذ اور دین غالب ہوا۔

صحیح بخاری کی روایت ہے: "فتح مکّہ کے دن جب حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکّہ میں داخل ہوئے، تو حالت یہ تھی کہ بیت اللہ کے اِرد گرد ۳۶۰ بُت نصب تھے۔ —— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایک بُت پہ لاٹھی کی ضرب لگاتے اور فرماتے: "سچ آگیا اور جھوٹ مٹ گیا، سچ آگیا اور جھوٹے خدا نہ تو کسی چیز کو پیدا کر سکتے ہیں اور نہ موت کے بعد دوبارہ کسی کو زندہ کر سکتے ہیں"۔

دوسری روایت میں آیا ہے کہ جب آپؐ مکّہ میں داخل ہوئے تو فرمایا "جب تک خانۂ خدا میں یہ جھوٹے اور بناوٹی خدا موجود ہیں۔ اس وقت تک میں اس کے اندر نہیں جاؤں گا"۔ چنانچہ بتوں کو نکالنے کا حکم صادر فرمایا۔ ان بتوں میں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کے بُت بھی تھے اور وہ بھی نکالے گئے۔ ان دونوں بتوں کے ہاتھوں میں خیر و شر معلوم کرنے کے تیر (پانسے) تھے۔

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا "خدا ان کو غارت کرے ان کو یہ تو معلوم تھا کہ ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ نے ان تیروں کے ذریعے کبھی بھی اپنی قسمت معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی تھی"۔ اس کے بعد آپؐ بیت اللہ شریف میں تشریف لے گئے[1]

ایک حدیث میں آیا ہے کہ قیامت آنے سے پہلے امّتِ مسلمہ میں پھر بت پرستی شروع ہو جائے گی۔ دراصل بُت صرف پتھر وغیرہ کے مجسّمے ہی کو نہیں کہا جاتا، بلکہ اللہ کے سوا جس کی بھی پرستش کی جائے وہ بُت ہے۔

—— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے دعا فرمائی تھی "اے اللہ! میری قبر کو بُت نہ

---

[1] صحیح بخاری - جلد دوم - کتاب المغازی - باب غزوہ فتح مکّہ -

بنانا جس کی پرستش کی جائے "۔

یُعْبَدُ کے لفظ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی نظر میں ہر وہ قبر بھی بُت ہے جس کی پرستش کی جائے ۔ ان معنوں میں آج ہم مسلمانوں نے بزرگوں، شہیدوں اور اولیاءِ کرام کی قبروں کو بُت بنا رکھا ہے ۔ اللہ تعالیٰ ہم کو توفیق دے کہ توحید کی صراطِ مستقیم پر ثابت قدم رہیں اور شرک و بدعت کے اندھیروں کو مٹانے کے لئے جدوجہد کرتے رہیں، دعا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے ان بندوں کی کوششوں میں برکت ڈالے جو توحید کے نظام کو غالب و قائم کرنے کی جدّوجہد میں مصروف ہیں ۔

اَللّٰھُمَّ اٰمِیْن یَا رَبَّ الْعَالَمِیْنَ

حاکمیتِ الٰہیہ :

جس طرح خالقیّت اور مالکیّت اللہ رب العلمین کی صفات ہیں، اسی طرح حاکمیّت اور شارعیت بھی اُس کی صفت ہے اور توحید فی الصفات کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ آئینی اور قانونی حاکمیّت صرف اللہ کی تسلیم کی جائے ۔ عقل یہ تسلیم نہیں کر سکتی کہ انسانوں کا خالق اور مالک تو اللہ رب العلمین ہو اور اُن پر حکم اور قانون کسی اور کا نافذ ہو ۔ سچ یہ ہے کہ اسلامی سیاست کی مبادیات اور اساسی اُصولوں میں سے ایک بنیادی اُصول حاکمیّتِ الٰہیّہ ہے، یعنی یہ کہ حاکمیّت اور اقتدارِ اعلیٰ رب العالمین ہی کی صفت ہے ۔ مَاْخذِ قانون عقلِ انسانی نہیں، بلکہ وحیٔ الٰہی ہے اور بالادستی قرآن وسنّت ہی کو حاصل ہے ۔

حاکمیّتِ الٰہیّہ کا ثبوت قرآن وسنّت، تعاملِ خلفاءِ راشدین رضؓ، اجماعِ امّت اور عقل و قیاس سب سے ہوتا ہے ۔ اس موضوع پر تفصیلی اور مدلّل بحث میری کتاب "اسلامی سیاست" میں کی گئی ہے اِس لئے اس کتاب میں اس موضوع پر لکھنا بلاضرورت تکرار ہے ۔ اس بحث کی تفصیلات کے لئے ملاحظہ کیجئے" اسلامی سیاست" باب سوم، فصل ثالث، از ص ۲۱۹ تا ص ۲۷۴ "۔

چودھواں باب

رسالت و نبوّت

یہ بات بدیہیات میں سے ہے اور عقل بلا دلیل تسلیم کرتی ہے کہ خالق، مالک اور حاکم کی عبادت و اطاعت فرض و لازم ہے اور بندگی، حاکم کے احکام کو جانے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔ حاکمِ حقیقی جو خالق اور مالک بھی ہے اُس کے احکام اور اُس کی پسند و ناپسند معلوم کرنے کا واحد اور مستند ذریعہ وحی ہے۔ وحی جس پر آتی ہو اُس کو رسول اور نبی کہا جاتا ہے۔ اس بنا پر خالقیتؔ، مالکیّت اور حاکمیّتِ الٰہیّہ کی مباحث کے ساتھ رسالت اور نبوّت کا عقلی اور منطقی تعلق ہے۔

"اسلامی سیاست" کا ایک مبدا ایمان بالرّسل اور اطاعتِ رسولؐ ہے، یعنی جب اللہ ہی خالق و مالک ہے، تو وہی حاکم اور مُقتدرِ اعلیٰ بھی ہے۔ رسول و نبی کی حیثیت حاکمِ حقیقی کے مستند اور معصوم و محفوظ سفیر اور نمائندے کی ہے۔ یہی رسول و سفیر خالق و مخلوق اور حاکم و محکوم کے درمیان واسطۂ رابطہ اور حصولِ علم و ہدایت کا ذریعہ اور وسیلہ ہوتا ہے۔

رسولؐ کی ہدایت و رہنمائی کے بغیر اللہ کی حاکمیت کا عملی ظہور نہیں ہو سکتا۔

اس بحث کا مرکزی اور اساسی نقطہ لفظِ وحی ہے اس لیے سب سے پہلے وحی پر تفصیلی گفتگو ضروری ہے۔

وحی کے لغوی معنی

لفظِ وحی کے معنے ہیں "پوشیدہ طور پر سُرعت اور تیزی کے ساتھ سمجھانا"

والوحی العجلۃ یقولون اَلْوَحیٰ اَلْوَحیٰ وَالْوَحَاءَ اَلْوَحَاءَ اَلْبِدَارَ۔

(وحی کے معنے ہیں جلدی کرنا، عرب کہتے ہیں اَلْوَحیٰ اَلْوَحیٰ یا اَلْوَحَاءَ اَلْوَحَاءَ، یعنی جلدی کرو جلدی کرو!)

مَوْتٌ وَحِیٌّ کے معنے ہیں جلدی مرنا [1]

واصل الوحی الاشارۃ السریعۃ

(وحی کے اصل معنے ہیں جلدی اور سُرعت کے ساتھ اشارہ کرنا [2])

الوحی لغۃً الاعلام فی خفاء

(وحی کے معنے ہیں پوشیدہ طور پر خبر دینا، سمجھانا اور بتانا [3])

اسی اساسی لغوی مفہوم کی مناسبت سے لفظ وحی اشارہ، کتابت، پیغام، الہام اور کلامِ خفی (سرگوشی) کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

الوحی الاشارۃ والکتابۃ والرسالۃ والالہام والکلام الخفی وکل ما القیتہ الی غیرک ویقال وَحَیْتُ الیہ الکلام واوحیت [4]۔

---

[1] لسان العرب۔ ج ۱۵، ص ۳۸۱-۳۸۲۔ ومختار الصحاح۔ ص ۷۱۳۔

[2] مفردات القرآن۔ ص ۵۳۶۔

[3] فتح الباری، شرح بخاری، ج ۱، ص ۹ وعمدۃ القاری شرح بخاری۔ ج ۱۔ ص ۱۷

[4] لسان العرب۔ ج ۱۵، ص ۳۷۹ ومختار الصحاح۔ ص ۷۱۳۔

(وحی اشارہ کرنے، لکھنے، پیغام بھیجنے، الہام، خُفیہ بات اور ہر اُس خیال کو بھی کہتے ہیں جسے دوسرے کے دل میں ڈالا جائے۔)

وَحَیْتُ اِلَیْہِ الْکَلَامَ یا اَوْحَیْتُ کے معنے ہیں (میں نے اُس کی جانب پیغام بھیجا)

علّامہ جمال قرشیؒ نے درجِ بالا عبارت کا فارسی ترجمہ اس طرح کیا ہے:

"نامہ واشارہ وپیغام و در دل افگندن وسُخنِ پوشیدہ وہرچہ بدیگرے فِرستی واَنْدازِی[1]"

لفظِ وَحْی مصدری معنوں میں بھی آتا ہے اور اِسمی معنوں میں بھی، یعنی پوشیدہ طور پہ تیزی کے ساتھ خبر اور اطلاع دینے کو بھی وحی کہا جاتا ہے جو مصدری معنے ہیں اور اُس بات کو بھی وحی کہتے ہیں جو خُفیہ طور پہ بتائی گئی ہو۔ یہ اِسمی معنے ہیں، یعنی وحی بمعنیٰ مُوْحیٰ بہٖ بالفاظِ دیگر لکھنے کو بھی وحی کہتے ہیں اور لکھے ہوئے خط کو بھی، پوشیدہ طور پہ بات کرنے کو بھی کہتے ہیں اور بات کو بھی، پیغام بھیجنے کو بھی کہتے ہیں اور پیغام کو بھی۔ مذکورہ بالا تمام کتابوں میں وحی کے مصدری اور اِسمی دونوں معنے بیان ہوئے ہیں۔ لغوی مفہوم کے اعتبار سے اچھی بات کی خبر دینے کو بھی وحی کہا جاتا ہے اور بری بات کی خبر دینے اور سمجھانے کو بھی وحی کہا جاتا ہے، خواہ خبر بیداری کی حالت میں دی گئی ہو یا خواب میں۔

لفظِ وحی کا لغوی معنی میں استعمال

لفظِ وحی اور اِس سے مشتق الفاظ کا لغوی معنوں میں استعمال قرآنِ کریم کی ۱۱ آیات میں ہوا ہے۔ تفصیل آئندہ صفحہ پر ملاحظہ ہو:

---

[1] صراح اللغات، باب الیاء۔ فصل الواوُ۔ ص۵۹۴۔

نام سورہ	نمبر سورہ	نمبر آیت	نام سورہ	نمبر سورہ	نمبر آیت
المائدہ	۵	۱۱۱	مریم	۱۹	۱۱
الانعام	۶	۱۱۲	طٰہٰ	۲۰	۳۸
الانعام	۶	۱۲۱	القصص	۲۸	۷
الانفال	۸	۱۲	حم السجدہ	۴۱	۱۲
یوسف	۱۲	۱۵	الزلزال	۹۹	۵
النحل	۱۶	۶۸			

لفظِ وحی لغوی اعتبار سے چھ معنوں میں استعمال ہوا ہے، جو قرآن کریم کی مذکورہ بالا گیارہ آیات میں درج ذیل ہیں:

(۱) الہام فطری :

وَاَوْحٰی رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا۔ (النحل ۶۸)

"اور آپ کے رب نے شہد کی مکھی کو وحی بھیجی ـــ کہ تو پہاڑوں میں گھر بنالے الخ" (النحل ـ ۶۸)

امام فخر الدین رازیؒ لکھتے ہیں : ای قرّر فی انفسھا ھذہ الاعمال العجیبۃ۔ (اللہ تعالیٰ نے ان مکھیوں کے اندر یہ عجیب کام کرنے کی صلاحیت رکھ دی ہے)

اِس نوع کی وحی کو فطری اور طبیعی الہام کہا جاتا ہے، جس طرح بچے کے نفس میں اللہ نے غیر محسوس طور پر دودھ پینے کا طریقہ ڈال دیا ہے، اسی طرح شہد کی مکھیوں کے اندر بھی عجیب و غریب طور پہ شہد بنانے کا طریقہ ڈال دیا ہے۔ اسی فطری تعلیم کو وحی کا نام دیا گیا ہے۔

(۲) حکم تکوینی :

یَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَھَا ۝ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰی لَھَا ۝

(اُس روز زمین اپنے اوپر گذرے ہوئے حالات بیان کرے گی کیونکہ تیرے رب نے اسے ایسا کرنے کی وحی کی ہوگی (یعنی حکم دیا ہوگا)

(الزلزال ـ ۵)

حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ یہ آیت پڑھی اور صحابہؓ سے پوچھا۔ جانتے ہو زمین کے وہ حالات اور خبریں کیا ہیں ؟ انہوں نے فرمایا۔ اللہ اور اُس کا رسول خوب جانتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا۔ وہ خبریں یہ ہیں کہ زمین ہر بندے اور بندی کے بارے میں اُس عمل کی گواہی دے گی جو اُس کی پیٹھ پہ کیا گیا ہو گا۔ زمین کہے گی کہ اس شخص نے فلاں دن، فلاں کام کیا تھا، یہ ہیں وہ خبریں اور حالات جن کو یہ زمین بیان کرے گی۔ دوسری روایت میں ہے کہ اِس کا اُس کو اللہ نے حکم دیا ہو گا۔[1]

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت مجاہدؒ نے اَوۡحٰی لَھَا کے معنٰی اَمَرَھَا کئے ہیں۔[2] اس آیت کی جو تفسیر ترمذی کی حدیث مرفوع اور صحابہؓ سے منقول ہے وہ یہ ہے کہ یہاں وحی سے مراد حکم تکوینی ہے، یعنی وہ فرمانِ خداوندی جس سے روگردانی اور بغاوت کا اختیار اور طاقت نہ زمین کو حاصل ہے اور نہ کسی اور چیز کو حاصل ہے۔

(۳) الہام رحمانی

وَاِذۡ اَوۡحَیۡتُ اِلَی الۡحَوَارِیّٖنَ اَنۡ اٰمِنُوۡا بِیۡ وَبِرَسُوۡلِیۡ

(المائدہ ۔ ۱۱۱)

(اور جب وحی بھیجی تھی ہم نے (حضرت عیسٰیؑ کے) حواریّین کی طرف کہ ایمان لے آؤ مجھ پر اور میرے رسول پہ)

ابن جریرؒ فرماتے ہیں : ای قذفت فی قلوبھم (ہم نے ان کے دلوں میں یہ بات ڈال دی تھی) یہاں پہ وحی الہام خیر کے معنٰی میں آیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے اُن کے دلوں میں ارادۂ ایمان اور داعیۂ خیر ڈال دیا تھا۔ دل میں جو خیال آجائے وہ اگر شریعت کے مطابق ہو تو الہام ربّانی ہوتا ہے، ورنہ الہام شیطانی اور وحی شیطانی ہوتا ہے۔

---

[1] جامع ترمذی۔ ابواب صفۃ القیٰمۃ وکتاب التفسیر سورۃ الزلزال۔

[2] تفسیر ابن جریر۔ ج ۳۰، ص ۲۲۶ سورۃ الزلزال۔

(۴) وحی الی الملائکۃ :

اِذْ یُوحِیْ رَبُّکَ اِلَی الْمَلٰٓئِکَۃِ اَنِّیْ مَعَکُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۔ (الانفال ۱۲)

(جب وحی بھیجی تیرے رب نے فرشتوں کو کہ میں تمہارے ساتھ ہوں ۔ پس ثابت قدم رکھو ان لوگوں کو جو ایمان لا چکے ہیں)

یہ براہِ راست پیغام اور حکم تھا، جو اللہ نے اپنے فرشتوں کو جنگِ بدر میں صحابہ کرامؓ کی امداد کے لئے دیا تھا ۔

(۵) اشارہ :

فَخَرَجَ عَلٰی قَوْمِہٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰٓی اِلَیْھِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُکْرَۃً وَّعَشِیًّا ۔ (مریم - ۱۱)

(پس نکلا وہ (زکریاؑ) اپنی قوم کے پاس حجرے سے اور وحی کی — (اشارہ کیا) ان کو کہ اللہ کی پاکی بیان کرو صبح و شام)

وحی بمعنے اشارہ کلامِ عرب میں کثیر الاستعمال ہے ۔ ایک شاعر کہتا ہے :

نظرت الیھا نظـــرۃ فتحیرت

دقائق فکری فی بدیع صفاتھا

فاوحیٰ الیھـــا الطرف انی احبّھـــا

فاثر ذالک الوحی فی وجناتھـــا

(میں نے جب اس کی طرف ایک نظر دیکھا تو میرے لطیف خیالات اُس کی عجیب صفات میں متحیّر ہو گئے ۔ آنکھ نے جب اُس کو وحی کی (اشارہ کیا) کہ میں اُس سے محبّت کرتا ہوں، تو اُس وحی نے (اشارے نے) اُس کے رخساروں کو متأثر کیا)

(۶) الہامِ شیطانی :

وَاِنَّ الشَّیٰطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ اِلٰٓی اَوْلِیٰٓئِھِمْ

لِیُجَادِلُوْکُمْ وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّکُمْ لَمُشْرِکُوْنَ ۝

(انعام - ۱۲۲)

(اور بے شک شیطان اپنے دوستوں کو وحی کرتے ہیں، تاکہ وہ تم سے جھگڑا کریں، اور اگر تم نے اُن کا کہا مانا، تو تم بھی مشرک ہو جاؤ گے)

اسی مضمون کی دوسری آیت سورۃ الانعام کی آیت ۱۱۲ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ "انسانوں اور جنّات کے شیطان انبیاء کے مقابلے میں ایک دوسرے کو جھوٹی باتوں کی وحی کرتے ہیں، دھوکہ دہی کے لئے۔ وحیٔ شیطانی سے مراد وہ وسوسے اور بُرے خیالات ہیں جو شیطان لوگوں کے دلوں میں ڈالتے ہیں۔ حق سے برگشتہ کرنے کے لئے۔ شیاطین الانس کی وہ جھوٹی باتیں بھی وحیٔ شیطانی ہیں جن کو وہ چالاکی اور عیّاری کے ساتھ لوگوں کے سامنے سچّائی کے لباس میں پیش کرتے ہیں۔

وحی کا شرعی اور اصطلاحی مفہوم

اب ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ وحی کا وہ شرعی اور اصطلاحی مفہوم کیا ہے جس پر رسالت اور نبوّت کا دار و مدار ہے۔

لفظِ وحی کے لغوی معانی کی مناسبت سے وحی کے شرعی مفہوم میں تین چیزوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے:

حکمِ شرعی ——— پوشیدگی ——— سُرعت اور تیزی

اِن تینوں خصوصیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے وحیٔ شرعی کی جامع تعریف اس طرح کی جا سکتی ہے:

"حکمِ شرعی سے خُفیہ اور پوشیدہ طور پر سرعت اور تیزی کے ساتھ خبردار کرنا"

لیکن یہ مصدری معنے ہیں۔ اسمی مفہوم کے اعتبار سے وحی اُس کلامِ الٰہی کو کہا جاتا ہے

جو کسی نبی پہ نازل ہوا ہو ۔

حافظ ابنِ حجرؒ اور علامہ بدر الدینؒ عینی دونوں نے وحی کی شرعی تعریف یہ کی ہے :

الوحی شرعاً اعلام الشرع وقد یطلق الوحی ویراد به اسم المفعول منه ای الموحیٰ وهو کلام اللہ المنزل علی النبیؐ [1]

(وحی شرعی، احکامِ شرعیہ کی اطلاع دینے کو کہتے ہیں، لیکن اس کا اطلاق مُوحیٰ کے معنوں میں بھی ہوتا ہے، یعنی اللہ کا وہ کلام جو نبی پہ اترا ہو ۔)

قرآن کریم میں لفظِ وحی اور اُس کے مشتقات شرعی اور اصطلاحی معنوں میں ۲۸ سورتوں اور ۵۹ آیتوں میں آئے ہیں ۔ ان آیات کا نقشہ پیش کیا جارہا ہے تاکہ تحقیق کا ذوق رکھنے والوں کے لئے آسانی ہو ۔

(نقشہ آئندہ صفحہ پہ ملاحظہ فرمائیں)

---

[1] فتح الباری ۔ ج ۱، ص۱ وعمدۃ القاری ۔ ج ۱ ص۱۸، بدء الوحی ۔

نام سورۃ	نمبر سورۃ	نمبر آیات	نام سورۃ	نمبر سورۃ	نمبر آیات
آل عمران	۳	۴۴	الشعراء	۲۶	۵۲ - ۶۳
النسّاء	۴	۱۶۳	العنکبوت	۲۹	۴۵
الانعام	۶	۱۹ - ۵۰ - ۹۳ - ۱۰۶ - ۱۴۵ -	الاحزاب	۳۳	۲
الاعراف	۷	۱۱۷ - ۱۶۰ - ۲۰۳	السباء	۳۴	۵۰ -
یونس	۱۰	۲ - ۱۵ - ۸۷ - ۱۰۹	فاطر	۳۵	۳۱ -
ھود	۱۱	۱۲ - ۳۶ - ۳۷ - ۴۹	صٓ	۳۸	۷۰
یوسف	۱۲	۳ - ۱۰۲ - ۱۰۹	الزمر	۳۹	۶۵
الرعد	۱۳	۳۰ -	حم السجدہ	۴۱	۶
ابراھیم	۱۴	۱۳	حم الشوریٰ	۴۲	۳ - ۱۳ - ۵۱ - ۵۲ - ۷
النحل	۱۶	۴۳ - ۱۲۳	الزخرف	۴۳	۴۳ -
الاسراء	۱۷	۳۹ - ۷۳ - ۸۶	الاحقاف	۴۶	۹ -
الکھف	۱۸	۲۷ - ۱۱۰	النجم	۵۳	۴ - ۱۰
طٰہٰ	۲۰	۱۳ - ۴۸ - ۷۷ - ۱۱۴	الجن	۷۲	۱ -
الانبیاء	۲۱	۷ - ۲۵ - ۴۵ - ۷۳ - ۱۰۸ -			
المؤمنون	۲۳	۲۷			

وحی کی بنیادی قسمیں :

وحی کی اساسی قسمیں یا دوسرے الفاظ میں نزولِ وحی کی بنیادی کیفیات تین ہیں جو اِس آیت میں بیان ہوئی ہیں :

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ

مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ (الشوریٰ - ۵۱)

(کسی بشر کا یہ مقام نہیں ہے کہ اللہ اُس سے رُوبرُو بات کرے (۱) اُس کی بات یا تو وحی (اشارے اور القاء فی القلب) کے طور پر ہوتی ہے،

(۲) یا پردے کے پیچھے سے،

(۳) یا پھر کوئی پیغام بر (فرشتہ) بھیجتا ہے اور وہ اُس کے حکم سے جو کچھ وہ چاہتا ہے، وحی کرتا ہے۔ وہ برتر اور حکمت والا ہے)

پہلی قسم سے مراد الہامِ رحمانی ہے۔ اِس صورت میں نہ تو فرشتہ بات کرتا ہے اور نہ ہی کلامِ الٰہی سنائی دیتا ہے، بلکہ صرف قلبِ رسول ؐ میں کوئی بات ڈال دی جاتی ہے۔ یہ القاء فی القلب اور الہامِ رحمانی کبھی بیداری کی حالت میں ہوتا ہے اور کبھی خواب کی حالت میں۔ دوسری قسم میں آواز تو سنائی دیتی ہے، مگر بولنے والا نظر نہیں آتا، جیسا کہ حضرت موسیٰ ؑ کو دامنِ طور میں آواز سنائی دی تھی۔ بولنے والا اُن کی نگاہ سے اوجھل تھا (طٰہٰ - ۱۱ تا ۴۸ - القصص - ۳۰ تا ۳۵) اِسی انداز میں اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی شبِ معراج ساتویں آسمان کے اوپر سدرۃُ المنتہیٰ کے قریب بات کی تھی۔

تیسری قسم وہ ہے جس میں فرشتہ آکر اللہ کا پیغام پہنچاتا ہے۔ اس صورت میں نبی، فرشتے کو دیکھتا بھی ہے اور اس کی آواز بھی سنتا ہے۔ اکثر اوقات میں تو فرشتہ انسانی شکل میں آتا تھا، لیکن دو تین مرتبہ اصلی شکلِ مَلکی میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرشتے کو دیکھا تھا۔ یہی وہ اقسام ہیں جن کے ذریعے تمام آسمانی کتابیں انبیاء پہ نازل ہوئی تھیں۔ آیت کے آخر میں 'برتر اور حکمت والا'، کی صفاتِ خداوندی ذکر کرنے میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ کی ذات بلند و برتر ہے اور عام لوگ براہِ راست اُس سے ہمکلام ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتے، لیکن وہ حکیم بھی ہے اور اُس کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے منتخب بندوں کے ساتھ مخصوص طریقے سے بات کرے، تاکہ لوگ اُس کے احکام سے بے خبر نہ رہیں۔

وحی کی کیفیت اصل میں اللہ اور اُس کے رسول ؐ کے درمیان راز ہے۔ رسول ؐ کے لئے

ذریعۂ معلومات وحی کا یہی رازدارانہ طریقہ ہے اور امت کے لئے ذریعۂ علم رسول کی کھلی تبلیغ و تعلیم ہے۔

نزولِ وحی کی تفصیلی کیفیات

حافظ ابنِ قیم رح نے زاد المعاد میں نزولِ وحی کی تفصیلی صورتیں سات بیان کی ہیں:

(۱) الرُّؤیا الصَّادِقہ : سچے خواب دیکھنا۔

صحیح بخاری باب کیف بدء الوحی الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں حضرت عائشہ رض کی روایت میں آیا ہے کہ وحی کا آغاز سچے خوابوں سے ہوا تھا۔ حافظ ابنِ حجر رح اور علامہ بدرالدین عینی رح دونوں نے لکھا ہے کہ رویائے صادقہ کا آغاز ربیع الاوّل عام الفیل میں ہوا تھا اور بیداری کی حالت میں نزولِ وحی کا آغاز رمضان میں ہوا تھا۔ جیساکہ امام بیہقی رح کی ایک روایت میں آیا ہے۔

(۲) القاء فی القلب : دل میں کوئی بات ڈال دینا، یعنی الہامِ ربانی۔

اس صورت میں فرشتہ دکھائی نہیں دیتا تھا جیساکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

"رُوح القُدُس نے میرے دل میں یہ بات ڈال دی ہے کہ کسی نفس کی موت اُس وقت تک نہیں آسکتی جب تک کہ وہ اپنی روزی پوری نہ کر لے۔ پس تم اللہ سے ڈرتے رہو اور حلال ذریعے سے رزق کی تلاش کرو۔ اگر تمہارے رزق میں کچھ تاخیر ہوجائے، تو اس کی وجہ سے تم ناجائز ذرائع سے رزق حاصل کرنے کی کوشش نہ کرو کیونکہ جو اللہ کے پاس ہے وہ اُس کی اطاعت ہی سے مل سکتا ہے"

اس حدیث کو ابو نعیم اصفہانی رح نے "حلیۃ الاولیاء" میں اور حافظ نورالدین ہیثمی رح نے مجمع الزوائد۔ ج ۴ ص ۷۲ میں نقل کیا ہے۔ اس کی سند میں عُفیر بن مَعدان آیا ہے جو ضعیف ہے لیکن باقی سارے راوی ثقہ ہیں۔ اس کے شواہد بھی موجود ہیں۔ مستدرکِ حاکم میں ابنِ مسعود رض

سے ابن ماجہؒ، ابن حبانؒ اور حاکمؒ نے جابر بن عبداللہؓ سے اور مسند بزّار میں حذیفہؓ سے اِسی مضمون کی روایات نقل ہوئی ہیں۔ اس بنا پر ایک راوی کے کمزور ہونے کے باوجود یہ حدیث قابلِ قبول ہے۔

(۳) تمثل الملک رجلا : فرشتے کا انسانی شکل میں آکر پیغام پہنچانا۔

(۴) کصلصلة الجرس : گھنٹی بجنے کی آواز سے مشابہ آواز کا سننا۔

(۵) رؤیة الملک فی صورته : فرشتے کا اپنی مَلَکی شکل میں دکھائی دینا۔

(۶) الوحی فوق السماء : آسمانوں کے اوپر شبِ معراج میں جو وحی ہوئی۔

(۷) الکلام من وراء الحجاب : پردے کے پیچھے سے اللہ کا براہِ راست بات کرنا۔

بعض حضرات نے آٹھویں صورت یہ بیان کی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے براہِ راست اور پردے کے بغیر (بغیر حجاب) بات کی جائے، مگر یہ ان حضرات کی رائے ہے جو کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے معراج کی رات اللہ کو بغیر حجاب کے بھی دیکھا تھا۔ یہ سلف اور خلف کے درمیان ایک اختلافی مسئلہ ہے۔ جمہور صحابہؓ حضرت عائشہؓ کی اِس رائے سے متفق ہیں کہ شبِ معراج میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اللہ تعالیٰ کو بلا حجاب نہیں دیکھا، بلکہ جبریلِ امین کو ان کی اصلی شکل میں دیکھا تھا۔ امام دارمیؒ نے تو اس پر صحابہ کرامؓ کا اجماع بھی نقل کیا ہے[1]

حافظ ابوالقاسم سُہیلیؒ (متوفی ۵۸۱ھ) نے نزولِ وحی کی سات صورتیں بیان کی ہیں، مگر ساتویں قسم میں وحی بذریعۂ اسرافیلؑ کا ذکر ہے جس کی تائید میں مسند احمدؒ میں امام شعبیؒ کی ایک مُرسل روایت موجود ہے[2]

وحی شرعی کی عظمت :

وحی مصدر ہے جس کے معنی ہیں "پیغام بھیجنا" "خبر دینا"۔ اس کے لئے چار چیزوں کی

---

[1] زاد المعاد۔ ج ۱، ص ۷۸ تا ۸۰ ملخصاً و مشرحاً۔

[2] عمدة القاری۔ ج ۱ ص ۴۰ بدء الوحی۔

ضرورت ہے۔ مُوحِیْ پیغام بھیجنے والا۔ واسطہٗ وحی جس کے ذریعے پیغام بھیجا جائے مُوحیٰ اِلَیہٖ جس کے پاس پیغام آیا ہو اور موحیٰ بہٖ وہ بات، حکم اور پیغام جو بھیجا گیا ہو۔ بھیجنے والا، یعنی اللہ بھی نُور ہے۔ واسطۂ وحی، یعنی جبرئیل بھی نور ہے، جس کے پاس پیغام بھیجا گیا ہے، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم وہ بھی نور اور سراجِ منیر ہے اور جو پیغام بھیجا گیا ہے، یعنی قرآن کریم وہ بھی نُور ہے۔

آغازِ وحی میں اچانک، بغیر انتظار اور توقّع کے جب ان اَنْوَارِ اَرْبَعہ کا اجتماع ہوا، تو تھوڑی دیر کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی زبانِ مبارک ثقلِ وحی اور عظمتِ وحی کی وجہ سے رُک گئی تھی۔ آپؐ نے فرمایا: مَا اَنَا بِقَارِیٍٔ۔ اس کا صحیح مفہوم یہی ہے کہ وحی کی شدّت اور عظمت وثقل کی وجہ سے میری زبان چلتی نہیں ہے۔

پیغام کی عظمت پیغام بھیجنے والے کی عظمت پر موقوف ہوتی ہے بھیجنے والا خود خالقِ کائنات ہے جس کی مثال نہیں ہے اور وہ ہر عیب سے پاک ہے، تو اس کی وحی بھی عظیم الشّان اور بے مثال ہے۔ جس فرشتے کے ذریعے وحی آتی تھی وہ بھی معصوم ہے اور جس نبیؐ کے قلب پہ یہ وحی اترتی تھی وہ بھی معصوم اور طیّب النّفس تھے جب وحی آتی تھی، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو اسی عظمت وثقل کے احساس کی وجہ سے جاڑوں کے سرد ترین دن میں بھی پسینہ آجاتا تھا اور جَبِیْنِ اَطْہَر سے موتیوں کی طرح پسینے کے قطرے ٹپکتے تھے۔ سواری کی حالت میں اگر وحی آجاتی، تو آپ کی اونٹنی آپ کا بوجھ مشکل سے اٹھاتی تھی۔

زید بن ثابتؓ کی ران پہ آپؐ کا سرِ مبارک تھا کہ صرف کلمہ غَیْرُ اُولِی الضَّرَرِ نازل ہوا تو حضرتِ زیدؓ فرماتے ہیں کہ میری ران ٹوٹ رہی تھی، لیکن عظیم وثقیل وحی کی عظمت و ثقل کو پوری طرح وہی رسول صلی اللہ علیہ وسلّم محسوس فرما سکتے ہیں جو خود بھی عظیم ہیں اور بھاری شان رکھتے ہیں۔

رسالت و نبوت کے لغوی معنی

وحی کی حقیقت اور مفہوم سمجھنے کے بعد اب رسالت اور نبوّت کے لغوی اور شرعی معنی بیان کئے جاتے ہیں :

رسالت کے معنے ہیں پیغام ۔ اِرسال کے معنے ہیں پیغام بھیجنا اور مُراسلۃ کے معنے ہیں پیغامات کا تبادلہ کرنا ۔ قرآن کریم میں یہ لفظ بھیجنے کے معنوں میں بکثرت استعمال ہوا ہے ۔ مثلاً :

هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ الرِّیٰحَ بُشْرًا بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ ۚ (الفرقان ۔ ۴۸)

(خدا وہی ہے جس نے ہواؤں کو بھیجا ہے، بارانِ رحمت سے پہلے بشارت کے لئے)

رسالت دراصل سفارت اور نمائندگی کا ہم معنے لفظ ہے اور رسول و مُرسل کے معنے ہیں پیغام پہنچانے والا اور نمائندگی کرنے والا ۔

لفظ نبوّت کا مادہ : ن ۔ ب ۔ و بھی ہوسکتا ہے اور ن ۔ ب ۔ ء بھی پہلے مادے کے اعتبار سے اس کا مصدر نَبْوَۃٌ اور نَبَاوَۃٌ آتا ہے جس کے معنے ہیں بلندی اور عظمت ۔ عرب کہتے ہیں :

نَبَأَ بفلان مکانُهٗ (فلاں شخص کو اس کے مکان نے اونچا کر دیا ہے)

زمین کی سطح مرتفع کو عربی زبان میں نَبْوَۃٌ بھی کہا جاتا ہے ۔ اِس مادے کے اعتبار سے نَبِیٌّ اصل میں نَبِیْوٌ ہے جس کے معنے ہیں رَفِیْعٌ اور عَلِیٌّ یعنی بلند مرتبہ اور عظیم شخصیت ۔

دوسرے مادے کے اعتبار سے اس کا مصدر ہے نَبَأٌ جس کے معنے ہیں "عظیم اور سچّی خبر دینا" امام راغبؒ لکھتے ہیں :

النَّبأُ خبر ذو فائدۃ عظیمۃ یحصل بہ علم او غلبۃ

ظنّ ولا یقال للخبر فی الاصل نبأ حتیٰ یتضمّن هٰذه الاشیاء الثلٰثة ۔ وحق الخبر الذی یقال فیه نبأ ان یتعرّیٰ عن الکذب کالتواتر وخبر اللّٰه تعالیٰ وخبر النبی صلی اللّٰه علیه وسلّم[1]

(نَبَأ اُس خبر کو کہتے ہیں جو بڑے فائدے کی ہو۔ جس سے سننے والے کو یقین[2] حاصل ہو یا جس سے سننے والے کو ظنِ غالب[3] حاصل ہو۔

جس خبر میں یہ تین خاصیتیں نہ ہوں وہ حقیقت میں نَبَأ کہلانے کی مستحق نہیں ہے۔ نَبَأ کہلانے کی مستحق وہی خبر ہو سکتی ہے جو جھوٹ سے بالکل خالی ہو۔ مثلاً خبرِ متواترہ یا اللّٰہ کی جانب سے دی گئی خبر یا نبیؐ کی جانب سے دی گئی خبر۔)

قرآنِ کریم کی متعدد آیات میں یہ لفظ عظیم خبر، یعنی بڑی خبر کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً :

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ ابْنَيْ آدَمَ بِالْحَقِّ (المائدہ ۔ ۲۷)

(اور ان کے سامنے آدمؑ کے دو بیٹوں کی بڑی خبر بیان کرو سچائی کے ساتھ)

حضرت آدمؑ کے ان دو بیٹوں، یعنی ہابیل اور قابیل کی اس خبر میں بڑی عبرت اور نصیحت پوشیدہ ہے اس وجہ سے اس کو بڑی خبر کہا گیا ہے۔

قرآن کریم کے ۸۰ مقامات پر لفظ نبأ عظیم اور سچی خبر کے معنوں میں آیا ہے۔

اس مادے کے لحاظ سے نَبِیٌّ اصل میں مُنْبِیْءٌ ہے، جس کے معنے ہیں عظیم اور سچی خبر دینے والا۔ خدا کا نبیؐ بھی اُس کی جانب سے احکام دینے والا ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ اللّٰہ کے احکام اور اُس کی خبریں سچی بھی ہوتی ہیں اور عظیم المنافع بھی۔ اس لئے اُس عظیم انسان کو نبی کہا جاتا ہے جو اللّٰہ کی جانب سے احکامِ شرعیہ کی تبلیغ و تعلیم پہ مامور ہو۔

---

[1] مفردات القرآن ۔ ص۴۹۹ ۔ باب النون مع الباء ۔

رسالت و نبوت کی حقیقتِ شرعیہ

امام راغب اصفہانیؒ نے مفردات میں اور علّامہ سعد الدین تفتازانیؒ نے شرح عقائد میں نبوّۃ کی حقیقتِ شرعیہ ان الفاظ میں بیان کی ہے :

والنّبوۃ سفارۃ بین اللہ وبین ذوی العقول من عبادہ لازاحۃ علتھم فی امر معادھم ومعاشھم۔[1]

(نبوّت سفارت اور نمائندگی ہے اللہ اور اُس کے ذی عقل بندوں کے درمیان، تاکہ اُن کے اُخروی اور دنیوی امور میں نقص اور خرابی کا ازالہ کیا جائے)

درج بالا تعریف میں نبوّت کی چار خصوصیات بیان ہوئی ہیں :

(۱) نبوّۃ و رسالت نہ اُلوہیت ہے، نہ ابنیتِ خدا ہے اور نہ ہی یہ کوئی فلسفیانہ علم ہے بلکہ خدا کی جانب سے سفارت، نمائندگی اور پیغام رسانی ہے۔ سفیر وہ ہوتا ہے جو بادشاہ کا پیغام پہنچائے۔ خود بھی اُس پیغام کا پابند رہے اور دوسروں کو بھی اس کا پابند بنانے کی کوشش کرے۔

فلسفے کی اساس عقل و فکر ہے، لیکن نبی کے علوم و معارف کا سرچشمہ وحیِ الٰہی ہوتی ہے جو فرق عقل اور خالقِ عقل کے درمیان ہے وہی فرق فلسفے اور وحی کے درمیان ہے۔ نبی کی تعلیمات حقائق پر مبنی ہوتی ہے اور فلسفی کا فکر و فلسفہ ظنیات پر۔

(۲) دوسری بات اس تعریف سے یہ معلوم ہوئی کہ نبی کی تعلیمات ذی عقل بندوں کے لئے ہوتی ہیں، انسان ہوں یا جن ہوں۔ مجنون اور دوسرے غیر ذی عقل لوگ ان تعلیمات کے مکلّف نہیں ہوتے۔

(۳) تیسری بات اس تعریف سے یہ ثابت ہوئی کہ نبوّت راہبوں اور جوگیوں کے طریقے کا نام نہیں

---

[1] مفردات القرآن - ص ۴۹۹ و شرح عقائد، بحثِ نبوۃ -

ہے۔ رسالت و نبوت نفس کُشی اور ترکِ دنیا کی تعلیم نہیں دیتی، بلکہ تعمیرِ دنیا اور اصلاحِ دنیا کی تعلیم دیتی ہے۔ صرف اُخروی فلاح ہی نہیں، بلکہ فلاحِ دارین کا راستہ بتاتی ہے۔ یہ ادراک عطا کرتی ہے کہ فلاحِ اُخروی اور "حیٰوۃ طَیِّبَہ" اُن صالحین ہی کو نصیب ہوگی جو اس دنیا میں اپنے اندر صلاحیت و قابلیت پیدا کر لیں گے۔

(۴) چوتھی بات یہ معلوم ہوئی کہ نبوت محنت و کسب سے نہیں مل سکتی، بلکہ یہ تو خالص وَہبی چیز ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی شخص محنت سے خود بخود سفیر نہیں بن سکتا جبتک کہ اُس کو اس منصب پر کسی نے مقرر نہ کیا ہو۔

قرآن میں لفظِ رسالت و نبوت کے مشتقات اور ہم معنی الفاظ

لفظِ رسالت قرآنِ کریم میں ۴۲۶ مقامات پر اور لفظِ نبوّت ۸۰ مقامات پر اور لفظِ بعثت بمعنے نبوّت ۱۸ مقامات پر آیا ہے۔ تفصیل درج ذیل ہے:

رسالۃ بصیغۂ فعل	۷۱	مرتبہ
رسالۃ بصیغۂ اسم	۳۴۶	"
رسالۃ بصیغۂ مصدر	۹	"
نبوۃ بصیغۂ اسم	۷۵	"
نبوۃ بصیغۂ مصدر	۵	"
بعثت بمعنۂ نبوّت	۱۲	"
کل مقامات:	۵۱۸	

اِن تمام مقامات پر یہی حقیقت بیان ہوئی ہے کہ نبوّت و رسالت ریاضت و مجاہدہ یا فطری قابلیت و لیاقت سے خود حاصل نہیں کی جاسکتی، بلکہ انتخابِ خداوندی ہی سے مل سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ خود نبی بناتا ہے اور خود ہی اس کی تربیت کرتا ہے:

وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَجْتَبِیْ مِنْ رُّسُلِہٖ مَنْ یَّشَآءُ (آل عمران۔۱۷۹)

(اور لیکن اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے منتخب کر لیتا ہے۔)

اَللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہٗ (الانعام - ۱۲۴)
(اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اپنی پیغامبری کا کام کس سے لے)

بشریتِ انبیاء و رُسل :

نبی اور رسول کا کام صرف پیغام پہنچانا اور سنانا ہی نہیں ہوتا، بلکہ قولی شہادت کے ساتھ عملی شہادت دینا اور اسلامی احکام کا عملی نمونہ پیش کرنا بھی اُس کے فرائض نبوّت میں شامل ہوتا ہے۔ اسے انسانی احوال پر احکامِ شریعۃ کا انطباق کرنا ہوتا ہے۔ دعوت قبول کرنے والوں کی تنظیم و تربیت کرنی ہوتی ہے، تاکہ اسلامی معاشرہ وجود میں آئے اور انکار و مزاحمت کرنے والوں کے مقابلے میں جدّوجہد کرنی ہوتی ہے، تاکہ بگاڑ و فساد کی قوّتوں کا استیصال کیا جائے۔ یہ سارے کام انسانوں ہی میں کرنے کے ہیں، لہٰذا ان کے لئے انسان اور بشر ہی کو بھیجا جانا چاہئے۔ انسانوں کی نفسیات اور عادات و اطوار کو ایک انسان ہی سمجھ سکتا ہے۔ انسانوں میں رہ کر انسانی زندگی میں منشائے الٰہی کے مطابق اصلاح کر کے دکھانا کسی فرشتے کے بس کا کام نہیں ہے۔ اِلّا یہ کہ اُسے بھی بشری صفات دیدی جائیں اور انسان بنا دیا جائے۔ اس کے لئے تو ایک بشر اور انسان ہی موزوں ہوسکتا ہے؛ چنانچہ علیم و حکیم خدا نے انسانوں کی تعلیم و تبلیغ کے لئے ہمیشہ انسانوں ہی کو منصبِ نبوّت کے لئے منتخب کیا اور سارے انبیاء و رُسل بشر ہی تھے۔ ہر دور کے مشرکین کا یہ جاہلانہ تصور یا معاندانہ اعتراض رہا ہے کہ بشر اور انسان کو نبوت کیوں دی گئی ہے؛ یعنی انبیاء کی بشریّت کا انکار اور استبعاد مشرکین کا تصور ہے، موحّدین کا نہیں۔

"اُن کے پاس اُن کے رسول کھلی کھلی دلیلیں لے کر آتے رہے، مگر انہوں نے کہا کیا بشر اور انسان ہماری راہنمائی کریں گے؟ اسی بنا پر انہوں نے کفر کیا اور منہ موڑ لیا۔" (التغابن - ۶)

قومِ نوحؑ اور قومِ ہُودؑ نے کہا تھا: مَا ھٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ (المومنون آیات ۲۴ و ۳۳)

(نہیں ہے یہ شخص (یعنی نوحؑ یا ہودؑ) مگر ایک بشر تم جیسا)

قوم ثمود نے بھی یہی کہا تھا کہ "ہم کیا اپنے میں سے ایک بشر کی پیروی کریں؟" (القمر ۲۴)

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے بارے میں کفّارِ مکّہ بھی یہی کہتے تھے (الانبیاء ۳)

قرآن کریم میں پوری صراحت کے ساتھ اس مشرکانہ خیال کی تردید کی گئی ہے اور کھلے الفاظ میں صاف صاف کہا گیا ہے:

وَمَا أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ إِلَّا رِجَالًا نُّوحِي إِلَيْهِمْ فَاسْأَلُوا
أَهْلَ الذِّكْرِ إِن كُنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۝
وَمَا جَعَلْنَاهُمْ جَسَدًا لَّا يَأْكُلُونَ الطَّعَامَ
وَمَا كَانُوا خَالِدِينَ ۝ (الانبیاء ۷-۸)

(اور پیغام نہیں بھیجا ہم نے تجھ سے پہلے، مگر مردوں ہی کو، وحی بھیجتے تھے ہم اُن کے پاس۔ پس پوچھ لو یاد رکھنے والوں سے (اہل کتاب سے) اگر تم نہیں جانتے اور نہیں بنائے تھے ہم نے اُن کے ایسے جسم کہ وہ کھانا نہ کھاتے اور نہیں تھے وہ ہمیشہ رہ جانے والے)

یعنی انبیاء و رُسُل کی بشریت اتنی صاف اور کھلی بات ہے کہ اس سے تو اہلِ کتاب؛ یعنی یہود ونصاریٰ بھی انکار نہیں کر سکتے۔ اگر تمہارے پاس اس کھلی حقیقت اور مشہور و معروف بات کا علم بھی نہیں ہے تو اُن سے پوچھ لو کہ جو انبیاء و رُسُل پہلے گزرے ہیں وہ بشر تھے یا آسمان کے فرشتے تھے۔ سارے انبیاء و رُسُل میں بشری خصائص موجود تھے۔ اُن کا جسم بشری جسم تھا ملکی نہیں تھا کہ اُن کو کھانے کی حاجت پیش نہ آتی، نہ وہ خدائی صفات کے حامل تھے کہ کبھی موت او رقضا نہ آئے اور ہمیشہ زندہ رہیں۔

بشریتِ رسول کی مصلحت بیان کرتے ہوئے سورت بنی اسرائیل میں فرمایا:

قُل لَّوْ كَانَ فِي الْأَرْضِ مَلَائِكَةٌ يَمْشُونَ مُطْمَئِنِّينَ
لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِم مِّنَ السَّمَاءِ مَلَكًا رَّسُولًا (بنی اسرائیل ۹۵)

(اِن سے کہدو کہ اگر زمین میں فرشتے اطمینان سے چل پھر رہے ہوتے تو ہم

اتارتے اُن پہ آسمان سے کوئی فرشتہ رسول بنا کر)

یعنی زمین اگر فرشتوں کی بستی ہوتی، تو رسول بھی فرشتہ بھیجا جاتا، لیکن یہ تو انسانوں کی بستی ہے۔ اگر ان کے پاس فرشتہ اُس کی اپنی صورت میں رسول بنا کر بھیجا جاتا تو اُس سے علم اور فائدہ حاصل کرنا تو الگ بات ہے اِن کی آنکھیں اور دل برداشت ہی نہ کر سکتے۔ اور اگر فرشتے کو بشری شکل و صورت میں بھیجا جاتا، تو یہ پھر بھی اسی اشتباہ میں پڑے رہتے کہ بشر کو کیوں بھیجا گیا ہے۔ ! جیساکہ سورۂ الانعام آیت ۹ میں فرمایا :

وَلَوْ جَعَلْنَاهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنَاهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِم مَّا يَلْبِسُونَ ۝

(اور اگر ہم رسول بنا کر بھیجتے کسی فرشتے کو، تو بناتے ہم اُس کو مرد کی شکل میں اور اُن کو اسی شبہے میں ڈالتے جس میں وہ پڑ رہے ہیں)

یعنی فرشتے کی اصلی صورت کو تو تم برداشت ہی نہیں کر سکتے اور اُس کو انسانی شکل دینے سے تمہارا شبہہ زائل نہیں ہو سکتا، ہاں اللہ تعالیٰ جس انسان کو نبوّت کے لئے چن لیتا ہے اُس کے اندر فرشتے کو دیکھنے اور اُس سے وحی حاصل کرنے کی صلاحیت پیدا کر دیتا ہے۔ وہ بشر ہوتے ہوئے بھی مَلَکی صفات سے متصف ہوتا ہے۔

بشریتِ انبیاء سے متعلق آیات

قرآنِ کریم میں انبیاء و رُسُل کے بشر ہونے کے بارے میں متعدد آیات موجود ہیں، لیکن وہ آیات جن میں لفظِ بشر کے ساتھ رسولوں کے انسان ہونے کا ذکر آیا اُن کی تعداد ۲۵ ہے اور اُن آیات کی تعداد ۱۴ ہے جن میں انبیاء کو رجال کہا گیا ہے۔

(نقشہ آیندہ صفحہ پہ ملاحظہ فرمائیں)

وہ آیات جن میں انبیاء کو بشر کہا گیا ہے :

نام سورۃ	نمبر آیت	نام سورۃ	نمبر آیت	نام سورۃ	نمبر آیت
آل عمران	۷۹	الکہف	۱۱۰	یٰس	۱۵
الانعام	۹۱	الانبیاء	۳	ص	۷۱
ھود	۲۷	الانبیاء	۳۴	حم السجدہ	۶
ابراھیم	۱۰	المؤمنون	۲۴	الشوریٰ	۵۱
ابراھیم	۱۱	المؤمنون	۳۳	القمر	۲۴
الحجر	۲۸	المؤمنون	۳۴	التغابن	۲۵
الحجر	۳۳	المؤمنون	۴۷	المدثر	۲۵
بنی اسرائیل	۹۳	الشعراء	۱۵۴		
بنی اسرائیل	۹۴	الشعراء	۱۸۶		

وہ آیات جن میں انبیاء کو رجال کہا گیا ہے :

نام سورۃ	نمبر آیت	نام سورۃ	نمبر آیت	نام سورۃ	نمبر آیت
الاعراف	۶۳	النحل	۴۳	المؤمنون	۳۸
الاعراف	۶۹	بنی اسرائیل	۹۴	الفرقان	۸
یونس	۲	الانبیاء	۷	السباء	۷
یوسف	۱۰۹	السباء	۴۳	غافر	۲۸
الانعام	۹	المؤمنون	۲۵		

نبی اور رسول طیب و معصوم ہوتا ہے :

وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ ط مَا كَانَ لَهُمُ

اَلْخِیَرَۃُ ط سُبْحَانَ اللّٰہِ وَ تَعَالٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ ٥

(اور تیرا رب پیدا کرتا ہے جسے چاہے اور پسند کرتا ہے (چُن لیتا ہے) جسے چاہے۔ نہیں ہے ان کے ہاتھ میں پسند کرنا۔ اللہ پاک ہے اور برتر ہے اُن چیزوں سے جن کو یہ لوگ اُس کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں)

یعنی ہر چیز کا پیدا کرنا بھی اللہ کے اختیار میں ہے اور کسی چیز کو پسند کرنے یا چھانٹ کر منتخب کر لینے کا حق بھی اُسی کو حاصل ہے۔ جو اُس کی مرضی ہو احکام بھیجے۔ جس شخص کو مناسب جانے کسی مخصوص منصب پر فائز کر دے۔ جس کسی میں اِستعداد (اِنَابَتْ) دیکھے اُسے راہِ راست پر چلا کر کامیاب بنادے۔ اور مخلوقات کی ہر جنس میں سے جس نوع یا نوع میں سے جس فرد کو چاہے اپنی حکمت کے مطابق دوسرے انواع و افراد میں سے ممتاز بنادے۔ اُس کے سِوا کسی دوسرے کو اس طرح کے اختیار و انتخاب کا حق حاصل نہیں ہے۔ حافظ ابنِ قیمؒ نے آیتِ مذکورہ کے اِس مضمون و مفہوم کو بسط و تفصیل کے ساتھ لکھا ہے اور مثالوں کے ذریعے اس کی تشریح کی ہے۔ اس انتخاب و اجتبار کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اللہ کی ذات طیّب ہے، یعنی ہر قسم کے نقص و عیب سے پاک ہے۔ اور طیّب، خبیث کو پسند نہیں کرتا۔ اِسی قاعدے کی بنا پر لوگوں کو طیّب اور سعید بنانے کے لئے اُسی بشر کو کارِ نبوّت کے لئے منتخب کیا جاتا ہے جو باطن اور ظاہر دونوں کے اعتبار سے طیّب اور پاک ہو۔ ظاہر ہے کہ جو خود پاک نہ ہو وہ دوسروں کو کیسے پاک بنائے گا! اللہ کا نبی ہر لحاظ سے پاک اور سعید ہوتا ہے۔ اس کی روح بھی طیّب اور سعید ہوتی ہے اور جسم بھی پاکیزہ اور حسین ہوتا ہے۔ اُس کے اخلاق اور اعمال پاک ہوتے ہیں، اُس کی باتیں پاکیزہ اور میٹھی ہوتی ہیں، اُس کا کھانا پینا پاک ہوتا ہے، اُس کا لباس پاک ہوتا ہے اور اُس کی ساری زندگی طیّب اور پاک ہوتی ہے۔"[1]

---

[1] "زاد المعاد فی ھدی خیر العباد"، طبع بیروت ١٩٧٩ء۔ ج ١ ص ٣٩ تا ٦٨۔

امام شہرستانیؒ اپنی کتاب "نہایۃ الاقدام فی علم الکلام" میں لکھتے ہیں:

یصطفیھم من الخلق فعلاً بکمال الفطرۃ ونقاء الجوھر وصفاء العُنصر وطیب الاخلاق وکرم الاعراق فیرفعھم مرتبۃ حتیٰ اذا بلغ اشدّہٗ وبلغ اربعین سنۃً وکملت قوتہ النفسانیۃ وتھیئت لقبول الاسرار الالٰھیّۃ بعث الیھم ملکاً وانزل علیھم کتاباً۔

(اللہ تعالیٰ انبیاءؑ کو اپنی مخلوق میں سے چن لیتا ہے اور برگزیدہ بنا لیتا ہے۔ فطرت کے کمال اور جوہر کی پاکیزگی کے اعتبار سے بھی اور اخلاق کی پاکیزگی اور طبیعت کی شرافت کے اعتبار سے بھی وہ اُن کو درجہ بدرجہ بلند کرتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ چالیس سال کی عمر کے ہو کر اپنی قوت کو پہنچ جاتے ہیں، ان کی باطنی قوت کامل ہو جاتی ہے اور وہ اسرارِ الٰہیّہ کو قبول کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں، تو پھر اللہ تعالیٰ اُن کے پاس اپنا فرشتہ بھیج دیتے ہیں اور اپنی کتاب ان پہ نازل فرما دیتے ہیں:

قاضی عیاضؒ (متوفی ۵۴۴ھ) لکھتے ہیں:

"تمام اخلاقِ حمیدہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خلقت اور پیدائش میں رکھ دیئے گئے تھے۔ یہ کمالات کسب و ریاضت سے نہیں، بلکہ جُودِ الٰہی اور انتخابِ ربّانی سے آپؐ کو ملے تھے اور یہی حالت سارے انبیاء کی ہوتی ہے[1]۔"

علاّمہ ابنِ خَلدُونؒ نے "مقدمہ" میں نبوّت کی خصوصیات اپنے مخصوص انداز میں بیان فرمائی ہیں۔ مقدمہ ابنِ خلدون کی تکمیل ۷۹۹ھ میں ہوئی تھی جیسا کہ اُنہوں نے خود مقدمہ کے آخر میں لکھا ہے۔ اُن کے بیان کا خلاصہ یہ ہے:

---

[1] الشفاء بتعریف حقوقِ المصطفیٰ، ج ۱، ص ۲۰۶، طبع دمشق ۱۳۹۲ھ۔ باب ثانی فصل عاشر۔

"یہ سارا جہان محکم ترتیب کے ساتھ قائم ہے جس کی ہر جنس اور ہر نوع میں ارتقائی اور تدریجی تغیّرات مشاہدے میں آرہے ہیں۔

نوعِ انسانی میں بھی مختلف صلاحیتیں اور قابلیتیں پیدا کی گئی ہیں۔

انسانوں کی ایک ایسی قسم بھی ہے جن کے اندر بشریت سے کٹ کر جسمانی اور رُوحانی، یعنی ظاہری اور باطنی دونوں جہتوں سے آسمانی فرشتوں کی جانب متوجّہ ہو جانے کی استعداد اور قابلیت فطرتاً رکھ دی گئی ہے، تاکہ وہ تھوڑی دیر کے لئے گویا عملاً (بالفعل) فرشتہ بن جائیں اور اُن کو مَلأِ الاَعْلٰی (بلند ترین اور مقدّس فرشتے) آسمان کے اُفق پہ دکھائی دیں اور اُس وقت وہ خدا کا کلام سُن سکیں۔ یہ خدا کے رسول ہوتے ہیں جن کو اُس نے وحی کی حالت میں بشریت سے بالاتر ہو جانے کی استعداد عطا فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کی فطرت اور سرشت میں وہ قوتِ ارادی اور استقامت پیدا فرمائی تھی جس کی وجہ سے وہ عالمِ بالا کی طرف متوجّہ ہو جاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی طبیعت میں عبادت کی رغبت فطری طور پہ پیدا فرمائی تھی جس میں اُن کے کسب و ریاضت کو کوئی دخل نہیں ہوتا تھا"[1]

حکیم الامّت شاہ وَلی اللہ محدثِ دہلوی (متوفی ۱۱۷۶ھ) نے "حُجَّۃُ اللّٰہِ البَالِغَہ" کے قسمِ اوّل میں نبوّت کی حقیقت اور اُس کے خواص کے بیان کے لئے مستقل باب قائم کیا ہے۔ یہ باب بڑا دلچسپ ہے، لیکن اندازِ بیان دقیق اور فلسفیانہ ہے۔ اس کا خُلاصہ اور مفہوم یہ ہے:

"واضح رہے کہ انسانی طبقات میں سب سے بڑا اور بلند مرتبہ طبقہ اُن لوگوں کا ہے جن کو فہم دیا گیا ہے۔ (اَلْمُفَھَّمُوْنَ) یہ لوگ اعتدال پہ قائم رہتے ہیں۔ اُن کی قوتِ مَلکیہ انتہائی بلند ہوتی ہے۔ یہ حضرات حقّانی جذبات سے اِس

---

[1] مقدمہ ابن خلدون۔ طبع بہیہ مصر۔ بحث نبوت، ص۸۵۔

نظام کے قائم کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں جو خدا کو مطلوب ہوتا ہے ۔ عالمِ بالا کے مَلَاء الاَعْلیٰ کی جانب سے اُن پر علوم اور اَحْوالِ الٰھیّہَ نازل ہوتے ہیں ۔ اِن (مُفَہَّمُوْن) کے لئے ضروری ہے کہ اُن کی سیرت اور مزاج میں اعتدال ہو ۔ صورت اور سیرت دونوں میں تناسب ہو ۔ راہِ راست کی پابندی تمام لوگوں سے زیادہ کرتے ہوں ۔ عبادات میں اچھی عادت رکھتے ہوں، لوگوں کے ساتھ معاملات میں انصاف کرتے ہوں ۔ عمومی اصلاحات اور مفادِ عامہ کو پسند کرتے ہوں[1]۔"

مولانا مودودیؒ (متوفیٰ ۱۳۹۹ھ) مقامِ نبوّت کا ذکر اس طرح کرتے ہیں :

" لیکن بشریّت کی تمام صفات سے متصف ہونے کے باوجود اور جملہ انسانی جذبات، احساسات اور خواہشات رکھتے ہوئے بھی وہ ایسا نیک نفس اور خدا ترس ہوتا ہے کہ جان بوجھ کر کبھی گناہ نہیں کرتا ۔ وہ اپنے ضمیر میں اپنے رب کی ایسی زبردست حجتیں اور دلیلیں رکھتا ہے جن کے مقابلے میں خواہشِ نفس کبھی کامیاب نہیں ہونے پاتی[2]۔"

مولانا مودودیؒ دوسری جگہ نبی کے مقام کا تعیّن اس طرح کرتے ہیں :

" انسانی معاشرہ میں نبی کا مقام انتہائی نازک مقام ہے ۔ ایک معمولی بات بھی جو کسی دوسرے انسان کی زندگی میں پیش آئے تو چنداں اہمیّت نہیں رکھتی ۔ نبی کی زندگی میں اگر پیش آجائے، تو وہ قانون کی حیثیت اختیار کر جاتی ہے ۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء علیہم السلام کی زندگی پر ایسی کڑی نگرانی رکھی گئی ہے کہ اُن کا کوئی ادنیٰ اقدام بھی منشاءِ الٰہی سے ہٹا ہوا نہ ہو، ایسا کوئی فعل بھی اگر نبی سے صادر ہوا ہے تو اُسکی فوراً اصلاح کر دی گئی ہے، تاکہ اسلامی قانون اور اُس کے

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ۔ القسم الاول ۔ باب حقیقۃ النبوّۃ وخواصھا ۔

[2] تفسیر تفہیم القرآن ۔ ج ۲ ص ۳۹۲ ۔ سورۃ یوسف ۔ آیت ۲۴ ۔

اُصول اپنی بالکل صحیح صورت میں نہ صرف خدا کی کتاب، بلکہ نبی کے اُسوۂ حَسَنہ کی صورت میں بھی خدا کے بندوں تک پہنچ جائیں اور اُن میں ذرّہ برابر بھی کوئی ایسی چیز شامل نہ ہونے پائے جو منشائے الٰہی سے مطابقت نہ رکھتی ہو[۱]۔"

مولانا مودودیؒ کا یہ بیان تمام متعلقہ مباحث کا خُلاصہ، حاصلِ بحث اور ایک طرح کا قولِ فیصل ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اصلاحِ خلق کے لئے جن برگزیدہ اور منتخب انسانوں کو منصبِ نبوّت پر فائز کرتا ہے اور فرائضِ نبوّت کی ذمہ داریاں اُن کے سپرد کرتا ہے، اُن کے قلوب کی اصلاح خود کرتا ہے۔ اور تزکیۂ نفوس کا کام جن سے لیتا ہے اُن کے نفوس کو خود طیّب اور پاکیزہ بناتا ہے۔

نبی کامل نظامِ حیات کا مُعلّم ہوتا ہے

قرآنِ کریم میں انبیاء کا فرضِ منصبی تعلیمِ دین، تبلیغِ دین اور اقامتِ دین قرار دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ دینِ اسلام صرف مابعد الطبیعیات اور ماورائے حواس امور کا نام تو نہیں ہے، بلکہ زندگی کے مکمل نظام کا نام ہے، جس میں عقائد و ایمانیات بھی شامل ہیں اور اعمال بھی، عباداتِ محضہ بھی[۲] اس کا حصّہ ہیں اور معاملات بھی، حقوق اللہ بھی اس دین کا جزء ہیں اور حقوق العباد بھی، انفرادی امور بھی اس دین کا ایک شعبہ ہیں اور اجتماعی امور بھی۔

دین کے اس جامع تصوّر سے خود بخود نبوّت کا جامع تصوّر سامنے آجاتا ہے۔ خدا کا نبی اور رسول ترکِ دنیا، فرار عن الدنیا اور رہبانیّت کی تعلیم نہیں دیتا، بلکہ تعمیرِ دنیا اور اصلاحِ خلق کا پیغام لے کر آتا ہے، لیکن یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ دینِ اسلام اور تعلیماتِ نبویّہ کی اصلی اور حقیقی غرض اور غایۃ الغایات رضائے الٰہی اور فلاحِ اُخروی کا حصُول ہوتا ہے۔ دنیوی مفاد پر اخروی مفاد کو ترجیح دینا زُھد ہے، اور ترکِ دنیا کا نام رُھبانیت ہے۔ اللہ کا نبی زاہد تو ہوتا ہے، مگر راھب نہیں ہوتا۔ اگر دینِ اسلام کی تبلیغ و تعلیم اور اقامتِ دین کی جدّ و جُہد

---

[۱] تفہیم القرآن۔ ج ۶، ص ۱۰-۱۱۔ دیباچہ سورۂ تحریم۔

[۲] مظاہر بندگی۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ۔

ترک کرنے کے عوض میں نبی کو سارے عالَم کی حکومت وسلطنت اور مال ودولت پیش کی جائے' تو وہ اُس کو نہ صرف یہ کہ پائے حقارت سے ٹھکرا دیتا ہے' بلکہ اُس کے دل میں اسے حاصل کرنے کا خیال تک نہیں آتا، اور وہ اُسے پرِکاہ کی حیثیت بھی نہیں دیتا، لیکن اگر یہ حکومت وسلطنت اور مال ودولت دینِ اسلام کے نفاذ اور منشاءِ خداوندی کے مطابق تبلیغ وتعلیم کے لئے مل سکتی ہو' تو پھر اللہ کا نبی اُسے حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور مطالبہ کر دیتا ہے کہ اِجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ (زمین کے خزانے میرے حوالے کر دو)

ارکانِ نبوّت :

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے نبوّت کی امتیازی خصوصیات کا بڑے اچھے انداز میں تجزیہ کیا ہے' ان کی تصانیف ازالۃ الخفا مقصد دوم اور قرۃ العینین میں یہ مضمون موجود ہے۔ یہاں پہ قُرۃ العینین سے اس کی تلخیص نقل کی جاتی ہے۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں :

"اگر تم نبی اور اُس کے خواص کو جاننا چاہتے ہو' تو یوں سمجھ لو کہ انسانی زندگی کی تعمیر کے لئے جن جن صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ سب کی سب بیک وقت نبی کی ذات میں دوسرے تمام انسانوں سے بڑھ کر فطرتاً موجود ہوتی ہیں۔

الف : نبی ایک حکمران بھی ہوتا ہے جسے " انسانِ مَدَنی " کہا جاتا ہے' یعنی اجتماعی اور تمدّنی امور کا ماہر انسان جس کی قوّتِ علمیّہ اور قوّتِ عملیّہ کے سائے میں اہلِ علم' صحافی' جرنیل' سیاست دان' کاشتکار اور تاجر غرض یہ کہ تمام عالَم اپنی اپنی زندگی کے دائرۂ کار میں مناسب تربیت حاصل کرتا ہے۔ اور زندگی کے ہر ایک شعبے کا نظام اُس کے حسنِ انتظام کے دم سے قائم رہتا ہے۔

ب ۔ نبی ایک حکیم بھی ہوتا ہے جو علمِ اخلاق' تدبیرِ منزل اور سیاستِ مُدُن کے اُصول کا ماہر ہو۔ وہ حکیم نہیں جو صرف الفاظ سے آشنا ہو' بلکہ وہ حکیم جس کی تمام صفات اُس کی طبیعتِ ثانیہ بن چکی ہوں۔ حتیٰ کہ اُس کی زندگی کی ہر حرکت سے علوم وحِکَمْ جھلکتے نظر آرہے ہوں۔

ج : نبی ایک مُرشدِ کامل اور مُربّی بھی ہوتا ہے جو طاعات و عبادات اور اشغال و اذکار کے اُن تمام طریقوں سے بخوبی واقف ہوتا ہے جو تزکیۂ نفس اور تہذیبِ روح کے لئے ضروری ہوتے ہیں، اور اُن علومِ حقّہ کا ماہر ہوتا ہے جن سے انسانوں پر عالمِ ملکوت کے اَسرارِ پنہاں روشن ہوتے ہیں۔

اسی طرح اعمال و اذکار کے خواص سے بھی آشنا ہوتا ہے۔

نبی کے یہ سارے کمالات فطری اور وھبی ہوتے ہیں، کسی تربیت گاہ اور خانقاہ کے رہینِ منّت نہیں ہوتے۔[1]

حضرت شاہ صاحبؒ کے اس بیان کا حاصلِ مقصد یہ ہے کہ نبوّت کے لئے تین بنیادی اوصاف کا ہونا لازمی ہے جن کو ارکانِ نبوّت کا نام بھی دیا جا سکتا ہے:

حکومت و سیاست ـــــ علم و حکمت ـــــ رُشد و ھدایت

اِن تینوں صفات پر عالمِ انسانیّت کی اصلاح موقوف ہے۔ سیاست کے ساتھ اگر حکمت و دانشمندی نہ ہو، تو اس قسم کی جاہلانہ غیر حکیمانہ اور غیر دانشمندانہ سیاست اصلاح کی بجائے فساد اور بگاڑ کا موجب بنتی ہے۔ اسی طرح اگر کسی کے پاس علم و حکمت کی دولت تو موجود ہو، مگر رشد و ہدایت اور تہذیب و تزکیۂ نفوس کا نظام موجود نہ ہو، تو صرف سیاست اور حکمت سے بھی اصلاحی پروگرام نافذ نہیں ہو سکتا۔ کامل تربیت کے لئے کامل مربّی اور کامل اصلاح کے لئے کامل مُصلح کی ضرورت ہوتی ہے اور نبی کے اندر یہ تینوں صفات بدرجۂ کمال موجود ہوتی ہیں۔

---

[1] قرۃ العینین فی تفصیل الشیخین ملخصاً۔ طبع مکتبہ سلفیہ لاہور ۱۹۷۶ء ص ۱۴۱۔۳۴۰

پندرھواں باب

نبی کی ضرورت و اہمیّت

سورۃ النّساء میں ۱۲ انبیاء کے نام لے کر اور باقی کا حوالہ دے کر فرمایا گیا ہے:

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝ (النساء - ۱۶۵)

(یہ سارے رسول خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجے گئے تھے، تاکہ اُن کے بھیجنے (اور سمجھانے) کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے سامنے کوئی حجّت (لاعلمی کا عذر) باقی نہ رہے اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے)

اس مضمون کی آیات قرآن کریم کی دوسری سورتوں میں بھی آئی ہیں مثلاً:

طٰہٰ - ۱۳۴ — بنی اسرائیل - ۱۵ — القصص - ۵۹ — ابراھیم - ۴ — یونس - ۴۷ -

ان آیات میں نبوّت کی ضرورت اور اہمیّت بیان کی گئی ہے کہ اللہ کی حکمت اور عدل کا تقاضا یہ ہے کہ جن کو بھی سزا دے تعلیم و تفہیم اور اتمام حجّت کے بعد دے، تاکہ کسی کے پاس لاعلمی اور بے خبری کا عذر پیش کرنے کا موقع بھی باقی نہ رہے۔ انبیاء اسی لئے مبعوث کئے گئے ہیں کہ وہ اللہ کے بندوں کو اُس کی مرضی اور اُس کے احکام سے باخبر کریں۔ وحی اور رسالت کے علاوہ دوسرا کوئی یقینی اور قطعی ذریعہ نہیں ہے جس سے اللہ کی پسند و ناپسند کا علم حاصل کیا جائے۔ عقلِ انسانی اس بارے میں خود کفیل نہیں ہے اور ہر ایک انسان کے اندر یہ قابلیت اور قوّتِ برداشت نہیں ہے کہ وہ براہِ راست اپنے رب سے ہم کلام ہو سکے۔ ضرورتِ نبوّت کے بارے اِسی قرآنی دلیل کی تشریح احادیثِ رسول ﷺ اور حکماء

اسلام کے اقوال میں کی گئی ہے۔

— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی کو بارش سے تشبیہہ دی ہے کہ جس طرح زمین کی سرسبزی وشادابی بارش پہ موقوف ہے، اسی طرح بنی نوعِ انسان کی معاشرتی زندگی بھی وحیِ الٰہی اور تعلیماتِ رسول ؐ کے بغیر آراستہ وشائستہ اور استوار وخوشگوار نہیں ہو سکتی[1]

ایک دوسری حدیث میں آیا ہے کہ انسان اپنی کم عقلی کی وجہ سے پروانوں کی طرح آگ میں کودتے ہیں اور انبیاء پکارتے ہیں بچو آگ سے۔ بچو آگ سے[2]

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: "میری تعلیمات کی مثال اِس طرح ہے کہ ایک شخص آکر اپنی قوم سے کہتا ہے کہ میں نے دشمن کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور میں تمہیں اُس کے حملے سے پورے اخلاص اور خیر خواہی کے ساتھ خبردار کرتا ہوں۔ اپنے بچاؤ کا انتظام کرلو![3]

دشمن سے مراد شیطان اور شیطانی و طاغوتی قوتیں ہیں۔ انسان بعض شیطانی چالوں اور مکّاریوں کو سمجھ نہیں سکتا اور وہ بُری باتوں کو حسین صورت میں پیش کرکے اس سے منوالیتا ہے انسان کی اپنی خواہشِ نفس بھی ہر وقت حملے کے لئے تیار رہتی ہے۔ جو لوگ تعلیماتِ رسول ؐ کی پیروی کرتے ہیں وہی شیطان اور شیطانی نظام سے محفوظ رہتے ہیں۔ رسالت و نبوّت ہی وہ محفوظ و مضبوط پناہ گاہ اور "حِصنِ حَصِین" ہے۔ جس پر شیطان اور نفس حملہ آور نہیں ہو سکتے۔ بہرحال انسان کے لئے خیر وشر اور نفع ونقصان میں تمیز کرنے کے لئے وحیِ الٰہی اور رسالت ضروری ہے۔

---

[1] صحیح بخاری۔ کتاب العلم۔ باب فضل من عَلِمَ وعَلَّم۔

[2] صحیح بخاری۔ کتاب الانبیاء۔ باب وَوَھَبْنَا لِدَاوُدَ سُلَیْمَانَ

[3] صحیح بخاری۔ کتاب الاعتصام۔ باب الاقتداء بسنن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نبوّت کی ضرورت فلاسفۂ اسلام کی نظر میں

۱۔ ابونصر فارابیؒ :

ابونصر فارابی (متوفی ۳۳۹ھ یا ۳۴۳ھ) اور ابنِ سینا دونوں نے الٰہیات میں بعض گمراہ کن نظریات بھی پیش کئے ہیں۔ ان دونوں نے ارسطو کی تقلید کرتے ہوئے نبوّت کی تشریح سائیکلوجی (علمِ نفسیات) کی روشنی میں کی ہے اور خطرناک غلطیوں کا شکار ہوئے ہیں لیکن نبوّت کی اصل حقیقت معلوم نہ کرسکنے کے باوجود اس کی ضرورت کے نہ صرف یہ کہ قائل تھے، بلکہ اس کو بڑے اچھے انداز میں دونوں نے ثابت بھی کیا ہے۔

فارابی نبی کو رئیسِ اوّل یعنی قائدِ اوّل یا قائدِ اعلیٰ کہتا ہے۔ اپنی کتاب "السیاسۃ المدنیۃ" میں فارابی لکھتا ہے :

> ہر انسان اپنے نفس کے بل بوتے پر اچھی چیزوں اور سعادت کو معلوم نہیں کرسکتا بلکہ اُس کے لئے اُسے مُرشد اور معلّم کی ضرورت ہوتی ہے۔
>
> جس انسان کے اندر راہنمائی اور قیادت کی صلاحیت موجود ہو وہ رئیس (قائد) کہلاتا ہے۔
>
> رئیس کبھی "رئیسِ اوّل" ہوتا ہے اور کبھی "رئیسِ ثانی"۔ رئیسِ ثانی وہ ہوتا ہے جو دوسرے قائد کی راہنمائی میں کام کرتا ہے۔ اور رئیسِ اوّل وہ ہے جو کسی حالت اور کسی چیز میں بھی دوسرے انسانوں سے راہنمائی حاصل کرنے کا محتاج نہ ہو۔ اس کو رئیسِ مطلق بھی کہا جاتا ہے۔
>
> یہی متقدمینِ فلاسفہ (یونانیوں) کے نزدیک بادشاہ ہوتا ہے۔ یہی رئیسِ اوّل اور قائدِ اعلیٰ ہوتا ہے اور اسی کو وحی سے نوازا جاتا ہے[۱]

---

[۱] السیاسۃ المدنیۃ للفارابی۔ طبع بیروت ۱۹۶۴ء، ص ۷۸ ـ ۷۹ ـ

فارابی نے اپنی دوسری کتاب "آراء اہل المدینۃ الفاضلۃ" میں رئیسِ اوّل کو رئیس المدینۃ الفاضلۃ کہا ہے، یعنی اعلیٰ ترین اور ترقی یافتہ معاشرے کا قائد۔ اس کتاب میں رئیسِ اوّل کی صفات کا ذکر کرتے ہوئے فارابی لکھتے ہیں:

ترقی یافتہ معاشرے کے رئیسِ اوّل کے لئے ضروری ہے کہ:

۱۔ وہ جسمانی طور پر تندرست ہو اور اُس کے اعضاءِ جسم مکمل اور مضبوط ہوں۔
۲۔ اُس کی سوچ اور فکر جیّد ہو اور وہ بلندترین فہم کا حامل ہو۔
۳۔ اُس کی قوتِ حافظہ، یعنی یادداشت قوی اور تیز ہو۔
۴۔ خوبصورت ہو۔ علم کو پسند کرتا ہو اور مؤثرترین الفاظ استعمال کرنے پر قادر ہو۔
۵۔ خواہش کی پیروی نہ کرتا ہو اور سچائی، امانت، انصاف اور عزیمت کا حامل ہو۔[1]

۲۔ ابنِ سینا

ابنِ سینا (متوفی ۴۲۷ھ) نے "الاشارات" اور "اثبات النبوات" میں ضرورتِ نبوّت پر بحث کی ہے اور اُس کے خیالات کو امام شہرستانیؒ نے بڑے اچھے انداز میں نقل کیا ہے۔ ان خیالات کا خلاصہ یہ ہے:

یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ انسان اپنی بنیادی ضروریات میں بھی اجتماعیت اور مشارکت کا محتاج ہے۔

اجتماعی زندگی باہمی لین دین اور باہمی تعامل کے بغیر سرے سے ممکن ہی نہیں ہے۔

باہمی لین دین اور معاملات کے لئے کسی ایسے قانون سکھانے والے اور انصاف قائم کرنے والے کا ہونا ضروری ہے جو خود بھی انسان ہو۔

---

[1] المدینۃ الفاضلۃ للفارابی۔ ص۵۹-۶۰۔ بحوالہ الفلسفۃ الاسلامیۃ ص۱۷، طبع مصر ۱۹۶۸ء۔

یہ کسی طرح بھی جائز نہیں ہے کہ لوگوں کو اُن کی عقل کے حوالے کر دیا جائے کہ آپس میں اختلاف کرتے رہیں اور ہر ایک اپنے فائدے کی بات کو انصاف اور ذاتی نقصان کی بات کو ظلم کہنے لگے ۔

اس لیے انسانوں کو ایسے انسان کی ضرورت جو انہیں قانون سکھائے آنکھوں کی پلکوں اور ابرو کے بالوں سے بھی شدید ہے ۔ یہ کسی طرح مناسب معلوم نہیں ہوتا کہ خدا کی ازلی مہربانی جسمانی ضروریات تو پوری کرے ، لیکن یہ بنیادی ضرورت (معلّمِ قانون کی ضرورت) پوری نہ کرے ۔ پس نبی کی حاجت اور ضرورت بہر حال ہے ۔ ایسا نبی جو دلائل و معجزات کی بنا پر باقی انسانوں سے ممتاز ہو، جو شرک سے روکتا ہو اور توحید کی دعوت دیتا ہو، جو قوانین اور احکام کا نفاذ کرتا ہو، جو اخلاقِ عالیہ کی تعلیم و تربیت دیتا ہو، جو بغض و حسد سے منع کرتا ہو اور فکرِ آخرت کی ترغیب دلاتا ہو[1]

۳ ۔ امام غزالیؒ :

امام غزالیؒ (متوفی ۵۰۵ھ) اپنی مشہور کتاب احیاء العلوم میں لکھتے ہیں :

فحاجة الخلق الی الانبیاء کحاجتهم الی الاطبّاء و لکن یعرف صدق الطبیب بالتجربة ویعرف صدق النبی بالمعجزة[2]

(مخلوق کو انبیاء کی اسی طرح احتیاج ہے جس طرح انہیں طبیبوں کی ضرورت ہے، طبیب کی سچائی تجربے سے پرکھی جاتی ہے اور نبی کی سچائی معجزے سے معلوم ہوتی ہے)

---

[1] الملل و النحل ۔ طبع مصر ۱۹۶۸ء ج ۲ ص ۱۹۹ ۔ ۲۰۰ ۔

[2] احیاء العلوم ۔ کتاب العقائد ۔ فصل ثالث ۔ ج ۱ ص ۸۵ ۔

۴۔ امام فخرالدین رازیؒ :

ڈارونزم اور مارکسزم والوں کی بات تو دوسری ہے لیکن بالغ نظر مغربی فلاسفہ کے نزدیک بھی انسان اصل میں روحِ انسانی کا نام ہے۔ جسمِ انسانی کی کرامت وشرافت اسی وجہ سے ہے کہ یہ روحِ انسانی کا مسکن ہے۔ امام فخرالدین رازیؒ نے اس حقیقت کو ثابت کرنے کے لئے ۲۰ عقلی اور ۱۰ نقلی دلائل قائم کئے ہیں کہ اصل انسان روحِ انسانی ہے۔[۱]

"طبیب جسمانی بیماریوں کا علاج کرتے ہیں اور انبیاء روحانی بیماریوں کا۔ اگر نیم حکیم خطرۂ جان ہے تو عقل کا "نیم ملّا" خطرۂ ایمان ہے۔ حیرت ہے اُس شخص پہ جو جسمانی امراض کے علاج کے لئے، تو اپنے آپ کو طبیبوں کا محتاج سمجھتا ہے لیکن روحانی امراض کے لئے نبوت سے اپنے آپ کو بے نیاز سمجھ بیٹھا ہے"۔

۵۔ شیخ الاسلام امام ابنِ تیمیہؒ :

امام حافظ ابن تیمیہؒ (متوفی ۷۲۸ھ) نے اپنی کتاب "موافقۃ صریح المعقول لصحیح المنقول" میں ضرورتِ نبوّت اسی طرح بیان کی ہے جس طرز پر امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں گفتگو کی ہے۔[۲] فتاویٰ ابنِ تیمیہؒ میں اس موضوع پر طویل بحث کی گئی۔ ایک مقام پر لکھتے ہیں :

والرسالۃ روح العالم ونورہ وحیاتہ فأیّ صلاح للعالم اذا عدم الروح والحیوۃ والنور والدنیا مظلمۃ ملعونۃ الا اذا طلعت علیہ شمس الرسالۃ۔[۳]

---

[۱] کتاب النفس والروح۔ طبع پاکستان ۱۹۶۸ء۔ ص ۳۰ تا ۴۹۔

[۲] برحاشیہ منہاج السنۃ۔ طبع مصر ۱۳۲۱ھ۔ ج ۱ ص ۷۹۔

[۳] فتاویٰ ابن تیمیہ۔ ج ۱۹ ص ۹۳، طبع ریاض ۱۳۸۲ھ۔

(رسالت اس دنیا کی جان ہے، روشنی ہے اور زندگی ہے۔ اس جہان کی اصلاح کیسے ہوسکتی ہے، جب اس کی روح اور جان نہ ہو، روشنی نہ ہو اور زندگی نہ ہو۔ یہ دنیا تاریک بھی ہے اور ملعون بھی جبتک اس پر رسالت کا سورج طلوع نہ ہوا)

سب سے بڑی تاریکی شرک اور جہالت کی تاریکی ہے جو علم نبوّت کا سورج طلوع ہونے ہی سے ختم ہوسکتی ہے جو روحانی زندگی کو منور کرتا ہے۔

۶۔ علّامہ ابنؒ ہمام حنفی :

علّامہ ابن ہمام حنفی (متوفی ۶۸۱ھ) رقمطراز ہیں :

(ضرورتِ نبوت کی پہلی دلیل یہ ہے کہ عقلِ انسانی جس طرح ایک ماہر اور تجربہ کار طبیب کے مشورے اور راہنمائی کے بغیر مُفید اور مُضر دواؤں میں فرق نہیں کر سکتی اسی طرح اُخروی اور اَبدی زندگی کے لئے مفید اور مُضر افعال میں بھی فرق نہیں کرسکتی (لہٰذا فلاحِ اُخروی کے لئے نبی کی ضرورت ہے)۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ دنیوی معاملات میں بھی عقلِ انسانی سب چیزوں کا حُسن و قبح معلوم کرنے کی مستقل قوت اور صلاحیت نہیں رکھتی (لہٰذا فلاحِ دنیوی کے لئے نبی کی ضرورت ہے)۔

تیسری دلیل یہ ہے کہ فکرِ انسانی میں تفاوت ہے۔ انسان کو اس فکرِ انسانی کے سپرد کر دینے سے باہمی فتنہ و فساد تک بھی نوبت پہنچ سکتی ہے[1]۔

ابن الہمامؒ اگرچہ امامِ فقہ ہیں، لیکن اثباتِ نبوّت کے لئے اُنہوں نے جو استدلال پیش کیا ہے وہ منطقی اور فلسفیانہ ہے اور اس کا خلاصہ یہ ہے :

عقلِ انسانی روحانی طبیبوں کی راہنمائی کے بغیر نہ تو نجاتِ اُخروی کے وسائل معلوم

---

[1] المسایرہ لابن الہمامؒ۔ طبع مصر ۱۹۲۹ء۔ ص ۱۲۰۔۱۲۱۔

کرسکتی ہے اور نہ فلاح و اصلاحِ دنیوی کے لئے حسن و قبح میں تمیز کر سکتی ہے۔
اس لیے انسان کو عقل ہی کے حوالے کر دینے سے فکری انتشار و اختلاف رُونما ہوگا۔

۷۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ

امامِ ربانی حضرت مجدد الفِ ثانی، شیخ احمد سرہندیؒ (متوفی ۱۰۳۴ھ) کے دور میں اکبر کی کفریات کا زور تھا اور نبوت کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کئے جا رہے تھے۔ موقع پرست سیاستدانوں، درباری مولویوں اور نفس پرست و شاہ پرست پیروں نے اکبر کو ایک طرح سے نبوّت کے اختیارات دے دیے تھے۔ اس فتنے کی تردید کیلئے حضرت مجددؒ نے مکتوبات کے علاوہ عربی زبان میں "اثبات النبوۃ" کے نام سے ایک مستقل رسالہ بھی لکھا ہے —— امام ربانیؒ نے نبوّت کی حقیقت اور اس کی ضرورت کو محققانہ، لیکن عاشقانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ مکتوبات میں لکھتے ہیں:

"ہماری عقل تو ان برگزیدہ بندوں کی روشنی کے بغیر بے کار ہے۔ اور ہماری سوچ اُن کی تقلید کے بغیر ذلیل و خوار ہے۔ عقل اگرچہ حجّت ہے، لیکن ناتمام اور نابالغ ہے۔ حجّتِ بالغہ تو صرف انبیاء کی نبوّت ہے[۱]۔"

حضرت کا مقصد یہ ہے کہ جس طرح آنکھ روشنی کے بغیر راستہ نہیں دیکھ سکتی، اِسی طرح عقل تعلیماتِ انبیاءؑ کی روشنی کے بغیر بے کار ہے اور ذلیل و خوار ہے۔ عقل کی نظر بالغ نہیں ہے اور نبوّت کی نظر بالغ ہے۔

۸۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ

حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ محدّث دہلویؒ (متوفی ۱۱۷۶ھ) نے نبوّت اور دینی قائد کی ضرورت ثابت کرنے کے لئے اپنی مشہور کتاب "حجۃ اللہ البالغۃ" کی قسم

---

[۱] مکتوبات۔ دفترِ اوّل۔ مکتوب نمبر ۲۵۹۔

اوّل میں مبحثِ ششم کا پہلا باب مخصوص فرمایا ہے۔ جس کا عُنوان ہے یہ ہے:

المبحث السادس مبحث السياسيات الملّية
باب الحاجة الى هُداة السبل ومقيمى الملل

یعنی بحث ششم ملّی اور دینی سیاسیات کے بیان میں ہے اور اس کا پہلا باب دینی راہنماؤں اور مذاہب قائم کرنے والوں کی ضرورت ثابت کرنے پر مشتمل ہے۔

یہ باب بڑا دقیق اور عسیر الفہم ہے۔ میں اس کا جامع مفہوم اور خلاصہ اپنے الفاظ میں بیان کرتا ہوں:

"عقلِ سلیم اگرچہ بھلائی اور برائی کے درمیان تمیز کرنے کی استعداد رکھتی ہے لیکن بسا اوقات اسے خواہشات اور غفلت کے پردے گھیر لیتے ہیں اور اِس کا مزاج صفراوی مریض کی طرح بگڑ جاتا ہے۔ وہ مفید اور مُضر میں فرق نہیں کر سکتی:

فيحتاجون الیٰ عالم بالسنة الراشدة يسوسهم۔

ایسے لوگ اُس عالِم کے محتاج ہوتے ہیں جو دانائی اور سچّائی اور رُشد و ہدایت کے قوانین جانتا ہو اور لوگوں کی سیاست و مصلحت کی تدابیر اختیار کر سکتا ہو۔

بعض لوگ عقلِ فاسد اور بگڑی ہوئی رائے رکھتے ہیں، ہمیشہ بھلائی کی مخالفت کرتے ہیں، خود بھی راہِ راست پر نہیں چلتے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے رہتے ہیں۔ پس اصلاحِ قوم ایسے بگڑے ہوئے لوگوں کے خیالاتِ فاسدہ کو مٹائے بغیر نہیں ہو سکتی۔

بعض لوگ ضعیف العقل، یعنی خام اور کچّی عقل کے مالک ہوتے ہیں۔ کچھ حقائق کو تو پا لیتے ہیں، لیکن بہت سے ضروری حقائق تک اُن کی نظر پہنچ نہیں پاتی، مگر وہ اس خام خیالی اور خود فریبی کا شکار ہوتے ہیں کہ ہمیں کسی ہادی اور مُربیّ کی ضرورت نہیں ہے۔ ایسے لوگوں کو اس خام خیالی اور خود فریبی سے نکالنے کے لئے ایسے عالِم کی ضرورت ہوتی ہے جو غلطیوں سے محفوظ ہو۔

معاشی سوجھ بوجھ اور تمدّنی امور کا کچھ نہ کچھ علم رکھنے والے صرف ایک شہر

کے لوگ بھی ایک رہنما کی ضرورت محسوس کرتے ہیں جو تمدنی اصلاحات میں مہارتِ کاملہ رکھتا ہو اور قوم کی سیاست شائستگی کے ساتھ چلا سکتا ہو، تو پھر ایسی عظیم قوم کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے جو مختلف خیالات کے لوگوں پر مشتمل ہو کہ آیا وہ اپنے بل بوتے پر ایسا نظام معلوم اور قائم کر سکتی ہے!

جب صنعت و حرفت میں مہارت ماہرین کی راہنمائی کے بغیر حاصل نہیں کی جا سکتی، تو بلند ترین مقاصد اور بہترین نظامِ حیات کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟

ایسے نظام کی راہنمائی وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کی فطرت خواہشاتِ نفس سے پاک ہو اور وہ اعلیٰ درجے کے انسان ہوں۔ ایسے اعلیٰ ترین نظام کو اللہ کے برگزیدہ بندوں کے سوا اور کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا"[1]

۹۔ علامہ جمال الدین افغانیؒ:

علامہ سید جمال الدین افغانیؒ (متوفی ۱۸۹۷ء) نے ۱۸۷۰ء میں استنبول کے دارالفنون کے ایک اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے نبوت اور فلسفے کا فرق اس طرح واضح فرمایا تھا:

"جسم کی زندگی روح کے بغیر ممکن نہیں ہے، معاشرے کی روح نبوت ہے یا پھر فلسفہ ہے، نبی اور فلسفے کا معاشرے سے وہی تعلق ہے جو روح کا جسم سے ہے، لیکن ان دونوں میں ایک فرق تو یہ ہے کہ نبوت اللہ کی رحمت سے ہی ملتی ہے، جسے محنت اور ریاضت سے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ جبکہ فلسفہ غور و فکر اور بحث و مباحثہ سے حاصل ہو جاتا ہے۔

دوسرا بڑا فرق اور اہم ترین امتیاز یہ ہے کہ نبیؐ غلطیوں سے محفوظ و معصوم

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ۔ طبع رحیمیہ دیوبند۔ ج ۱ ص ۲۰۴۔

ہوتا ہے، لیکن فلسفی غلطیاں کر سکتا ہے اور کرتا رہتا ہے۔[1]

۱۰ ۔ علّامہ اقبالؒ :

علّامہ اقبالؒ (م ۱۹۳۷ء) دورِ جدید کے مقبول و معروف اسلامی مفکر اور فلسفی شاعر ہیں۔ انہوں نے بھی اپنے فلسفیانہ مگر مؤمنانہ اشعار میں رسالت کو قومی وحدت کا ذریعہ اور معاشرے کی جان کہا ہے :

حق تعالےٰ پیکرِ ما آفرید — از رسالت در تنِ ما جاں دمید

از رسالت در جہاں تکوینِ ما — از رسالت دینِ ما آئینِ ما

از رسالت صد ہزار ما یک است — جزو ما از جزو ما لا ینفک است

از رسالت ہم نوا گشتیم ما — ہم نفس ہم مدّعا گشتیم ما[2]

علّامہ اقبالؒ کا مقصد یہ ہے کہ رسالت اور نبوّت کی تعلیمات قومی جسد کی جان ہے۔ جو لوگ ان تعلیمات کے پیروکار ہیں وہی حقیقی طور پہ زندہ ہیں۔ ملّی وحدت کی بنیاد ایمان بالرّسالت ہے۔ رسولؐ کو ماننے والے ایک قوم ہیں، جو اسلامی قومیت کہلاتی ہے۔ اسی رسالت و نبوّت کی وجہ سے دنیا کے کونے کونے میں بسنے والے الگ الگ بولیاں بولنے والے اور الگ الگ رنگ و بو رکھنے والے لوگ ہم نوا اور ہم مدّعا بن گئے ہیں۔

ضرورتِ نبوّت کے بارے میں حضرت علّامہ اقبالؒ کے مندرجہ بالا اشعار بار بار پڑھنے کے قابل ہیں۔

۱۱ ۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ :

مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ (متوفی ۱۳۹۹ھ) نے نبوّت کی ضرورت ثابت کرنے کے لئے جو عقلی استدلال پیش فرمایا ہے وہ مذکورہ فلسفیوں کے بیان کردہ دلائل کا خلاصہ ہے۔ "سیرت سرورِ عالمؐ" میں "انسان کی سب سے بڑی ضرورت" کے زیرِ عنوان لکھتے ہیں :

> "دنیا میں انسان کے لئے فکر و عمل کے بہت سے مختلف راستے ممکن ہیں اور عملاً موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سارے راستے بیک وقت توحق نہیں ہو سکتے۔

---

[1] مشاہیر الشرق ۔ ج۲ ۔ ص۵۴ ۔ [2] رموزِ بےخودی ۔ رکن دوم ۔

سچائی تو ایک ہی ہے اور صحیح طریقِ حیات صرف وہی ہو سکتا ہے جو صحیح نظریۂ حیات پر مبنی ہو۔

اس صحیح نظریے اور صحیح راہ سے واقف ہونا انسان کی سب سے بڑی ضرورت ہے، بلکہ اصل بنیادی ضرورت یہی ہے۔ دوسری تمام چیزیں تو انسان کی صرف اُن ضرورتوں کو پورا کرتی ہیں جو ایک اونچے درجے کا جانور ہونے کی حیثیت سے اُس کو لاحق ہوا کرتی ہیں، مگر یہ ایک ضرورت ایسی ہے جو انسان ہونے کی حیثیت سے اس کو لاحق ہے۔ یہ اگر پوری نہ ہو، تو اس کے معنے یہ ہیں کہ انسان کی ساری زندگی ہی ناکام ہو گئی۔

اب غور کیجئے کہ جس خدا نے آپ کو وجود میں لانے سے پہلے آپ کے لئے یہ کچھ سروسامان کر رکھا اور جس نے وجود میں لانے کے بعد آپ کی حیوانی زندگی کی ایک ایک ضرورت کو پورا کرنے کا اتنی دقیقہ سنجی کے ساتھ اتنے بڑے پیمانے پر انتظام کیا۔ کیا اُس سے آپ توقع رکھتے ہیں کہ اُس نے آپ کی انسانی زندگی کی اس سب سے بڑی اور اصل ضرورت کو پورا کرنے کا بندوبست نہ کیا ہوگا۔؟

یہی بندوبست تو ہے جو نبوّت کے ذریعے کیا گیا ہے۔ اگر نبوّت کو نہیں مانتے تو بتلایئے کہ آپ کے خیال میں خدا نے انسان کی ہدایت کے لئے اور کونسا انتظام کیا ہے؟

اس کے جواب میں آپ نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ خدا نے ہمیں راستہ تلاش کرنے کے لئے عقل و فکر دے رکھی ہے، کیونکہ انسانی عقل و فکر پہلے ہی بے شمار راستے ایجاد کر بیٹھی ہے، جو راہِ راست کی صحیح دریافت میں اس کی ناکامی کا کھلا ثبوت ہے، اور نہ آپ یہی کہہ سکتے ہیں کہ خدا نے ہماری راہنمائی کا کوئی انتظام نہیں کیا ہے[1]؟

---

[1] سیرۃ سرورِ عالم ؐ۔ باب اوّل۔ فصل ۳۔ ج ۱ صـ ۵۳۔۵۴۔

سولھواں باب

انبیاء علیہم السّلام کی تعداد

سورہ النّساء آیات ۱۶۳ ـ ۱۶۴ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو مخاطب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے :

" بعض رسولوں کا حال تو ہم نے آپؐ سے بیان کیا ہے، لیکن بعض کا حال ہم نے آپؐ سے بیان نہیں کیا "

سورۂ النحل کی آیت ۳۶ میں ارشادِ خداوندی ہے :

" ہم نے ہر امّت میں رسول بھیجا ہے "

سورۂ الرّعد کی آیت ۷، میں فرمایا گیا ہے :

وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ۝ (ہر قوم کے لئے راہنما موجود رہا ہے)

اس آیت کے لفظ ھَادٍ کی تفسیر میں سلف صالحینؒ کے تین اقوال ہیں :

۱۔ حضرت ابن عباسؓ، سعید بن جُبیرؓ، مجاہدؒ اور ضحّاکؒ کا قول یہ ہے کہ مراد اللہ کی ذات ہے اور مقصد یہ ہے کہ ہر قوم کو اپنے احکام کی ہدایت دینے والا خدا ہی ہے، کسی دوسرے کے پاس ہدایت کے اختیارات نہیں ہیں۔

۲۔ حضرت ابن عباسؓ کا دوسرا قول اور ابوصالحؒ، ابوالعالیہؒ اور یحییٰ بن رافعؒ کا قول یہ ہے کہ مراد ہر قوم کا قائد اور داعی الی اللہ ہے، اور مقصد یہ ہے کہ ہر قوم میں ایسے لوگ گزرے ہیں، موجود ہیں اور موجود رہیں گے جو قیادت اور دعوت الی اللہ کا فرض انجام دیتے ہیں۔

۳۔ حضرت قتادہؒ، ابنِ زیدؒ، اور مجاہدؒ کا دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد نبی ہے۔ اور مفہوم یہ ہے کہ ہر قوم میں نبی بھیجا گیا تھا اور وہی نبی اُس قوم کا راہنما تھا۔

ابنِ جریرؒ کہتے ہیں کہ یہ تینوں اقوال درست ہیں۔ اس لئے کہ ہر قوم اور سارے انسانوں کی اصلی اور حقیقی ھادی تو اللہ ہی کی ذات ہے، لیکن اس کی ہدایت اور احکام کو لوگوں تک پہنچانے والا اُس کا نبی ہوتا ہے اور نبی کی غیر موجودگی کے وقت دینی قائدین اور علماءِ دین اس کے نائبین کی حیثیت سے یہ فریضہ انجام دیتے ہیں[1]۔

سورۂ فاطر کی آیت ۲۴ میں فرمایا "نہیں گزری کوئی امت، مگر ہر ایک میں خبردار کرنے والا موجود تھا"

سورۃ النجم کی آیت ۵۶ میں فرمایا:

"یہ اُسی طرح خبردار کرنے والا ہے جیسے کہ پہلے زمانے میں تھے"

ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر دور کی قوموں میں خدا کے نبی گزرے ہیں۔ مشرقِ وسطیٰ بالخصوص شام کی سرزمین میں انبیاء کی تعداد زیادہ رہی ہے۔ اور اُن کے حالات کی تفصیلات بھی نسبتاً زیادہ ملتی ہیں، لیکن دنیا کی ہر قوم میں سلسلۂ نبوّت کا موجود ہونا عقل ونقل دونوں سے ثابت ہے۔ اگرچہ تفصیلات ہمیں معلوم نہیں ہیں لیکن ہماری لاعلمی اس بات کی دلیل نہیں بن سکتی کہ مشرقِ وسطیٰ کے علاوہ دوسرے علاقے نورِ نبوّت سے محروم رہے ہوں۔ حضرت مجدّد الف ثانیؒ اس سلسلہ میں فرماتے ہیں:

"ہندوستان میں بھی پیغمبر مبعوث ہوئے ہیں۔ ہندوستان کے بعض شہروں میں محسوس ہوتا ہے کہ انبیاء کے انوار شرک کے اندھیروں میں مشعلوں کی طرح روشن ہیں۔ ہندوؤں کے بعض قدیم مذہبی پیشواؤں نے اللہ تعالیٰ کی تنزیہ وتقدیس میں جو کچھ لکھا ہے وہ سب نبوت کی روشنی سے حاصل کیا ہے[2]"

صحاحِ ستّہ اور مؤطا امام مالکؒ میں تو انبیاء کی تعداد کے بارے میں کوئی حدیث نہیں ہے، لیکن مُسندِ احمدؒ، مستدرکِ حاکم، مجمع الزوائد، صحیح ابن حبّان، کنز العمّال، معجم کبیر للطبرانیؒ، شعب

---

[1] تفسیر ابن جریر۔ ج ۱۳ ص ۱۰۷ – ۱۰۹۔

[2] مکتوبات۔ دفتر اوّل۔ مکتوب نمبر ۲۵۹۔ بنام خواجہ محمد سعید۔

الایمان للبیہقیؒ ، ابن مَردویہ ، ابن ابی حاتمؒ اور حافظ ابویعلیٰؒ موصلی نے حضرت ابوذر غفاریؓ اور حضرت ابوامامہ باہلیؓ سے روایتِ مرفوعہ نقل کی ہے کہ ــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انبیاء کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار (۱۲۴۰۰۰) بتائی ہے اور رسولوں کی تعداد ۳۱۳ یا ۳۱۵ بتائی ہے[1]

ابنِ کثیرؒ نے اس روایت کے اسانید پہ تنقید کی ہے لیکن مسند احمدؒ کے ایک سند کے بارے میں کہا ہے کہ یہ مضبوط ہے۔ اسی طرح ابنِ حبّان میں اس سند کو صحیح قرار دیا گیا ہے[2]

وہ انبیاءؑ جن کے ناموں کا ذکر قرآن کریم میں ہے

حافظ ابن کثیرؒ اور سُیوطیؒ نے لکھا ہے کہ قرآن میں ۲۵ انبیاء کا ذکر نام کی تصریح کے ساتھ ہوا ہے۔ ان اسماءِ مبارکہ کی تفصیل یہ ہے :

۱۔ ابوالبشر آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام :

حضرتِ آدم علیہ السلام کے نام کا ذکر ۱۱ سورتوں اور ۲۵ آیات میں ہوا ہے۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ لفظِ آدم اَدِیم سے لیا گیا ہے جس کے معنے ہیں سطحِ زمین، لیکن ابواسحٰق الثعلبی کا

---

[1] مسند احمد ۔ طبع بیروت ۔ ج ۵ ص ۱۷۸-۱۷۹ ۔ مستدرک حاکم کتاب التاریخ ۔ ج ۲ ص ۵۹۷ ۔ ولکن قال الذھبی یحی بن سعید السعدی لیس بثقۃ ۔ مجمع الزوائد ۔ طبع بیروت سنہ ۱۹۶۷ء ج ۱ ص ۱۵۹ ۔ کنز العمال ۔ کتاب الفضائل، باب ثانی، فصل ثانی الاکمال حدیث ۳۲۲۷۷ ۔ ج ۱۱ ص ۴۸۲ ۔ طبع مؤسسۃ الرسالہ بیروت ۔ سنہ ۱۹۷۹ء ۔

[2] تفسیر ابن کثیر ۔ ج ۲ ص ۴۵۴ ۔ البدایہ والنہایہ ۔ ج ۱ ص ۹۷ ۔

قول یہ ہے کہ یہ عبرانی لفظ آدآم سے ماخوذ ہے جس کے معنے ہیں مٹی[1] امام نوویؒ نے تہذیب الاسماء والکنیٰ" میں لکھا ہے کہ حضرت آدمؑ کی عمر ایک ہزار ۱۰۰۰ سال تھی۔ ابن جریرؒ نے یہی قول متعدد سندوں کے ساتھ خود رسول اللہ ﷺ سے بھی نقل کیا ہے[2] ابن الاثیرؒ نے نقل کیا ہے کہ حضرت آدمؑ پر ۲۱ صحیفے نازل ہوئے تھے اور ان صحیفوں کو حضرت آدمؑ نے حضرت جبرئیلؑ کی تعلیم کے مطابق خود اپنے ہاتھ سے لکھا تھا[3]۔ واللہ اعلم۔

۲۔ نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام :

حضرت نوحؑ کے نام کا ذکر قرآن مجید کی ۲۸ سورتوں میں ۴۳ مقامات پر ہوا ہے۔ معجم طبرانی میں حضرت ابوذر غفاریؓ کی حدیث مرفوع اور مستدرکِ حاکم میں حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل ہوا ہے کہ حضرت آدمؑ اور حضرت نوحؑ کے درمیان دس قرنوں کا فاصلہ تھا۔ واللہ اعلم۔

۳۔ ادریس علیہ السلام :

آپ کے نام کا ذکر قرآنِ مجید کی ۲ سورتوں اور دو آیتوں میں ہوا ہے۔ ابن اسحٰقؒ اور بعض دوسرے مؤرخین کہتے ہیں کہ حضرت ادریسؑ کا زمانہ حضرت نوحؑ سے پہلے تھا، لیکن بعض دیگر مؤرخین آپ کو انبیاء بنی اسرائیل میں شمار کرتے ہیں، مگر جمہور نے پہلے قول کو ترجیح دی ہے۔

۴۔ ھود علیہ السلام :

حضرت ھودؑ کا ذکر قرآن مجید کی تین سورتوں اور ۷ آیات میں ہے۔ یہ عاد کی اولاد میں سے تھے اور عاد سام ابن نوحؑ کی نسل سے تھے۔ مستدرکِ حاکم میں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت نوحؑ کے درمیان حضرت ھودؑ اور حضرت صالحؑ کے علاوہ اور کوئی نبی نہیں گزرا۔

---

[1] عمدۃ القاری، شرح بخاری۔ از علامہ بدرالدین عینی۔ کتاب الانبیاء۔

[2] تاریخ الامم والملوک۔ از ابن جریرؒ۔ ج ۱ ص ۷۷-۸۷، وھکذا فی البدایہ لابن کثیر۔

[3] الکامل لابن اثیر۔ طبع بیروت، ۱۹۶۵ء۔ ج ۱ ص ۴۲۔

حضرت ھودؑ کا انتقال ایک روایت کے مطابق مکۂ مکرمہ میں ہوا تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آپ کا زمانہ ۲ ہزار سال قبل مسیح تھا، لیکن یہ صحیح معلوم نہیں ہوتا۔

۵۔ صالح علیہ السلام :

حضرت صالحؑ کا ذکر قرآن مجید کی تین سورتوں میں ۸ مقامات پر ہے۔ آپ ثمود کی اولاد میں سے تھے اور ثمود بھی سام بن نوحؑ کی نسل سے تھے۔

۶۔ ابراھیم علیہ السلام :

حضرت ابراہیمؑ کا ذکر قرآن کی ۲۵ سورتوں کی ۶۳ آیات میں ہے۔ آپ بھی سام بن نوحؑ کی اولاد میں سے تھے۔

ابراہیم سُریانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنے ہیں مُشفق اور رحم دل باپ۔

ہشامؒ کا قول ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت ہودؑ کے درمیان ۶۳۰ سال کا فاصلہ تھا۔ اور حضرت ابراہیمؑ اور حضرت نوحؑ کے درمیان ۱۱۴۳ سال کا۔

ثعلبیؒ نے کہا ہے کہ پیدائش آدمؑ کے ۳۳۳۷ سال بعد حضرت ابراہیمؑ پیدا ہوئے تھے۔[1] لیکن یہ اسرائیلی روایات ہیں جن کی تصدیق یقینی طور پر نہیں کی جا سکتی۔

۷۔ اسمٰعیل بن ابراہیم علیہما السلام :

حضرت اسمٰعیل کا ذکر قرآن مجید میں ۸ سورتوں کی ۱۲ آیات میں آیا ہے۔ اسمٰعیل عبرانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں "خدا سنتا ہے"۔ آپ حضرت ابراہیمؑ کے سب سے بڑے بیٹے تھے جو حضرت ھاجرہ کے بطن سے تھے۔ عرب مستعربہ یعنی بنو عدنان اور نبی آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ ہی کی نسل سے ہیں۔

۸۔ اسحٰق بن ابراھیم علیہما السلام :

حضرت اسحٰق کا ذکر قرآن مجید میں ۱۲ سورتوں کی ۱۷ آیات میں آیا ہے۔ اسحٰق عبرانی زبان میں ہنسنے کو کہتے ہیں۔ قرآن مجید اور بائیبل میں مذکور ہے کہ جب فرشتے حضرت ابراہیمؑ کے پاس یہ خوشخبری لے کر آئے کہ آپ کے ہاں بیٹا پیدا ہوگا تو حضرت سارہؓ ہنسیں تھیں۔ غالباً اسی لیے بیٹے کا نام اسحٰقؑ رکھا گیا۔ حضرت اسحٰقؑ حضرت اسمٰعیلؑ کی پیدائش کے ۱۴ سال بعد حضرت سارہؓ کے بطن سے پیدا ہوئے، بنی اسرائیل کے تمام انبیاء و رسل آپ ہی کی نسل میں مبعوث ہوئے۔

---

[1] عمدۃ القاری۔ کتاب الانبیاء۔

۹۔ لوط بن ھاران علیہ السّلام۔

آپ حضرت ابراہیمؑ کے بھتیجے تھے۔

۱۰۔ یعقوب بن اسحٰق علیہ السلام :

حضرت یعقوبؑ کا ذکر قرآن کی ۷ سورتوں کی دس آیات میں ہے لیکن نام صرف دو جگہ آیا ہے۔

۱۱۔ یوسف بن یعقوب علیہما السّلام

حضرت یوسفؑ کا ذکر قرآن کی تین سورتوں کی ۲۶ آیات میں آیا ہے۔

۱۲۔ شعیب بن میکائیل علیہ السلام :

حضرت شعیبؑ کا ذکر قرآن کی چار سورتوں کی ۱۰ آیات میں ہے۔

بعض کے نزدیک یہ لاوی بن یعقوبؑ کی نسل سے تھے، لیکن مشہور اور صحیح تحقیق یہی ہے کہ مَدین بن ابراہیمؑ کی اولاد میں سے تھے۔ مَدین حضرت ابراہیمؑ کی تیسری بیوی قَطُورا کے بطن سے تھے۔

۱۳۔ موسیٰ بن عمران علیہ السّلام :

حضرت موسیٰؑ کا ذکر قرآن کی ۳۶ سورتوں کی ۱۰۷ آیات میں آیا ہے۔

آپ لاوی بن یعقوبؑ کی نسل سے تھے۔ مُوسیٰ عربی زبان میں تو اُسترے یا چُھری کو کہتے ہیں، لیکن محققین کے نزدیک یہ سُریانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنے ہیں پانی اور درخت (مُو پانی۔ سیٰ درخت)

۱۴۔ ھارون بن عمران علیہ السلام :

حضرت ہارونؑ کا ذکر قرآن کی ۱۱ سورتوں اور ۱۴ مقامات پر ہے۔ حضرت ہارونؑ حضرت موسیٰؑ کے بھائی تھے اور عمر میں اُن سے ایک سال بڑے تھے۔

بعض کے نزدیک ہارونؑ عبرانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنے ہیں محبُوب۔

۱۵۔ الیاس علیہ السلام :

حضرت الیاس کا ذکر قرآن کی دو سورتوں کی ۲ آیات میں آیا ہے۔

ابنِ اسحٰقؒ کے نزدیک آپ کے والد کا نام یاسین تھا، مگر دوسرے مؤرخین آپ کے والد کا نام عازر بتاتے ہیں۔ امام بخاریؒ نے لفظِ تضعیف کے ساتھ حضرت ابنِ عباسؓ اور

ابنِ مسعودؓ کا قول ترجمۃ الباب میں بلا ذکرِ سند نقل کیا ہے کہ الیاس، حضرت ادریسؑ ہی کا دوسرا نام ہے، لیکن جمہور کے نزدیک یہ قول سنداً ضعیف ہے۔ ابنِ کثیرؒ نے البدایہ والنہایہ میں اس کو کمزور کہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ خود امام بخاریؒ نے بھی اس قول کو مُستند نہیں سمجھا۔ اس لئے انہوں نے ادریسؑ کا ذکر علیحدہ باب میں کیا ہے اور الیاسؑ کا ذکر علیحدہ باب میں۔ صحیح یہی ہے کہ حضرت الیاسؑ حضرت ہارونؑ کی اولاد میں سے تھے اور بنی اسرائیل سے تعلق رکھتے تھے۔

۱۶۔ داؤد علیہ السلام :

حضرت داؤدؑ کا ذکر قرآن کی ۹ سورتوں کی ۲۷ آیات میں آیا ہے، لیکن نام صرف ۱۶ مقامات پر ہے، آپ یہوذا ابن یعقوب علیہ السلام کی نسل میں سے تھے۔ حضرت داؤدؑ نے شام، فلسطین، شرقِ اُردن، دِمشق اور حجاز کے کچھ حصے اور خلیجِ عقبہ سے لے کر فرات تک کے علاقوں کی وسیع مملکت پر ۴۰ سال حکومت کی۔

۱۷۔ سلیمان علیہ السلام :

حضرت سلیمانؑ کا ذکر قرآن کی سات کی سورتوں میں ۱۶ مقامات پہ آیا ہے۔

آپ حضرت داؤدؑ کے بیٹے تھے۔ ۱۳ سال کی عمر میں اپنے باپ کی قائم کردہ اسلامی سلطنت کا انتظام سنبھالا اور اپنے دورِ حکومت کے چوتھے سال میں بیت المقدس کی تعمیر کا آغاز کیا۔

سُیوطیؒ اور ابنِ اثیرؒ کے قول کے مطابق حضرت سلیمانؑ کی حکومت کا زمانہ بھی ۴۰ سال تھا۔

۱۸۔ ایّوب علیہ السلام :

حضرت ایّوب علیہ السلام کا ذکر قرآن کی ۴ سورتوں میں ہوا ہے۔

ابنِ اسحٰقؒ کی تحقیق یہ ہے کہ یہ انبیاءِ بنی اسرائیل میں سے تھے اور ان کے والد کا نام ابیض تھا۔ ابنِ جریر طبریؒ کی رائے یہ ہے کہ آپ حضرت شعیبؑ کے بعد مبعوث ہوئے اور آپ کے والد کا نام موص تھا، لیکن ابنِ ابی خثیمہؒ کے نزدیک ان کا زمانہ حضرت سلیمانؑ کے بعد کا ہے۔ واللہ اعلم۔

۱۹۔ اَلْیَسَع علیہ السلام :

حضرت الیسعؑ کا ذکر قرآن کی دو سورتوں کی دو آیتوں میں آیا ہے۔ بعض محققین کے

خیال میں یہ حضرت الیاسؑ کے نائب تھے۔

۲۰۔ یونس بن متیٰ علیہ السلام :

حضرت یونسؑ کا ذکر قرآن مجید کی چھ سورتوں کی ۱۸ آیات میں آیا ہے۔ مؤرخین کے نزدیک عراق کا مشہور شہر نینوا آپ کا مرکزِ تبلیغ تھا۔ بعض محققین کے نزدیک آپ کا زمانہ وہ تھا جو تاریخ میں ایران کی طوائف الملوکی کا زمانہ کہلاتا ہے، یعنی سکندر یونانی کے بعد کا زمانہ۔

۲۱۔ ذوالکفل علیہ السلام :

حضرت ذوالکفل کا ذکر قرآن کی ۲ سورتوں میں ہوا ہے۔

عربی زبان میں کِفْل ضمانت کو کہتے ہیں، تو ذوالکفل کے معنے ہوئے ضمانت دینے والا۔ کہتے ہیں کہ ایک شخص کے ضامن ہو کر کئی سال قید رہے اور صرف اللہ کے لئے یہ تکلیف برداشت کی۔ سورۂ انبیاء اور سورۂ صٓ میں ان کا ذکر سلسلۂ انبیاء میں ہوا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نبی تھے، لیکن بعض کے نزدیک محض مردِ صالح تھے۔ آپ کا زمانہ، حالات اور نسب یقینی طور پر معلوم نہیں۔ علامہ آلوسیؒ کہتے ہیں کہ یہ حزقیل ہیں جو ۵۹۴ ق م میں تل ابیب کے مقام پر رسول بنائے گئے تھے۔ واللہ اعلم۔

۲۲۔ ذکریا علیہ السلام :

حضرت زکریاؑ کا ذکر قرآنِ مجید کی چار سورتوں کی ۱۸ آیات میں ہے۔

۲۳۔ یحیٰ علیہ السلام :

حضرت یحیٰؑ کا ذکر قرآن مجید کی ۴ سورتوں میں ہوا ہے۔ آپ حضرت زکریاؑ کے بیٹے تھے۔ ولادت کے وقت آپ کے والد کی عمر ۹۲ یا ۹۹ یا ۱۲۰ سال تھی۔ حضرت عیسیٰؑ سے ۶ ماہ پہلے پیدا ہوئے تھے۔ یہودیوں نے آپ کو شہید کر دیا تھا۔

۲۴۔ عیسیٰ بن مریم علیہما السلام :

آپ بغیر باپ کے حضرت مریمؑ کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اسی مادی جسم کے ساتھ آسمان پر زندہ اٹھا لیا تھا۔ مشہور روایات کے مطابق آپ قیامت سے پہلے

جامعِ دمشق کے مشرقی منارے پہ سے اُتریں گے۔ اُس وقت مسلمان حضرت مہدیؒ موعود کی قیادت میں یہودیوں سے برسرِپیکار ہوں گے۔

۲۵۔ محمّد بن عبد اللہ خاتم النبیّین صلی اللہ علیہ وسلّم :

آپؐ کے اسمِ مبارک "محمد" کا ذکر قرآن کی چار سورتوں میں ہوا ہے جو یہ ہیں :

آلِ عمران ۱۴۴ ——— الاحزاب ۔ ۴۰

محمّد ۔ ۲ ——— الفتح ۔ ۲۹

آپؐ کا دوسرا مشہور نام احمدؐ ہے جس کا ذکر الصف کی آیت ۶ میں ہوا ہے۔ ابنِ حجر عسقلانیؒ نے لکھا ہے کہ مذکورہ دو اسماءِ عَلَمی کے علاوہ آپؐ کے ۱۴ دیگر وہ اسماءِ صفتی ہیں جن پر اہلِ علم کا اتّفاق ہے اور وہ یہ ہیں :

الشّاھدؐ ——— المُبَشِّرؐ ——— النّذیرؐ

المُبِیْنؐ ——— السّراجُ المُنیرؐ ——— المُذَکِّرؐ

الرَّحْمَۃؐ ——— اَلنِّعْمَۃؐ ——— الدّاعیؐ

الشّھیدؐ ——— الھادیؐ ——— الاَمینؐ

المُزَّمِّلؐ ——— المُدَّثِّرؐ

صحیح بخاری کتاب الانبیاء میں ـــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا اپنا یہ ارشاد نقل ہوا ہے کہ میرے پانچ (مشہور) نام ہیں :

۱۔ مُحَمَّدؐ = (یعنی وہ نبی جس کی بہت بہت اور بار بار تعریف کی گئی ہو)

۲۔ اَحْمَدؐ = (یعنی وہ نبی جس نے اپنے رب کی بہت زیادہ تعریف کی ہے)

۳۔ المَاحِیؐ = (یعنی کفر کے طاغوتی نظام کو مٹانے والا یا یوں سمجھ لو کہ انقلابی پیغمبر)

۴۔ الحَاشِرؐ = (یعنی جمع کرنے والا۔ جنّت میں پہلے آپؐ داخل ہوں گے)

۵۔ العَاقِبؐ = (یعنی آخری نبیؐ اور خاتم النبیینؐ)

آپؐ کے اسمائے مبارکہ میں درج ذیل چار نام بھی شامل ہیں :

المُصْطَفیٰؐ ——— المُخْتَارؐ

التَّشفِیعُ ۳ ـــــــ الصَّادِقُ المَصدُوقُ ۴

حافظ محمد بن دحیہ اُندلسی (متوفی ۶۳۳ھ) نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ۹۹ نام ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اسماءِ حسنیٰ ۹۹ ہیں، لیکن مزید تحقیق و تفتیش کی جائے تو آپؐ کے نام ۳۰۰ تک پہنچ سکتے ہیں۔ قاضی ابوبکر ابن العربیؒ اُندلسی (متوفی ۵۴۳ھ) نے عارضۃ الاحوذی، شرح ترمذی میں لکھا ہے کہ بعض صوفیاء کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بھی ۱۰۰۰ نام ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے بھی ۱۰۰۰ نام ہیں۔[ا] واللہ اعلم۔

وہ انبیاءؑ جن کا ذکر قرآن میں ناموں کے بغیر ہوا ہے

مذکورہ انبیاء کے علاوہ وہ ۵ انبیاء وہ ہیں جن کے نام کی تصریح تو قرآن کریم میں نہیں ہے لیکن بغیر نام لئے اُن کا ذکر ہوا ہے۔ وہ یہ ہیں :

۱۔ یوشع بن نون علیہ السلام :

سورۂ کہف میں حضرت موسیٰؑ کے ایک نوجوان رفیق کا تذکرہ ہوا ہے : وَاِذْ قَالَ مُوسٰى لِفَتٰـهُ الآیہ۔

بخاری شریف۔ کتاب الانبیاء، باب حدیث الخضر مع موسیٰؑ میں اس نوجوان کا نام یوشع بن نون بتایا گیا ہے۔ اہلِ کتاب ان کے نبی ہونے پر متفق ہیں۔ تورات میں یشوع کی کتاب بھی مستقل صحیفے کی حیثیت سے موجود ہے۔

۲۔ شمویل علیہ السلام :

سورۂ البقرہ کی آیت ۲۴۶ اِذْ قَالُوْا لِنَبِیٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا۔ میں جس نبی کا ذکر ہوا ہے وہ شمویل علیہ السلام ہیں جیسا کہ مفسّرین کی نقل کردہ بہت سی روایات سے ثابت ہے۔

[ا] فتح الباری۔ شرح بخاری۔ کتاب الانبیاء۔ ج ۷، ص ۳۶۹۔

۳۔ حِزْقِیل علیہ السلام :

سورۂ البقرہ کی آیت ۲۴۳ اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ میں جس واقعے کی طرف اشارہ ہوا ہے، اس کے بارے میں حافظ ابن کثیرؒ امام رازیؒ اور علامہ آلوسیؒ نے سلف صالحینؒ سے کئی روایات نقل کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس کا تعلق حِزقیل علیہ السلام کے زمانۂ نبوّت سے ہے ۔ عبرانی زبان میں حِزقی کے معنے ہیں قدرت اور اِئل کے معنے ہیں اللہ، یعنی قدرت اللہ ۔

۴۔ عُزَیر علیہ السلام :

قرآنِ کریم میں ایک مقام پر عُزَیرؑ کے نام کا ذکر ہوا ہے ۔ اگرچہ اس جگہ اُن کی نبوت کی تصریح نہیں ہے : وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ نِ ابْنُ اللّٰهِ الآیۃ (التوبہ ۳۰) جمہور کا قول ہے کہ عُزَیرؑ نبی تھے ۔ سورۂ البقرہ کی آیت ۲۵۹ : اَوْ كَالَّذِىْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ الآیۃ ۔ میں جس بزرگ کا ذکر ہوا ہے اکثر مفسرین کے نزدیک وہ عُزَیرؑ ہی تھے، لیکن ابنِ جریرؒ کے نزدیک وہ یَرْمِیَاہ تھے ۔ واللہ اعلم ۔

۵۔ خَضِر علیہ السلام :

سورۂ کہف میں حضرت موسیٰؑ کی جس بندۂ خدا کے ساتھ ملاقات کا ذکر ہے بخاری شریف میں اُس کا نام خَضِر بتایا گیا ہے جو جمہور محدثین کے نزدیک اللہ کے نبی تھے ۔

اِس اعتبار سے قرآن کریم میں ۳۰ انبیاء کا ذکر ہوا ہے ۔ ۲۵ کا نام کے ساتھ اور ۵ کا نام لئے بغیر ۔

سترہواں باب

منصبِ نبوّت اور سُنّتِ رسُول ؐ

رسالت و نبوّت کی جو حقیقت اور ضرورت بیان کی گئی ہے اُس سے یہ بات واضح طور پہ سامنے آجاتی ہے کہ رسول خدا کا نمائندہ ہوتا ہے اور اُس کے اِس منصب کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ رسول معیارِ حق، مُطاعِ مطلق اور تنقید سے بالاتر ہو، یعنی خدا کے رسول کی غیر مشروط اطاعت کرنا فرض ہے اور رسول ہی حق و صداقت کی کسوٹی ہے۔

منکرینِ سنّتِ رسول ؐ، حُجیّتِ حدیث کے قائل نہیں ہیں اور سنّتِ رسول ؐ کو ماٰخذِ قانون تسلیم نہیں کرتے۔

صحابہ کرام ؓ اور علماءِ امّتِ مُسلمہ کے چودہ سو سالہ تعامل کے مقابلے میں مٹھی بھر متجددین کے اس خیالِ فاسد اور الہامِ شیطانی کی ظاہر ہے کوئی حیثیت نہیں ہے، لیکن یہ لوگ اپنے آپ کو اہلِ قرآن کہہ کر ناواقف عوام کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ اس لئے حجیّتِ سنّت کے بارے میں خود قرآن ہی سے رسولِ ؐ خدا کی مختلف حیثیات ایک مخصوص ترتیب سے نقل کی جاتی ہیں جن سے حدیثِ رسول ؐ کا حجّت ہونا ثابت ہوتا ہے:

رسول ؐ اللہ کی غیر مشروط اطاعت کا حکم

قرآنِ کریم کی اہم آیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غیر مشروط اور مطلق اطاعت کا حکم دیا گیا ہے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ دین سے متعلق رسولِ ؐ خدا کی ہر بات حُجّت اور ماٰخذِ قانون ہے خواہ وہ قرآن میں مذکور ہو یا نہ ہو!

(نقشہ آیات آئندہ صفحہ پہ ملاحظہ فرمائیں)

نقشہ آیات دربارۂ اطاعتِ رسولؐ

نام سورۃ	نمبر آیت	نام سورۃ	نمبر آیت	نام سورۃ	نمبر آیت	نام سورۃ	نمبر آیت
البقرہ	۲۸۵	الانفال	۱	الشعراء	۱۰۸	الاحزاب	۷۱
آلِ عمران	۳۲	الانفال	۲۰	الشعراء	۱۱۰	الزخرف	۶۳
آلِ عمران	۵۰	الانفال	۴۶	الشعراء	۱۲۶	محمدؐ	۳۳
آلِ عمران	۱۳۲	التوبہ	۷۱	الشعراء	۱۳۱	الفتح	۱۶
النساء	۱۳	طٰہٰ	۹۰	الشعراء	۱۴۴	الفتح	۱۷
النساء	۴۶	النور	۴۷	الشعراء	۱۵۰	الحجرات	۱۴
النساء	۵۹	النور	۵۱	الشعراء	۱۵۱	المجادلہ	۱۳
النساء	۶۴	النور	۵۲	الشعراء	۱۶۳	التغابن	۱۲
النساء	۸۰	النور	۵۴	الشعراء	۱۷۹		
المائدہ	۷	نوح	۳	الاحزاب	۳۳		
المائدہ	۹۲	النور	۵۶	الاحزاب	۶۶		

۱۷ سورتیں ——— اہم آیات

اِن آیات میں سے چند آیات بطورِ مثال ملاحظہ کیجئے :

۱۔ وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (النساء-۶۴)

(اور نہیں بھیجا ہم نے کوئی رسول مگر اس لئے کہ اُس کی اطاعت کی جائے اللہ کے حکم سے)

۲۔ يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ (النساء-۵۹)

(اے ایمان والو، اللہ کی اطاعت کرو اور اُس کے رسولؐ کی اطاعت کرو)

سورۂ الشعراء میں حضرت نوحؑ، حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ، حضرت لوطؑ، اور حضرت شعیبؑ کا یہ فقرہ نقل ہوا ہے:

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ۝ (اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو)

آیات ۱۰۸۔ ۱۱۰۔ ۱۲۶۔ ۱۳۱۔ ۱۴۴۔ ۱۵۰۔ ۱۵۱۔ ۱۶۳۔ ۱۷۹۔

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (النساء۔ ۸۰)

(جو رسول کی اطاعت کرتا ہو اُس نے حقیقت میں اللہ کی اطاعت کی ہے)

مومنین کی امتیازی نشانی یہ بتائی گئی ہے کہ جب وہ اللہ کا حکم یا اُس کے رسولؐ کا حکم سنتے ہیں تو فوراً کہہ دیتے ہیں: (البقرۃ: ۲۸۵)

سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا (ہم نے سُن لیا اور ہم اطاعت کریں گے)

اِن آیات میں یہ نہیں کہا گیا کہ اللہ کا رسولؐ قرآن کی جو آیات سنائے ان ہی کی اطاعت کرو، بلکہ مطلق اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔

رسول اللہؐ کے غیر مشروط اتباع کا حکم

—— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی غیر مشروط پیروی کا حکم لفظِ اتباع کے ساتھ ۱۹ آیات میں دیا گیا ہے۔ اتّباع کے معنے ہیں کسی کے نقش قدم پہ چلنا اور مَتْبُوع کے معنے ہیں قائد اور راہنما جو آگے چل رہا ہو اور لوگ اُس کے پیچھے چل رہے ہوں۔ گویا اتّباعِ رسولؐ کا مفہوم ہے ہر معاملے میں اُسے راہنما بنانا اور بہر حال اُسی کے نقشِ قدم پر چلنا۔

لفظِ اِطاعَتْ طَوْعٌ سے ماخوذ ہے، طَوع کے معنے ہیں دل کی خوشی سے کسی کا حکم ماننا۔ اس کا مقابل کُرْهاً ہے جس کے معنے ہیں ناگواری اور مجبوری، تو اطاعت کا مفہوم ہوا دل کی خوشی اور قلبی پسندیدگی کے ساتھ کسی کا مُنقاد بن جانا اور اُس کی پیروی کرنا۔ مفہوم و مراد کے لحاظ سے اِطاعت اور اتّباع دونوں ہم معنی ہیں، لیکن لفظی فرق کی وجہ سے اتّباعِ رسولؐ سے متعلّق آیات کا ذکر علیحدہ کیا گیا ہے:

نام سورۃ	نمبر آیت	نام سورۃ	نمبر آیت	نام سورۃ	نمبر آیت	نام سورۃ	نمبر آیت
البقرہ	۱۴۳	آلِ عمران	۶۸	یوسف	۱۰۸	یٰسٓ	۲۰
آلِ عمران	۲۰	الاعراف	۱۵۷	الاعراف	۱۵۸	مریم	۴۳
آلِ عمران	۳۱	الانفال	۶۴	الشعراء	۲۱۵	ابراھیم	۳۶
آلِ عمران	۵۳	التوبہ	۱۱۷	القصص	۳۵	الحدید	۲۷
آلِ عمران	۵۵	ھود	۱۷	طٰہٰ	۹۰		

بطور نمونہ تین آیات ملاحظہ کیجئے :

۱۔ قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ (آلِ عمران ۳۱)

(کہدو! اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو، تو میری پیروی کرو تاکہ اللہ تم سے محبّت کرے)

۲۔ اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَہٗ مَکْتُوْبًا عِنْدَھُمْ فِی التَّوْرٰاۃِ وَالْاِنْجِیْلِ

(اعراف ـ ۱۵۷)

(وہی لوگ فلاح پا سکتے ہیں جو فرمانبرداری کرتے ہیں اُس رسول ؐ کی جو نبیؐ اُمّی ؐ ہے جس کا ذکر لکھا ہوا پاتے ہیں وہ اپنے پاس تورات وانجیل میں)

۳۔ وَاتَّبِعُوْہُ لَعَلَّکُمْ تَھْتَدُوْنَ ۝ (الاعراف ـ ۱۵۸)

(اور رسولؐ کی فرمانبرداری کرو، تاکہ تم سیدھا راستہ پاسکو)

اِن آیات میں صرف کتاب اللہ کی پیروی کا حکم نہیں دیا گیا، بلکہ مُعَلِّمُ الْکِتَابْ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی غیر مشروط اور غیر مقید پیروی کا حکم دیا گیا ہے۔ آیات کا صاف اور واضح مفہوم یہ ہے کہ محبوبیّتِ خداوندی، فلاح ونجات اور ہدایت، رسولِ خداؐ کی پیروی ہی سے مل سکتی ہے، زندگی کے ہر مُعاملے اور شُعبے میں اللہ کے رسولؐ کو واجب الاتّباع قائد بنانا لازم ہے۔

اُسوۂ حَسَنہ :

قرآن کریم کی تین آیتوں میں نبیؐ کو "اُسوۂ حَسَنہ" کہا گیا ہے، جس کے معنے ہیں نمونۂ عمل اور پیشوا۔ صراح اللغات میں لفظِ اُسوۂ کا فارسی ترجمہ "پیشوا در مہمات" کیا گیا ہے۔ یعنی "اہم ترین مسائل اور معاملات میں راہنما اور نمونۂ عمل"۔ مختار الصحاح میں ہے :

الاُسوۃ بکسر الھمزۃ وضمّھا لغتان وھو ما یُتَأسّیٰ بہ الحزین یتعزّیٰ بہ وجمعھا اِسیً بکسر الھمزۃ وضمھا [1]

(اُسوہ ہمزہ کے پیش اور زیر دونوں کے ساتھ لغت میں آتا ہے اور یہ وہ چیز ہے جس سے تسلی حاصل کی جائے۔ اس کی جمع اِسیً آتی ہے۔ ہمزہ کے پیش اور زیر دونوں کے ساتھ)

اس لغوی تشریح سے معلوم ہوا کہ اُسوہ اُس نمونۂ عمل اور مُقتدا کو کہا جاتا ہے جس کی پیروی میں انسان کو اطمینان اور سکون اور تسلی حاصل ہوتی ہو اور یہ مقام صرف اللہ کے رسولؐ کو حاصل ہے کہ ہر معاملے میں اس کی پیروی موجب اطمینان اور باعثِ تسلی ہوتی ہے، اس لئے کہ وہ معصوم ہے :

لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ لِّمَنْ کَانَ یَرْجُوا اللّٰہَ وَ الْیَوْمَ الْاٰخِرَ وَ ذَکَرَ اللّٰہَ کَثِیْرًا ۝ (الاحزاب:۲۱)

(بے شک اللہ کے رسولؐ کی زندگی میں اچھا نمونہ ہے تمہارے لئے (یعنی) ان لوگوں کے لئے جو امید رکھتے ہیں اللہ کی خوشنودی اور روزِ آخرت کے اجر کی اور یاد کرتے ہیں اللہ کو کثرت سے)

قَدْ کَانَتْ لَکُمْ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ فِیْ اِبْرٰھِیْمَ وَ الَّذِیْنَ

---

[1] مختار الصحاح۔ باب الھمزۃ ص۱۷۔

مَعَهٗ (الممتحنة - ۴)

(بے شک تمہارے لئے اچھا نمونہ ہے ابراہیمؑ کی زندگی میں اور اُن لوگوں کی زندگیوں میں جو اُس کے ساتھ ایمان لائے تھے)

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيهِمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُو اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَمَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۝ (الممتحنه - ۶)

(بے شک تمہارے لئے ابراہیمؑ اور اُس کے ساتھیوں کی زندگیوں میں اچھا نمونہ ہے (یعنی) ان لوگوں کے لئے جو اللہ کی خوشنودی اور روزِ آخرت کے اجر کی امید رکھتے ہیں اور جو بھی اُن سے منہ پھیرے تو اللہ اُن کا محتاج نہیں ہے اور تعریفوں والا ہے)

مُطاعِ مُطلق، متبوع اور اُسوہ تینوں ہم معنے ہیں صرف تعبیر کا لفظی فرق ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اللہ کے نبیؐ کی پیروی مطلقاً لازم ہے۔

سوال :

مُنکرینِ سنّت یہ سوال کر سکتے ہیں کہ قرآنِ کریم میں تو اُمراء، فُقہاء اور مومنین صالحین کی پیروی کا حکم بھی دیا گیا ہے، تو کیا یہ سب مُطاعِ مطلق، معیارِ حق اور تنقید سے بالاتر ہیں؟ اور کیا اِن کی بھی ہر بات اور ہر عمل حجتِ شرعیہ اور مأخذِ قانون ہے ؟

جواب :

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اگر اُمراء، فقہاء اور صالحین کی ہدایات و اجتہادات قرآن و سنّت کی صریحی نصوص پہ مبنی ہوں، تو اُن کی اطاعت قرآن و سنّت کی اطاعت شمار ہوگی، لیکن اگر ذاتی آراء اور استنباط پہ مبنی ہوں تو اُن سے اختلافِ رائے کو قرآن کریم میں جائز قرار دیا گیا ہے۔ سورۃ النساء آیت - ۵۹ میں اولوالامر کی اِطاعت کا حکم دینے کے بعد فرمایا:

اگر تمہارے درمیان تنازع اور اختلافِ رائے واقع ہوجائے، تو اسے اللہ اور رسولؐ کی طرف لے آؤ، یعنی قرآن وسنّت کے ماہرین سے فیصلہ کروالو۔ معلوم ہوا کہ یہ حضرات اصل معیارِ حق نہیں ہیں، بلکہ اُن کے اُسی قول وعمل کی پیروی کی جاسکتی ہے جو اصل معیارِ حق، یعنی قرآن وسنّت کے خلاف نہ ہو۔

رسولؐ کا اِتّباع شرطِ ایمان ہے :

قرآن کی اُن ۱۷ آیات میں سے جن میں رسولؐ کے اتّباع کو شرطِ ایمان قرار دیا گیا ہے ۱۶ آیات میں سے لفظِ حکم کے ساتھ اور ایک آیت میں لفظِ قضاء کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو حکم دینے والا، قانون دینے والا اور فیصلہ دینے والا کہا گیا ہے، یعنی آپؐ کے حکم اور فیصلے کو ماننا تقاضائے ایمان ہے اور خلاف ورزی کرنا مُنافیٔ ایمان، خواہ فیصلہ اور قانون وحکم صریحی طور پہ قرآن میں موجود ہو یا نہ ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے علاوہ دوسرے قاضیوں اور حکّام کے فیصلوں سے اختلاف کیا جاسکتا ہے اور عدالتِ مرافعہ میں اسے چیلنج بھی کیا جاسکتا ہے۔ نیز ان فیصلوں پہ تنقید بھی کی جاسکتی ہے اور انہیں بدلا بھی جاسکتا ہے، لیکن خاص رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلّم کے فیصلوں کو نہ بدلا جاسکتا ہے اور نہ اُن پہ تنقید کی جاسکتی ہے۔

نقشہ آیات درج ذیل ہے :

نام سورۃ	نمبر آیت	نام سورۃ	نمبر آیت	نام سورۃ	نمبر آیت	نام سورۃ	نمبر آیت
النساء	۶۵	المائدہ	۴۸	الانبیاء	۷۸	الشعراء	۲۱
النساء	۱۰۵	المائدہ	۴۹	الانبیاء	۷۹	القصص	۱۴
المائدہ	۴۲	یوسف	۲۲	النور	۴۸	صٓ	۲۲
المائدہ	۴۴	الانبیاء	۷۴	النور	۵۱	صٓ	۲۶

احزاب - ۳۶

مثال کے طور پر چند آیات ملاحظہ ہوں :

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْ مَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝ (النسآء - ٦٥)

(پس انکار نہ کرو! تیرے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ آپؐ کو حکم دینے والا تسلیم نہ کرلیں ہر اُس معاملے میں جو اُن کے درمیان اختلافی ہو۔ پھر اپنے دلوں میں آپؐ کے حکم و فیصلے کے بارے میں کوئی تنگی اور پریشانی محسوس نہ کریں اور آپؐ کے حکم کو دل کی گہرائیوں سے مان لیں)

آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ہر معاملے میں رسولؐ کے فیصلے کو بطیبِ خاطر ماننا ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔ اس تقاضے کو پورا کئے بغیر نہ کوئی شخص مومن بن سکتا ہے اور نہ ہی مومن رہ سکتا ہے۔ رسولؐ کے فیصلے کی صداقت کے بارے میں دل میں تنگی، تردّد اور خلش ایمان کے سراسر خلاف ہے۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ (النسآء - ١٠٥)

(ہم ہی نے اتاری ہے تمہارے پاس کتاب سچائی کے ساتھ، تاکہ تم لوگوں کے درمیان فیصلے کرو اُس علم کے ساتھ جو اللہ نے تم کو سمجھایا ہے)

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (النور - ٥١)

(بے شک ایمان والوں کا کہنا یہ ہوتا ہے جب اُن کو اللہ اور اُس کے رسولؐ کی جانب بلایا جاتا ہے، تاکہ وہ اُن کے درمیان فیصلہ کریں کہ ہم نے سُن لیا اور ہم اطاعت کریں گے)

حکم کا ہم معنیٰ لفظ قضا ہے اور اس کی حیثیت شرعی ہے۔ اس کے معنے ہیں "فیصلہ دینا"۔ رسول اللہؐ حاکم بھی ہیں اور قاضی بھی، ایسے قاضی کہ آپؐ کے فیصلے کے ماننے یا نہ ماننے کے

بارے میں سوچنا یا مشورے کرنا بھی ایمان کے منافی ہے۔ غور و فکر اور مشورے کرنا اسی وقت تک جائز ہے جب تک رسولؐ کا صریحی اور قطعی فیصلہ معلوم نہ ہو۔ سنّتِ رسولؐ معلوم ہو جانے کے بعد اس کا بلا چون وچرا اور بلا طلبِ حکمت تسلیم کرنا لازم اور ایمان کا تقاضا ہے۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ (احزاب ۳۶)

(کسی مومن مرد اور مومن عورت کو یہ حق نہیں کہ جب اللہ اور اُس کا رسولؐ کوئی فیصلہ دے دے، تو پھر بھی انہیں فیصلے کا کوئی اختیار باقی رہے اپنے معاملے میں)

رسولؐ اللہ کو امر و نہی کا کامل اختیار

امر و نہی بھی حکم و قضاء کے ہم معنے الفاظ ہیں، قرآن کریم کی ۸ آیات بیّنات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو غیر مشروط حکم دینے کا حق دیا گیا ہے اور ۳ آیات میں نہی، یعنی روکنے اور منع کرنے کا غیر مشروط حق دیا گیا ہے۔ اس بارے میں قرآن نے یہ شرط نہیں لگائی کہ جس چیز کا حکم دیا گیا ہو یا جس چیز سے روکا گیا ہو اُس کا ذکر قرآنِ مجید میں بھی ہو۔ ایسی کوئی شرط نہیں ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی یہ حیثیت حُجیّتِ سنّتِ رسولؐ کی قطعی دلیل ہے۔

نقشہ آیات

نام سورۃ	نمبر آیت	نام سورۃ	نمبر آیت	نام سورۃ	نمبر آیت	
الاعراف	۱۵۷	طٰہٰ	۹۰	الاحزاب	۳۶	
الاعراف	۱۹۹	طٰہٰ	۹۳	الحشر	۷	
ھود	۸۸	طٰہٰ	۱۳۲			
مریم	۵۵	النور	۶۳			

کل آیات ۱۰

چند آیات ملاحظہ ہوں :

فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَنْ تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ○

(النور - ۶۳)

(پس ڈرتے رہیں وہ لوگ جو رسولؐ کے امر کی مخالفت کرتے ہیں اِس سے کہ اُن پہ کوئی دنیوی آفت آپڑے یا آپڑے اُن پہ دردناک عذاب)

اس آیت میں رسولؐ کے حکم کی مخالفت کو موجب عذاب قرار دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ رسولؐ کا حکم اُس کی ذاتی رائے پہ مبنی نہیں ہوتا، بلکہ وحیِ الٰہی پہ مبنی ہوتا ہے۔ جس طرح سفیر اور نمائندے کا حکم دراصل اُس حکومت اور بادشاہ کا حکم سمجھا جاتا ہے جس نے اُسے سفارت اور نمائندگی کے منصب پہ مقرر کیا ہو۔

يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ ط

(الاعراف - ۱۵۷)

(یہ رسولؐ اُن کو بھلائی کا حکم کر دیتا ہے اور ان کو برائی سے روکتا بھی ہے)

اس مضمون کی آیات میں صاف صاف بتا دیا گیا ہے کہ رسولؐ جس چیز کے کرنے کا حکم دے وہ معروف ہوگی اور جس چیز سے منع کرے وہ منکر ہوگی۔ معروف و منکر اور بھلائی و برائی کا حقیقی معیار امرِ رسولؐ اور نہیِ رسولؐ ہے۔

رسولؐ اللہ کو تحریم و تحلیل کا کامل اختیار

وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ

(الاعراف - ۱۵۷)

(اور وہ حلال کرتا ہے اُن کے لئے پاکیزہ چیزوں کو اور حرام کرتا ہے اُن پہ گندی چیزوں کو)

وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۔(التوبہ۔۲۹)

(اور یہ لوگ (یہود و نصاریٰ) ان چیزوں کو حرام نہیں سمجھتے ہیں جن کو اللہ اور اُس کے رسولؐ نے حرام کر دیا ہے)

اِن دونوں آیتوں میں رسولؐ کی یہ شان بیان ہوئی ہے کہ وہ جس چیز کو حلال قرار دیدے وہ پاکیزہ اور حلال ہوگی اور جس چیز کو حرام قرار دیدے وہ گندی ہوگی، خواہ اُس کے حلال یا حرام ہونے کا ذکر وحیِ جلی، یعنی قرآن کریم میں ہوا ہو یا نہ ہوا ہو۔ گویا یوں رسولؐ کو تحلیل و تحریم کا غیر مشروط حق دیا گیا ہے۔ کوئی شرط نہیں لگائی گئی۔

يَا اَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ (التحریم۔۱)

(اے نبیؐ، تم کیوں حرام کرتے ہو اپنے اوپر اُس چیز کو جسے اللہ نے تمہارے لئے حلال کر دیا ہے)

اِس آیت میں یہ پابندی تو لگائی گئی ہے کہ خدا کی حلال کردہ چیز کو اپنی ذاتی رائے کی وجہ سے حرام نہ کرو، لیکن یہ پابندی نہیں ہے کہ جن چیزوں کے بارے میں وحیِ جلی خاموش ہو اُن کے متعلق بھی رسولؐ حِل یا حُرمت کا حکم نہیں دے سکتا۔

رسولؐ اللہ ھادیٔ مطلق

۱۔ فَاتَّبِعْنِيْ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ۝ (مریم۔۴۳)

(میری پیروی کرو تا کہ میں تمہیں سیدھا راستہ دکھاؤں) (حضرت ابراہیمؑ نے اپنے والد سے کہا)

۲۔ وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا (الانبیاء۔۷۳)

(اور ہم نے اُن (انبیاء) کو راہنما بنایا تھا جو ہمارے حکم سے (لوگوں کی) راہنمائی کرتے تھے)

۳۔ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ (الشوریٰ۔۵۲)

(اور یقیناً آپؐ لوگوں کو سیدھا راستہ دکھاتے ہیں)

۴۔ فَقَالُوْٓا اَبَشَرٌ یَّهْدُوْنَنَا فَكَفَرُوْا وَتَوَلَّوْا (التغابن ۶)

(پس اُنہوں نے کہا کیا بشر ہم کو ہدایت دیتے ہیں۔ اُنہوں نے کفر کیا اور منہ پھیر لیا)

۵۔ وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ (النازعات۔۱۹)

(اور میں تم کو (فرعون کو) اللہ کا راستہ دکھاتا ہوں)

ان آیات میں رسولؐ اور نبیؐ کا فرضِ منصبی یہ بتایا گیا ہے کہ وہ ہر معاملے میں انسانیت کی رہنمائی کرے اور اس راہنمائی اور ہدایت کو کسی شرط سے مشروط اور کسی قید سے مقید نہیں کیا گیا، بلکہ مطلق ہدایت اور غیر مشروط راہنمائی کا ذکر ہوا ہے۔ خواہ یہ ہدایت قرآن کریم میں منصوص ہو یا نصوصِ قرآنیہ سے زائد ہو۔ اس لئے کہ قرآن وسنّت دونوں کا منبع وحیِ خداوندی ہے۔

رسولؐ اللہ کتاب وحکمت کے مُعلّم

۱۔ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ؁ (البقرۃ۔۱۲۹)

(اے ہمارے رب! اور بھیج دے ان میں انہی میں سے ایک رسولؐ جو پڑھے ان کے سامنے تیری آیتیں اور تعلیم دے ان کو تیری کتاب کی اور حکمت کی اور پاک کرے ان کو۔ بے شک تو ہی غالب ہے اور حکمت والا ہے)

۲۔ كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ؁ (البقرۃ۔۱۵۱)

(جیسا کہ بھیجا ہے ہم نے تمہارے درمیان تم ہی میں سے ایک رسولؐ جو پڑھتا

ہے تمہارے سامنے ہماری آیتیں اور پاک کرتا ہے تم کو، اور تعلیم دیتا ہے تم کو کتاب وحکمت کی، اور تعلیم دیتا ہے تم کو اُن باتوں کی جن کو تم نہیں جانتے تھے)

۳۔ لَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيَاتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ج وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ ○ (آل عمران ۔۱۶۴)

(یقیناً احسان کیا ہے اللہ نے ایمان والوں پر جبکہ بھیجا ہے اُن کے درمیان اُنہی میں سے ایک رسول، جو پڑھتا ہے اُن کے سامنے اُس کی آیتیں، اور پاک کرتا ہے اُن کو، اور تعلیم دیتا ہے اُن کو کتاب وحکمت کی ۔ بے شک یہ لوگ اِس سے پہلے کھلی گمراہی میں گرفتار تھے)

۴۔ هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيِّيْنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيَاتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ ○ (الجمعہ ۔۲)

(وہی اللہ ہے جس نے بھیجا اَن پڑھ لوگوں میں اُن ہی میں سے ایک رسول، جو پڑھتا ہے اُن کے سامنے اُس کی آیتیں اور پاک کرتا ہے اُن کو اور تعلیم دیتا ہے ان کو کتاب وحکمت کی ۔ بے شک یہ لوگ اِس سے پہلے کھلی گمراہی میں مبتلا تھے)

اٹھارہواں باب

حِکمت کا مفہوم

ابنِ منظور افریقی (المتوفی ۷۱۱ھ) لفظِ حکمت کی تشریح میں لکھتے ہیں:

"والحکمۃ عبارۃ عن معرفۃ افضل الاشیاء بافضل العلوم[1]"

(حکمت بہترین چیزوں کے بہترین علم کا نام ہے)

امام راغبؒ لکھتے ہیں:

"والحکمۃ اصابۃ الحق[2]"

(حکمت حق اور سچائی کے فہم کا نام ہے)

امام المفسرین محمد بن جریرؒ فرماتے ہیں:

"والصواب من القول عندنا فی الحکمۃ انہا العلم باحکام اللہ التی لا یدرک علمہا الا ببیان الرسول وھو عندی مأخوذ من الحکم الذی بمعنی الفصل بین الحق والباطل[3]"

(ہمارے نزدیک صحیح اور درست بات یہ ہے کہ حکمت اُن احکام کے علم و معرفت کو کہا جاتا ہے جو رسولؐ کے بیان کے بغیر معلوم نہیں کئے جا سکتے

---

[1] لسان العرب۔ طبع مصر۔ ج ۱۵، ص ۳۰۔

[2] مفردات القرآن، باب الحاء مع المیم۔

[3] تفسیر ابن جریر، سورہ بقرۃ۔ ۱۲۹۔

ہمارے نزدیک حکمت کا لفظ حُکم سے لیا گیا ہے جس کے معنے ہیں حق و باطل
کے درمیان فرق و امتیاز قائم کرنا)

ائمۂ لغت وتفسیر کے ان اقوال سے معلوم ہوا کہ حکمت سے مراد ہے دانائی، سچائی اور بھلائی کی وہ باتیں جو حقیقت نفس الامری کے عین مطابق ہوں۔ قرآن کریم بھی حکمت ہے اور سنّتِ رسول ؐ بھی حکمت ہے۔ سورۂ بقرہ کی آیت ۔۱۵۱ میں: وَيُعَلِّمُكُمْ مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ۝ کا فقرہ اسی مفہوم میں آیا ہے، یعنی " وہ ہر اس حکم کی تعلیم دیتا ہے جو تم کو معلوم نہ ہو"، اس عموم وشمول میں وہ باتیں بھی شامل ہیں جو قرآنِ کریم میں صراحتاً موجود نہیں ہیں، بلکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت سے ثابت ہیں۔ اس بات کے لئے سیاقِ کلام میں کوئی قرینہ موجود نہیں ہے کہ حکمت اور مَا لَمْ تَكُونُوا سے وہی احکام مراد ہوں جو قرآن کریم کے اندر صراحتاً موجود ہیں۔ ان آیات میں حکمت کا ذکر بطور عطف ہوا ہے۔ عربی زبان میں عطف کا کثیر الاستعمال مفہوم یہ ہے کہ معطوف، معطوف علیہ کے علاوہ ہوتا ہے۔

امام شافعیؒ نے اپنی کتاب " الرسالۃ " میں اُن سات آیات کو حُجیّتِ حدیث کی دلیل قرار دیا ہے جن میں حِکْمَۃ یعنی تکوینی کا ذکر کتاب اللہ کے بعد بطور عطف ہوا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

" اللہ تعالیٰ نے کتاب کا ذکر فرمایا ہے جس سے مراد قرآنِ کریم ہے اور اس کے ساتھ حکمت کا ذکر بھی کیا ہے۔ میں نے مستند اور معتمد علماءِ قرآن سے سنا ہے کہ حِکْمَۃ سے مراد سنّتِ رسول ؐ ہے، اور علماءِ قرآن کی یہ بات کلامِ الٰہی کے عین مطابق ہے کیونکہ قرآن میں کتاب کے بعد حکمۃ کا ذکر بطوریہ عطف کیا گیا ہے اور اللہ نے اپنا یہ احسان یاد دلایا ہے کہ اُس نے کتاب وحکمت دونوں کی تعلیم دینے کے لئے اپنا رسول ؐ بھیجا ہے، تو اس کے علاوہ دوسری بات جائز نہیں ہے کہ حکمت سے مراد سنّتِ رسول ؐ ہے"[1]۔

---

[1] الرسالہ للشافعیؒ ۔ ج ۱ ص ۴۵ طبع مصطفیٰ البابی مصر ۱۹۶۹ء ۔

حکمت یعنی سنّتِ رسولؐ بھی مُنزّل من اللہ ہے

قرآنِ کریم کی ۱۱ آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کی طرح حکمت، یعنی سنّتِ رسولؐ بھی منزّل من اللہ ہے ۔ فرق صرف اتنا ہے کہ قرآن کے الفاظ بھی منزّل ہیں اور سنّتِ رسولؐ کا صرف مضمون و مفہوم نازل کردہ ہے ۔ الفاظ رسولؐ اللہ کے ہیں ۔

نقشۂ آیات ملاحظہ فرمائیے :

نام سورۃ	نمبر آیت	نام سورۃ	نمبر آیت	نام سورۃ	نمبر آیت
البقرۃ	۲۳۱	النساء	۵۴	الاحزاب	۳۴
البقرۃ	۲۵۱	النساء	۱۱۳	ص ۳	۲۰
آلِ عمران	۴۸	المائدہ	۱۱۰	الزخرف	۶۳
آلِ عمران	۸۱	بنی اسرائیل	۳۹		

مثال کے طور پر چند آیات ملاحظہ فرمائیں :

وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَا اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ط (البقرۃ -۲۳۱)

(اور یاد کرو اللہ کا احسان جو تم پر ہوا ہے اور اس کو کہ نازل فرمائی ہے اُس نے تم پر کتاب اور حکمت جس کے ذریعے وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے)

وَاَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ٥ (النّساء -۱۱۳)

(اور اتاری ہے اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت اور سمجھائی ہیں تم کو وہ باتیں جو تم کو معلوم نہیں تھیں ۔ اور تم پر اللہ کا بہت بڑا احسان ہے)

قرآن کی تشریح فریضۂ نبوت ہے

سورۂ المائدہ آیت نمبر ۱۵ اور ۱۹ ۔ سورۂ ابراہیم کی ۔ ۴ ۔ سورۂ النحل کی ۔ ۴۴ اور سورۂ الزّخرف کی ۔ ۶۳ میں کہا گیا ہے کہ قرآن کریم اور وحیٔ الٰہی کی تشریح و تبیین کا قانونی حق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے، بلکہ یہ آپؐ کے فرائضِ منصبی میں شامل ہے ۔

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ (ابراهيم ـ ۴)

(اور نہیں بھیجا ہم نے کوئی رسول، مگر اُس کی اپنی قوم کی زبان میں، تاکہ وہ اُن کے سامنے خدا کے احکام کھول کر بیان کرے)

وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝ (النحل ـ ۴۴)

(اور اتاری ہے ہم نے تیری جانب نصیحت (قرآن کریم) تاکہ تو لوگوں کے سامنے اس نصیحت کو کھول کر بیان کرے (تشریح کرے)

بلاغِ مُبین :

منکرین سنّت کا دعویٰ ہے کہ رسول کا فریضہ صرف احکامِ خداوندی، یعنی قرآن پہنچانا ہے، حالانکہ قرآن کریم کی، آیتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ فریضہ صرف پہنچانا (بلاغ) ہی نہیں، بلکہ کھول کر پہنچانا (بلاغِ مبین) ہے ۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی ذہن نشین کرنے کی ہے کہ بلاغ سے مراد صرف قرآنی آیات پہنچانا نہیں ہے، بلکہ ہر قسم کا پیغام پہنچانا ہے خواہ وحی جلی، یعنی قرآنی آیات ہوں یا وحی خفی، یعنی سنّتِ رسول ہو۔ "بلاغِ مبین" کا مطلب ہے ہر قسم کے پیغامِ الٰہی کو تشریح کے ساتھ پہنچانا ۔

(نقشہ آیات آئندہ صفحہ پہ)

نام سورۃ	آیت نمبر	نام سورۃ	آیت نمبر
المائدہ	۹۲	النحل	۳۵
النحل	۸۲	النور	۵۴
العنکبوت	۱۸	یٰسٓ	۱۷
التغابن	۱۲		

مثال کے طور پہ دو آیات ملاحظہ فرمائیے :

فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوا أَنَّمَا عَلَىٰ رَسُولِنَا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ ۝

(المائدہ-۹۲)

(پس اگر تم نے منہ پھیر لیا، تو سمجھ لو کہ ہمارے رسولؐ پہ کھول کر پہنچانا لازم کیا گیا ہے)

فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ ۝ (النحل-۳۵)

(پس نہیں ہے رسولوں پہ، مگر کھول کر پہنچانا)

۱۱- رَسُولِ مُبین :

گیارہ آیتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کا رسولؐ صرف پیغام رساں ہی نہیں، بلکہ رسولِ مُبین اور نذیرِ مُبین ہے یعنی پیغام اور وعیدِ خداوندی کی وضاحت بھی اُس کا فریضہ ہے :

نقشۂ آیات ملاحظہ کیجئے :

نام سورۃ	نمبر آیت	نام سورۃ	نمبر آیت	نام سورۃ	نمبر آیت
الحِجر	۸۹	الزّخرف	۲۹	الذّاریات	۵۱
الشعراء	۱۱۵	الدخان	۱۳	الملک	۲۶
العنکبوت	۵۰	الاحقاف	۹	نوح	۲
صٓ	۷۰	الذاریات	۵۰		

مثال کے طور پر چند آیات ملاحظہ فرمائیں :

وَقَدْ جَاءَهُمْ رَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ ۝ (الدخان - ۱۳)

(بے شک آ گیا ہے اُن کے پاس کھول کر بیان کرنے والا رسولؐ)

قُلْ اِنِّيْٓ اَنَا النَّذِيْرُ الْمُبِيْنُ ۝ (الحجر - ۸۹)

(کہہ دو کہ میں تو کھلے انداز میں ڈرانے والا ہوں)

۱۲ - شہادتِ حق :

قرآن کریم کی ۵ آیات میں نبی کریمؐ کو شاہد اور شہید کہا گیا ہے، یعنی بیان کرنے والا، اطلاع دینے والا اور خبردار کرنے والا۔

امام راغبؒ لکھتے ہیں :

والشهادة قول صادر عن علم حصل بمشاهدة بصيرة او بصر[1]۔

(شہادت ہر اُس قول کو کہتے ہیں جو بصیرت یا مشاہدے پر مبنی ہو)

مختار الصحاح میں ہے "الشهادة خبر قاطع[2]"

(شہادت قطعی خبر کو کہتے ہیں)

نقشہ آیات یہ ہے :

نام سورۃ	نمبر آیت	نام سورۃ	نمبر آیت
البقرہ	۱۴۳	الاحزاب	۴۵
الحج	۷۸	الفتح	۸
		المزمّل - ۱۵	

---

[1] مفردات القرآن - ص ۲۶۹ -

[2] مختار الصحاح - ص ۳۴۹ -

مثال کے طور پر چند آیات ملاحظہ فرمائیے :

يَا اَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّا اَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا (الاحزاب-۴۵)

اِنَّا اَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا - (الفتح-۸)

(اے نبیؐ ہم ہی نے بھیجا ہے تم کو حق کی گواہی دینے والا حق بیان کرنیوالا)

اِنَّا اَرْسَلْنَا اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ (المزمل-۱۵)

(ہم ہی نے بھیجا ہے تمہارے پاس رسولؐ احکام بتانے والا)

شہادتِ حق، یعنی حق بیان کرنا اور احکام بتانا قول کے ذریعے بھی ہوتا ہے جسے "شہادتِ قولی" کہا جاتا ہے اور عمل کے ذریعے بھی جسے "شہادتِ عملی" کہا جاتا ہے۔ ان آیات میں ایسی کوئی تخصیص و تقیید نہیں ہے جس سے معلوم ہوتا ہو کہ نبی صرف اُسی حق کی گواہی دیتا ہے جو قرآنی آیات میں موجود و مذکور ہے، بلکہ بغیر کسی قید و شرط کے کہا گیا ہے کہ نبی کا فرضِ منصبی حق کی گواہی دینا، حق بیان کرنا اور خدا کے احکام بتانا ہے۔ قول و بیان کے ذریعے بھی اور عملی نمونے کے ذریعے بھی۔ اِسی قولِ رسولؐ اور عملِ رسولؐ کا نام ہے سنّتِ رسولؐ۔

رسول چونکہ اللہ کا مقرر کردہ اور نامزد شدہ شاہد ہوتا ہے، اس لیے اُس کی قولی اور عملی شہادت میں دانستہ یا نادانستہ غلطی اور خطا کا امکان بھی نہیں ہوتا۔

۱۳ الدَّاعِی اِلَی اللہ :

قرآنِ کریم کی ۷ آیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دَاعِیٌ اِلَی اللہ کہا گیا ہے اور اللہ کی بندگی کی دعوت آپ کا فریضۂ نبوت قرار دیا گیا ہے۔ قرآن کریم کے الفاظ پڑھ کر سنانا بھی دعوت ہے، آیاتِ قرآنیہ کی تشریح و تفسیر کرنا بھی دعوت ہے اور زائد از قرآن کوئی حکم اور ہدایت دینا بھی دعوت اِلی اللہ کے عموم میں شامل ہے، کیونکہ بحیثیت داعی اِلی اللہ آپؐ نے جو حکم و ہدایت بھی دی ہے، وہ بھی الفاظِ قرآنیہ کی طرح وحیِ خداوندی پر مبنی ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے :

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝

(اور نبیؐ اپنی ذاتی خواہش سے کوئی بات نہیں کرتے، بلکہ اُن کی ہر بات وحی ہوتی ہے)

نقشۂ آیات ملاحظہ کیجئے :

نمبر آیت	نام سورۃ	نمبر آیت	نام سورۃ	نمبر آیت	نام سورۃ
۸۷	القصص	۷۳	المؤمنون	۲۴	الانفال
۴۶	الاحزاب	۳۱	الاحقاف	۱۰۸	یوسف
۴۱	المومن	۸	الحدید	۱۲۵	النحل
۴۲	المومن	۳۲	الاحقاف	۵۷	الکہف
۵	حم السجدہ	۵	نوح		
۱۵	حم السجدہ	۷	نوح	۶۷	الحج

مثال کے طور پر چند آیات ملاحظہ فرمائیے :

يَا قَوْمَنَا أَجِيبُوا دَاعِيَ اللَّهِ ۔ (احقاف ۔۳۱)

(جنوں نے کہا اے ہماری قوم، مان لو اللہ کی طرف بلانے والے کو)

وَإِنَّكَ لَتَدْعُوهُمْ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ۝ (المؤمنون ۷۳)

(اور بے شک تم ان کو بلاتے ہو راہِ راست کی طرف)

وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ (الاحزاب ۴۶)

(اور بھیجا ہے ہم نے اللہ کی طرف بلانے والا اُسی کے حکم سے)

۱۴۔ مُذَکِّر :

فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنتَ مُذَكِّرٌ ۝ (الغاشیہ ۔۲۱)

(پس یاددہانی کراتے رہو، بے شک تم یاددہانی کرانے والے ہو)

تذکیر کے معنے ہیں یاددہانی کرانا اور نصیحت کرنا، مقصد یہ ہے کہ آپؐ ان کو اللہ کی

نعمتیں یاد دلائیے، تاکہ یہ شکر ادا کریں اور آپ کے احکام سمجھائیے، تاکہ اُن پر عمل کریں۔ ظاہر ہے کہ احکام ونصائح میں وہ احکام اور نصیحتیں بھی شامل ہیں جو قرآن کریم میں صراحتاً مذکور نہیں ہیں۔

امام المفسرین محمد بن جریر طبری ؒ مذکورہ آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں :

فذکر یا محمد عبادی بآیاتی وعظهم بحجتی وبلغهم برسالتی انما انت مذکر یقول انما ارسلتك الیهم مذکرًا لتذکرهم نعمتی عندهم وتعرّفهم اللازم لهم وتعظهم [1]

(اے محمدؐ میرے بندوں کو میری آیات یاد دلاؤ، ان کو میری بتائی ہوئی دلیلوں کے ذریعے نصیحت کرو اور اُن کو میرا پیغام پہنچاؤ۔ میں نے آپؐ کو ان کے پاس یاد دہانی کرانے والا بنا کر بھیجا ہے، تاکہ آپؐ اُن کو میری نعمتیں یاد دلائیں اور انہیں وہ احکام سمجھائیں جن پر عمل کرنا لازم ہے اور اِن کو نصیحت کرتے رہیں)

بخاری شریف کی کتاب الرقاق (دلوں میں رِقّت پیدا کرنے والی احادیث) میں ایسی احادیث موجود ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بحیثیت مُذکّر ارشاد فرمائی ہیں۔ ترغیب وترھیب سے متعلق آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ نبویہؐ دونوں اس تذکیر کا مصداق ہیں۔ تخصیص بالقرآن کے لئے کوئی معقول وجہ موجود نہیں ہے۔

۱۵ اَلْبَیِّنَۃ :

سورۂ البیّنۃ میں ارشادِ خداوندی ہے :

لَمْ یَکُنِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتَابِ

---

[1] تفسیر ابن جریر۔ ج ۳۰۔ ص ۱۶۶ سورۃ الغاشیۃ۔

وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝ رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۔

(البینۃ ۔ ۱ ۔ ۲)

(نہیں تھے باز آنے والے وہ لوگ جو منکر تھے اہلِ کتاب اور مشرکین میں سے یہاں تک کہ آگئی اُن کے پاس کھلی دلیل، یعنی اللہ کا رسول ﷺ جو پڑھتا ہے اُن کے سامنے پاک صحیفے)

ابنِ جریرؒ، قرطبیؒ اور ابنِ کثیرؒ نے رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ کو البَیِّنَہ کی تفسیر قرار دیا ہے۔ نحوی ترکیب میں رسول ﷺ، البَیِّنَہ کا بدل ہے۔ اور مفہوم یہ ہے کہ اللہ کا رسول ﷺ کھلی اور روشن دلیل ہے اور اس کا ہر قول و فعل امّت کے لئے حجّت اور روشن دلیل ہے۔ پاک صحیفوں کی تلاوت، تو فرائضِ رسالت میں سے صرف ایک فریضہ ہے، نبی کی زندگی تو ساری کی ساری دلیل اور البَیِّنَہ ہوتی ہے اور اس کے تمام کارنامے اور ارشادات مأخذِ قانون ہوتے ہیں۔

۱۶۔ بُرھان :

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا ۝ (النساء ۔ ۴ ۔ ۱۷)

(اے لوگو، بے شک آچکی ہے تمہارے پاس حجّت اور سند تمہارے رب کی جانب سے اور اتاری ہم نے تم پر کھلی اور واضح روشنی)

بعض مفسّرینؒ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اس آیت میں بُرھان اور نورِ مُبین دونوں سے قرآن کریم مراد ہے، یعنی نورِ مبین بُرھان کی تفسیر ہے۔ یہ نقطۂ نظر بھی غلط نہیں ہے لیکن زیادہ مناسب بات وہ ہے جو امام المفسّرینؒ نے لکھی ہے :

وھو محمد ﷺ جعلہ اللہ علیکم حجۃ قطع بھا عذرکم[1]

---

[1] تفسیر ابن جریرؒ ج ۶ ص ۳۹۔

(یہ بُرھان محمدؐ ہیں جن کو اللہ نے تم پر حجّت بنا کر بھیجا ہے، جس کی وجہ سے اُس نے تمہارے بہانوں کی جڑ کاٹ دی ہے)

یعنی اتمامِ حجت کے لئے اللہ نے کتاب بھی نازل فرمائی ہے اور مُعلّمِ کتاب بھی مبعوث فرمایا ہے، جس کی ہر بات اور ہر عمل بُرھان اور غالب آجانے والی دلیل ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ بُرھان سے مراد سنّتِ رسولؐ اور نورِ مبین سے مراد قرآن کریم ہے۔ اور دونوں مأخذِ قانون ہیں۔ دونوں حُجّتِ شرعیہ ہیں، دونوں منزّل مِنَ اللہ ہیں اور دونوں معیارِ حق اور واجب الاطاعت ہیں۔

۱۷ نُور اور سِراجِ مُنیر :

قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُبِينٌ ۝ (المائدۃ - ۱۵)

(بے شک آچکی ہے تمہارے پاس اللہ کی جانب سے روشنی اور کتابِ مُبین)

وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا ۝ (الاحزاب - ۴۶)

(اور بھیجا ہم نے آپؐ کو اللہ کی طرف بلانے والا اُس کے حکم سے اور چمکتا ہوا چراغ (یا چمکتا ہوا سورج بنا کر)

بعض مُفسّرینؒ نے کتابِ مُبین کو نُور کی تفسیر قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ نُور سے مراد قرآنِ کریم ہے۔ عربی زبان میں حرف "و" تفسیر و بیان کے لئے بھی آتا ہے۔ اِن حضرات کے نزدیک آیت کا مفہوم یہ ہے کہ "آئی ہے تمہارے پاس اللہ کی جانب سے روشنی، یعنی کتابِ مبین" یہ تفسیر بھی سیاقِ کلام کے خلاف نہیں ہے اور سورۂ النساء - ۱۷۴ میں قرآن کو نُور کہا بھی گیا ہے، لیکن حرفِ عطف کا اصل تقاضا یہی ہے کہ معطوف جدا چیز ہو اور معطوف علیہ جدا، اس لئے زیادہ صحیح اور مناسب وہی مفہوم ہے جو ابنِ جریر طبریؒ اور امام رازیؒ نے بیان کیا ہے یعنی:

بالنور محمد الذی انار اللہ بہ الحق و اظھر بہ الاسلام و محق بہ الشرک فھو نور لمن استنار بہ یبیّن الحق[1]

---

[1] تفسیر ابن جریر - ج ۶ ص ۱۶۱ -

(نور سے مراد محمدؐ ہیں جن کی وجہ سے اللہ نے حق کو روشن، اسلام کو غالب کیا اور شرک کو مٹایا ہے، پس محمدؐ روشنی اور اُجالا ہیں ہر اُس شخص کے لئے جو آپؐ سے روشنی حاصل کرنا چاہے، یعنی آپؐ حق کو واضح کر کے بیان فرمایا کرتے تھے)

مختار الصّحاح میں نور کے معنے الضِیا بتائے گئے ہیں، یعنی روشنی اور اُجالا۔ امام راغبؒ لکھتے ہیں:

"النور الضوء المنتشر الذی یعین علی الابصار" [1]

(نور اس روشنی کو کہا جاتا ہے جو زمین پر پھیلتی ہو اور ماحول کو دیکھنے میں آنکھوں کی مدد کرتی ہو)

روشنی دو قسم کی ہوتی ہے (۱) مَعنوی ——— اور (۲) مَحسوس ———

محسوس روشنی وہ ہے جو ظاہری آنکھوں سے نظر آتی ہو، جیسے سورج، چاند، ستاروں، بجلی اور چراغ کی روشنی۔ اس نوع کی روشنی سے سطحِ زمین منوّر ہوتی ہے۔ اور معنوی روشنی وہ ہے جو بصیرت اور دل کی بینائی سے محسوس کی جاتی ہے، یعنی وہ امورِ الٰہیہ اور احکامِ شرعیّہ جو انسان کے ظاہر اور باطن کو حُسنِ اعتقاد، حُسنِ کردار، حُسنِ گفتار اور حُسنِ اخلاق کے نور سے منوّر کرتے ہیں۔

——— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ اپنی ذات اور تخلیق کے اعتبار سے بشر اور انسان تھے، لیکن آپؐ کی تعلیمات اور آپؐ کی سیرت وہ ہمہ گیر اور عالمگیر روشنی ہے جس کی وجہ سے کفر وشرک کی تاریکیاں چھٹ گئیں اور توحید واسلام کا اجالا پھیل گیا۔ سورۂ احزاب کی آیت ۴۶ میں آپؐ کو سراجِ مُنیر کا نام دیا گیا ہے۔

ائمۂ لغت اور ائمۂ تفسیر دونوں نے سراج کے دو معنے بیان کئے (۱) چراغ ——— اور (۲) سورج [2]۔ لفظِ سراج زیرِ بحث آیت کے علاوہ قرآن کریم کی تین دوسری آیات

---

[1] مفردات القرآن۔ ص ۵۲۸۔

[2] لسان العرب۔ ج ۳۔ ص ۱۲۲۔

میں بھی آیا ہے جو یہ ہیں :

۱۔ وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِيهِنَّ نُورًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا (نوح-١٦)

۲۔ وَجَعَلَ فِيهَا سِرَاجًا وَّقَمَرًا مُّنِيرًا ہ (الفرقان - ٦١)

۳۔ وَجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ہ (النباء - ١٣)

ان تینوں آیات میں سراج سے مراد آفتاب، یعنی سورج ہے۔ اس لئے سورۂ احزاب کی آیت میں بھی "سراجِ منیر" کا ترجمہ "آفتابِ عالمتاب" اور "چمکنے اور چمکانے والا سورج" کرنا قرآن کریم کے بالکل مطابق ہے۔

ـــ رسول اللہ کو نور اور سراجِ مُنیر کا نام دینے کا لازمی تقاضا یہی ہے کہ آپؐ کی تعلیمات اور آپؐ کے تمام اقوال و اعمال سراسر روشنی ہیں جس سے کفر و شرک کی ظلماتِ شدیدہ دور ہوتی ہے۔ آپؐ کی ہر بات روشنی ہے، ہر عمل روشنی ہے اور آپؐ کی ساری زندگی روشنی ہے۔ آیت میں یہ نہیں کہا گیا کہ آپؐ جو آیاتِ قرآنیہ پڑھتے ہیں وہی نور اور سراجِ منیر ہیں بلکہ آپؐ کو بجائے خود نور اور سراج کہا گیا ہے جس کے معنے یہی ہیں کہ آپؐ کی ہر بات اور ہر عمل حجتِ شرعیہ ہے، خواہ قرآن میں صراحتاً اُس کا ذکر ہو یا وہ آپؐ کا ارشاد ہو (حدیث)

جس طرح سورج سارے عالم کے لئے ہے، کسی خاص خطّے اور علاقے اور کسی مخصوص قوم اور قبیلے کے لئے نہیں ہے، اسی طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلّم بھی سارے جہان اور قیامت تک آنے والے سارے انسانوں کے رسولؐ ہیں۔ اور جس طرح سورج اپنے ہر پہلو کے اعتبار سے خود بھی روشن اور مُنوّر ہے اور سارے عالم کو بھی منوّر بناتا ہے، اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا ظاہر و باطن خود بھی توحید و ایمان کی روشنی سے منوّر ہے اور آپؐ کے نورِ نبوّتؐ نے دنیا کے انسانوں کے ایک بہت بڑے حصے کو ایمان کی روشنی سے منوّر کر دیا ہے۔

۱۸۔ بَشِیر و مُبَشِّر :

۲۷ آیات میں ـــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو بشیر اور مُبشِّر کا نام دیا گیا ہے، یعنی خوشخبری سنانے والا اور بشارتیں دینے والا۔ ان آیات کے سیاق و سباق میں کوئی قرینہ ایسا موجود نہیں

ہے جس سے معلوم ہوتا ہو کہ حضرت رسول اللہؐ صرف بشارت کی قرآنی آیات پڑھ کر سنانے والے ہیں، بلکہ بشیر و مبشِر کا ذکر مطلقاً ہوا ہے۔ جس میں قرآنی بشارتیں بھی شامل ہیں اور قرآن سے زائدُ بشارتیں بھی۔

اعمالِ صالحہ کے جو فضائل اور صالحین کے لئے اجر وثواب اور بلندیٔ درجات کے جو مواعید احادیث نبویہؐ میں ذکر ہوئے ہیں وہ بھی من جانب اللہ ہیں اور وحیٔ خداوندی پہ مبنی ہیں۔

(نقشہ آیات ملاحظہ کیجئے:

نام سورۃ	نمبر آیت	نام سورۃ	نمبر آیت	نام سورۃ	نمبر آیت
البقرۃ	۲۵	النساء	۱۶۵	التوبہ	۱۱۲
〃	۱۱۹	المائدہ	۱۹	یونس	۲
〃	۱۵۵			〃	۸۷
〃	۲۱۳	الانعام	۴۸	ھود	۲
〃	۲۲۳	الاعراف	۱۸۸	بنی اسرائیل	۱۰۵
الکہف	۵۶	الفرقان	۵۶	یٰس	۱۱
		الاحزاب	۴۵	الزمر	۱۷
مریم	۹۷	〃	۴۷	حٰم سجدہ	۴
الحج	۳۴	السباء	۲۸	الفتح	۸
〃	۳۷	فاطر	۲۴		

۱۹ نَذیر و مُنْذِر:

قرآن میں ۹ مقامات پہ ـــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نذیر یا مُنْذِر کا نام دیا گیا ہے۔ اس صفاتی نام کے معنے صرف یہی نہیں ہیں کہ آپؐ قرآن کی آیاتِ وعید سنانے والے تھے، بلکہ اس

کے معنے مطلق ڈرانے والے اور عذاب کی خبر دینے والے کے ہیں خبر قرآن کریم میں صراحتاً مذکور ہو یا نہ ہو۔ اس عموم مطلق کا تقاضایہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعمالِ سیئہ اور کفر و شرک کی مذمت میں اور کفار و مشرکین اور منافقین و فاسقین کو عذاب دیے جانے کے متعلق جو ارشادات فرمائے ہیں وہ بھی من جانب اللہ ہیں، یعنی تمام ترهیبی احادیث بھی وحیِ الٰہی پر مبنی ہیں، اس لئے کہ ثواب اور عذاب بھی توقیفی ہیں اور خدا کا نبی اپنی خواہش اور رائے سے نہ حکمِ شرعی بیان کرتا ہے نہ اس کا حکمِ اُخروی، یعنی ثواب و عذاب بیان کرتا ہے۔

نقشہ آیات ملاحظہ کیجئے:

نام سورۃ	نمبر آیت	نام سورۃ	نمبر آیت	نام سورۃ	نمبر آیت
البقرۃ	۶	الاعراف	۱۸۴	مریم	۳۹
〃	۱۱۹	〃	۱۸۸	〃	۹۷
〃	۲۱۳	یونس	۲	الانبیاء	۴۵
النساء	۱۶۵	〃	۱۰۱	الحج	۴۹
المائدۃ	۱۹	ھود	۲	الفرقان	۱
〃	۱۹	〃	۱۲	〃	۵۱
الانعام	۱۹	〃	۲۵	〃	۵۶
〃	۴۸	الرعد	۷	الشعراء	۱۹۴
〃	۵۱	ابراھیم	۴۴	〃	۲۰۸
〃	۹۲	النحل	۲	〃	۲۰۸
〃	۱۳۰	بنی اسرائیل	۱۰۵	〃	۱۱۵
الاعراف	۲	الکھف	۲	الحجر	۸۹
〃	۶۳	〃	۴	القصص	۴۶
〃	۶۹	〃	۵۶	العنکبوت	۵۰

السجدہ	۳	یٰسٓ	۷۰	قٓ	۲
〃	۳	النمل	۹۲	الذاریات	۵۰
الاحزاب	۴۵	الصافّات	۷۲	〃	۵۱
السبا	۲۸	صٓ	۴	النجم	۵۶
〃	۳۴	〃	۶۵	القمر	۲۳
〃	۴۴	〃	۷۰	〃	۳۳
〃	۴۶	الزّمر	۷۱	〃	۳۶
فاطر	۱۸	المومن	۱۵	〃	۳۶
〃	۲۳	〃	۱۸	〃	۵
〃	۲۴	حٰمٓ سجدہ	۴	〃	۴۱
		〃	۱۳	الملک	۸
〃	۳۷	الشوریٰ	۷	〃	۹
〃	۴۲	〃	۷	〃	۲۶
〃	۴۲	الزّخرف	۲۳	نوح	۱
یٰسٓ	۶	الاحقاف	۹	〃	۲
〃	۱۰	〃	۱۲	المدّثّر	۲
〃	۱۰	〃	۲۱	النازعات	۴۵
〃	۱۱	الفتح	۸	اللیل	۱۴

۲۰ رحمت اور نعمت

وَمِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ ؕ قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَيُؤْمِنُ

لِلْمُؤْمِنِیْنَ وَرَحْمَۃٌ لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ ط وَالَّذِیْنَ
یُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰہِ لَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ○ (التوبہ۔۶۱)

(اور ان میں سے وہ لوگ بھی ہیں جو بدگوئی کرتے ہیں نبی کی اور کہتے ہیں کہ کانوں کا کچّا ہے (ہر کسی کی بات سنتا ہے) کہدو کہ کان ہے تمہارے بھلے کے واسطے۔ ایمان رکھتا ہے اللہ پر اور اعتماد کرتا ہے ایمان والوں کی بات پر، اور رحمت ہے اُن لوگوں کے لئے جو ایمان لاچکے ہیں تم میں سے اور جو لوگ بدگوئی کرتے ہیں اللہ کے رسولؐ کی، اُن کے لئے دردناک عذاب ہے)

منافقینِ مدینہ نجی مجالس میں ـــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اور اسلام کی بدگوئی کرتے تھے۔ اگر کوئی کہتا کہ کہیں ہماری یہ باتیں اُس تک پہنچ نہ جائیں، تو کہتے تھے پرواہ نہ کرو وہ تو ہر کسی کی بات سن لیتا ہے۔ اُس کو باتوں میں لے آنا ہمارے لئے کوئی مشکل کام نہیں ہے، ہم تو جھوٹی قسمیں کھا کر اور جھوٹی تاویلیں کرکے اپنی براءت اور صفائی کا اسے یقین دلادیں گے اور وہ مطمئن ہوجائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اِسی روش کے متعلق فرمایا کہ میرے نبی کی یہ خوش خلقی اور شرافت ہے کہ وہ بات تو ہر ایک کی سنتا ہے اور اُس میں تمہاری ہی بھلائی ہے، لیکن اعتماد اور یقین اہلِ ایمان ہی کی باتوں پہ کرتا ہے اور اُن اہلِ ایمان کے لئے وہ سراسر رحمت ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے رحمت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آپؐ کی تعلیمات، آپؐ کی شریعت اور آپؐ کی سنّت اللہ کی رحمت ہے۔ رضائے الٰہی کے حصول اور معاش و معاد دونوں کی فلاح کا ذریعہ سنّتِ رسولؐ کی پیروی ہے۔ ایمان والوں کی تخصیص اس لئے کی گئی ہے کہ رحمتِ محمّدیہؐ، یعنی سیرتِ نبویہؐ اور سیرتِ طیّبہؐ کی برکات سے وہی لوگ مستفید ہوسکتے ہیں جو رسولؐ اللہ کی رسالت کو صدقِ دِل اور ارادۂ عمل کی نیّت سے مانتے ہوں، ورنہ آپؐ اہلِ ایمان ہی کے لئے رحمت نہیں ہیں، بلکہ کُل عالم کے لئے رحمت ہیں :

امام ابن جریرؒ لکھتے ہیں :

وجعلہ اللّٰہ رحمۃ لمن اتبعہ واھتدی بھدیہ

وصدق بما جاء به من عند ربه لان الله استنقذ ہم من الضلالۃ [1]

(اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اُن لوگوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے جو آپؐ کی پیروی کرتے ہیں آپؐ کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے ہیں اور ہر اُس بات کی تصدیق کرتے ہیں جسے آپؐ اپنے رب کی جانب سے لے کر آئے ہیں، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو آپؐ ہی کے ذریعے گمراہی سے بچایا ہے)

سورۃ الانبیاء میں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سارے عالم کے لئے رحمت قرار دیا گیا ہے:

اِنَّ فِیْ ھٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِیْنَ ۝ وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ ۝ (الانبیاء-۱۰۶ و ۱۰۷)

(بے شک اس قرآن میں پیغام ہے اُن لوگوں کے لئے جو بندگی کرنے والے ہیں۔ اور نہیں بھیجا ہم نے (اے نبیؐ) تم کو مگر رحمت بنا کر سارے جہان کے لئے)

اِنَّ فِیْ ھٰذَا لَبَلٰغًا میں قرآنِ کریم کی طرف اشارہ ہے اور رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ میں سنّتِ رسولؐ کی طرف، جو قرآن کریم کی تفسیر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ رسولؐ کی سیرت و سنّت دنیا جہان میں ہر ایک کے لئے رحمت ہے۔ آپؐ کی تعلیمات ہمہ گیر اور عالمگیر ہیں۔ اِس آفتابِ عالمتاب کا فیض ہر طرف پہنچتا ہے اور اس کی روشنی ہر جانب پھیلی ہوئی ہے، لیکن اگر کوئی شخص خود اپنے اوپر تمام دروازے اور کھڑکیاں بند کر لے، تو یہ اُس کی اپنی دیوانگی، بے وقوفی اور بدقسمتی ہوگی، ورنہ آفتابِ نبوتؐ اور شمعِ رسالتؐ کی فیاضی کے عالمگیر اور ہمہ گیر ہونے میں شک و شبہے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نورِ ہدایت کے منکرین و معاندین کی دیوانگی کا ذکر اس طرح کیا ہے:

ولاھد ینھم وھم کارھون انی رحمۃ بعثنی

اللّٰہ ولا یتوفانی حتی یظہر اللّٰہ دینہ (ابن کثیر)

(میں ان کی راہنمائی کرتا ہوں باوجود اس کے کہ ان کو میری ہدایت ناگوار لگتی ہے۔ میں تو اللہ کی رحمت ہوں، اللہ نے مجھے اس کام پر مقرر فرمایا ہے اور وہ مجھے اس وقت تک نہیں اٹھائے گا جب تک کہ وہ اپنے دین کو غالب نہ کر دے)

امام فخر الدین رازیؒ نے اس نکتے کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے:

ثم انما ینتفع بھذہ الرحمۃ من کانت ھمتہ طلب الحق فلا یرکن الی التقلید ولا الی العناد[1]

(اس رحمت سے فائدہ وہی لوگ اٹھا سکتے ہیں جو حق کے متلاشی ہوں اور تقلید و عناد کی جانب متوجہ نہ ہوں)

علامہ حافظ ابن قیمؒ فرماتے ہیں:

انہ رحمۃ لکل احد لکن المومنون قبلوا ھذہ الرحمۃ فانتفعوا بھا دنیا و اخریٰ والکفار ردوھا فلم یخرج بذالک عن ان یکون رحمۃ لھم لکن لم یقبلوھا کما یقال: ھذا دواء لھذا المرض فاذا لم یستعملہ لم یخرج عن ان یکون دواء لذالک المرض[1]

(نبی کریمؐ تو ہر ایک کے لئے رحمت ہیں لیکن ایمان والوں نے اس رحمت کو قبول کر کے دنیا اور آخرت دونوں کے فائدے حاصل کر لئے اور کفار نے اس کو رد کر دیا، تاہم ان کے رد کرنے کے باوجود وہ ان کے لئے بھی رحمت ہیں،

---

[1] جلاء الافھام فی الصلوٰۃ والسلام علیٰ خیر الانام۔ از ابن قیمؒ ص۹۹، طبع مکتبہ نوریہ۔ فیصل آباد۔ پاکستان

مگر انہوں نے اس رحمت کو قبول نہیں کیا، جیسا کہ کہا جاتا ہے" یہ چیز اس مرض کی دوا ہے" تو جو شخص اس دوا کو استعمال نہیں کرتا اُس کے لئے بھی دوا ہے، لیکن وہ خود اُس سے فائدہ نہیں اٹھاتا)

علامہ آلوسیؒ (المتوفی ۱۲۷۰ھ) لکھتے ہیں:

انه علیه السلام ارسل بما هو سبب لسعادة الدارین ومصلحة النشأتین الا ان الکافر فوّت علی نفسه الانتفاع بذالك و اعرض لفساد استعداده عما هناك فلا یضر ذالك فی کونه ارسل رحمة بالنسبة الیه ایضاً کما لا یضر فی کون العین العذبة مثلاً نافعة عدم انتفاع الکسلان بها لکسله[1]

(نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایسی شریعت دے کر بھیجے گئے ہیں جو دونوں جہاں کی سعادت اور مصلحت کے حصول کا ذریعہ ہے، مگر کافر نے اپنے آپ کو اس کے فوائد سے خود محروم کر رکھا ہے اور اپنی استعداد کو بگاڑ کر اُن برکات سے روگردانی کی ہے جو اس شریعت کے اندر موجود ہیں۔ پس یہ اعراض اور فسادِ استعداد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رحمت ہونے کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتا، جیسے کہ میٹھے پانی کے چشمے کے نفع بخش ہونے کو اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا کہ کوئی سست ہٹ دھرم رویے کا شخص اُس سے اپنی پیاس نہیں بجھاتا)

(علامہ ابن القیمؒ نے اپنی دوسری کتاب میں حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رحمۃ للعالمین ہونے کی بہترین اور دلنشین تشریح کی ہے۔ فرماتے ہیں:

لولا النبوات لم یکن فی العالم علم نافع البتّة ولا عمل صالح ولا صلاح فی معیشة ولا قوام لمملکة

---

[1] روح المعانی۔ ج ۱۷۔ ص ۱۰۴۔ الانبیاء۔

ولكان الناس بمنزلة البهائم والسباع العادية والكلاب الضارية التى يعدو بعضها على بعض وكل خير فى العالم فمن آثار النبوة وكل شر وقع فى العالم او سيقع فبسبب خفاء آثار النبوة ودروسها فالعالم جسد روحه النبوة ولا قيام للجسد بدون روحه ولهذا اذا انكسفت شمس النبوة من العالم ولم يبق فى الارض شيئ من آثارها البتة انشقت سماؤه و انتثرت كواكبه وكوّرت شمسه وخسف قمره ونسفت جباله وزلزلت ارضه واهلك من عليها فلا قيام للعالم الا بآثار النبوّة[1]

(اگر انبیاء نہ ہوتے تو اس جہان میں نہ علمِ نافع ہوتا، نہ عملِ صالح۔ نہ معیشت درست ہوتی اور نہ مملکت وحکومت کا صحیح نظام ہوتا۔ لوگ جانوروں، خونخوار درندوں اور شکاری کتوں کی طرح ہوتے جو ایک دوسرے پر جارحانہ حملہ کرتے رہتے ہیں۔

اس عالم کی ہر بھلائی اور خوبی نبوت کے آثار (تعلیمات) کی وجہ سے ہے اور اس عالم میں جو برائی اب تک رونما ہوئی ہے یا آئندہ ظاہر ہونے والی ہے، اُس کا حقیقی سبب آثارِ نبوّت کی پوشیدگی اور بوسیدگی ہے۔ یہ عالم ایک جسم ہے جس کی روح نبوّت ہے، اور جسم بغیر روح کے قائم نہیں رہ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ جب نبوت کا سورج بے نور ہو جائے گا (لوگ تعلیماتِ انبیاء سے باغی ہو جائیں گے) اور زمین پر اس کا کوئی اثر (نشانی اور علم) باقی نہیں رہے گا، تو اس جہان کا آسمان پھٹ جائے گا، اِس کے ستارے

---

[1] مفتاح دار السعادۃ ومنشور ولایۃ العلم والارادۃ۔ ج ۲، ص ۱۱۸۔ طبع بیروت۔

بکھر جائیں گے، اِس کا سورج لپیٹ دیا جائے گا، اِس کا چاند ڈوب جائے گا، اِس کے پہاڑ اڑا دیئے جائیں گے، اِس کی زمین پہ زلزلہ آجائے گا اور جو لوگ بھی اس زمین پر ہوں گے ہلاک کر دیے جائیں گے۔ غرض یہ کہ اس دنیا کا وجود آثارِ نبوّت کے بغیر باقی نہیں رہ سکتا)

اللہ پاک کا ارشاد ہے :

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّ اَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ۝ (ابراهيم - ٢٨)

(کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہوں نے خدا کی نعمت کو ناشکری سے بدل دیا ہے اور اپنی قوم کو اپنے ساتھ تباہی کے گھر میں اتار دیا ہے)

ابنِ جریرؒ لکھتے ہیں :

وكان تبديلهم نعمة الله كفرا في نبيّ الله محمدﷺ ۔ انعم الله به على قريش فاخرجه منهم وابتعثه فيهم رسولاً رحمةً لهم ونعمة منه عليهم فكفروا وكذّبوا فبدّلوا نعمة الله عليهم به كفرا [1]

(اللہ کی نعمت کو ناشکری میں بدلنا خدا کے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے بارے میں تھا۔ اللہ نے قریش پہ یہ احسان کیا تھا کہ اپنے نبی کو ان کے اندر پیدا فرمایا اور اُن ہی میں رسول بنا کر بھیجا جو اُن پہ اُس کی رحمت اور نعمت تھی، لیکن اُنہوں نے آپؐ کی نبوّت کا انکار کیا اور جھٹلایا اور خدا کی اس نعمت کو کفرانِ نعمت سے بدل دیا)

ــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کی نعمت کہنے کا تقاضا یہی ہے کہ آپؐ کی

---

[1] تفسیر ابن جریر - ج ١٣ - ص ٢١٩ - ابراهيم۔

سیرت اور آپؐ کی شریعت و سنت کی پیروی کی جائے۔ خواہ آپؐ کے ارشادات قرآنِ کریم میں صراحتاً مذکور ہوں یا نہ ہوں۔ منکرینِ نبوت کی طرح منکرینِ سنّت بھی بڑے ناشکرے ہیں اور کفرانِ نعمت کر رہے ہیں کہ آپؐ کے ارشادات اور اعمال و اخلاق کو حجت اور ماخذِ قانون تسلیم نہیں کرتے۔

رسالت و نبوت مطلق پیغام رسانی کو کہتے ہیں

حجیتِ سُنّتِ رسولؐ کی بنیادی اور اساسی دلیل یہ بھی ہے کہ رسالت و نبوّت کے معنے صرف کتاب اللہ کے الفاظ پہنچانا نہیں ہے، بلکہ مطلق پیغام اور خبر پہنچانا ہے۔ رسول اور نبی طرف نامہ بَر کو نہیں کہتے، بلکہ پیغامبر اور خبر رَساں کو کہتے ہیں۔ نامہ مخصوص ہے لکھے ہوئے خط کے لئے، لیکن پیغام عام ہے، مکتوب ہو یا غیر مکتوب، وحیٔ جلی، یعنی قرآنی الفاظ ہوں یا وحیٔ خفی یعنی الفاظِ قرآن کی تشریح یا اُن کے علاوہ کوئی پیغام اور حکم و ہدایت۔ ظاہر ہے کہ اس پیغام رسانی اور خبر رسانی کو آیاتِ قرآنیہ کے ساتھ مخصوص کرنے کی کوئی معقول وجہ اور قوی دلیل موجود نہیں ہے۔

وحیٔ جلی بھی منزّل ہے اور سنّتِ رسولؐ بھی منزّل ہے۔ تشریعی احکام سے متعلق نبی کا ہر قول و فعل وحیٔ خداوندی اور الہامِ رحمانی پہ مبنی ہوتا ہے، اس لئے رسول و نبی کی پیروی کرنا مخلوق پرستی نہیں ہے، بلکہ خالق پرستی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر قرآنِ کریم میں حجیتِ حدیث کے لئے دوسرے دلائل نہ بھی ہوتے، تو رسولؐ کی صفتِ رسالت اور نبی کی شانِ نبوّت بذاتِ خود اُس کے لئے کافی و شافی دلیل ہے۔ رسالت و نبوّت دراصل سِفارت اور نمائندگی کا نام ہے، سفیر کا کام صرف خط اور مخصوص الفاظ پہنچانا نہیں ہوتا، بلکہ اُس کی ذمّہ داری اس سے بہت زیادہ وسیع ہوتی ہے۔ وہ اپنے بھیجنے والے کی منشا کی وضاحت کرتا ہے، اُس کے پیغام کی تشریح کرتا ہے اور اُس کے بیان کردہ و قائم کردہ اصول و ضوابط کے جزئیات کی تفصیلات بھی بیان کرتا ہے۔ غرض یہ کہ سفیر و رسول حاکمِ حقیقی کا مُستند نمائندہ ہوتا ہے۔

حاصل بحث

خالقِ کائنات، مالک الملک اور حاکمِ حقیقی کے احکام و قوانین کی معرفت کا مُستند ذریعہ رسول اور نبی ہی ہو سکتا ہے ۔ رسول اگرچہ صورتاً بشر اور انسان ہوتا ہے، لیکن اپنی فطرت اور سیرت وکردار کے اعتبار سے طیّب النّفس اور معصوم ہوتا ہے ۔ اُس کا ظاہری اور معاشرتی تعلق اگرچہ خلقِ خدا اور انسانی معاشرے کے ساتھ ہوتا ہے، مگر اُس کے قلب و روح کا تعلّق اپنے خالق کے ساتھ ہوتا ہے ۔ اُس کی ہر بات اور ہر عمل حجّت ہے ۔

قرآنِ کریم میں مذکور ۲۰ حیثیاتِ رسول سنّت رسول کے حجّت ہونے کے وہ قرآنی دلائل ہیں جن کے مطالعے کے بعد اس موضوع پہ مزید دلائل پیش کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی ۔ اس سلسلے میں اور بھی کئی آیات ہیں جن سے استدلال کیا جا سکتا ہے، لیکن ایک طالبِ حق اور حق پرست کے لئے مذکورہ آیات بھی کافی ہیں ۔

سنّتِ رسولؐ کے حجّتِ شرعیہ ہونے کے ثبوت میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ارشادات کا بھی کافی ذخیرہ جمع کیا جا سکتا ہے، لیکن منکرینِ سنّت اس کو " مصادرہ علی المطلوب" کہہ سکتے ہیں، یعنی اگر حدیثِ رسولؐ کے حجّت ہونے پہ حدیث ہی کو دلیل بنایا جائے تو وہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ تو " خود دعویٰ کو دلیل بنایا جا رہا ہے" جو بحث و مناظرے کے قواعد کے خلاف ہے، اس لئے میں نے صرف قرآنی دلائل پیش کئے ہیں ۔

اپنے آپ کو اہلِ قرآن کہنے والوں کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ جو بات قرآن کریم کی سینکڑوں آیات سے ثابت ہوتی ہو اُس سے انکار کریں ۔ منکرینِ قرآن کا انکارِ سنّت کُفر تو ہے، لیکن باعثِ حیرت نہیں ہے، مگر قرآن پہ ایمان کا دعویٰ کرنے والوں کی جانب سے سنّتِ رسولؐ سے انکار کرنا صرف کفر ہی نہیں ہے، بلکہ موجبِ حیرت بھی ہے اور منافقت والحاد بھی ۔

کفر کھلے انکار کو کہتے ہیں؛ لیکن الحاد و زندقہ کفر کو اسلام کے لباس میں اور باطل کو حق کی شکل میں پیش کرنے کا نام ہے۔ یہ وہی " زخرف القول" ، یعنی جھوٹ کو سنہرے الفاظ میں بیان کرنا ہے جو ہر دور میں " شیاطین الانس والجن" نے عیارانہ حربے کے طور پہ اختیار کیا ہے۔

سورۂ الانعام کی آیت ۱۲ میں اللہ تعالیٰ نے اس گروہ کا ذکر خود فرمایا ہے۔

کتاب و سنّت کی نصوص کی غیر موجودگی میں خلفاءِ راشدین رضؓ اور صحابہ کرام رضؓ کی سنّت بھی نمونۂ عمل ہے۔ اس لئے کہ خود قرآنِ کریم اور سنّتِ رسول صؐ میں صحابہ کرام رضؓ کی عدالت و ثقاہت اور تزکیۂ نفوس و اعمال کی شہادت موجود ہے۔ نبی کا ہم نشین فیوضِ نبوت صؐ اور انوارِ رسالت صؐ سے محروم نہیں ہوتا۔

اصحابِ رسول صؐ بالخصوص السابقون الاوّلون اور خلفاءِ راشدین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے علمِ دین بھی حاصل کیا تھا اور روحانی و اخلاقی تربیت بھی پائی تھی اور یہ بات مسلّمہ ہے کہ مُعلّم اور مُربّی کامل ہو اور متعلّم و مُتربّی کے اندر اخلاص و للّٰہیت موجود ہو تو تربیت یافتہ شخص بھی کامل ہو جاتا ہے؛ چنانچہ صحابہ رضؓ کا ایمان و عمل کامل تھا، ان کا علم مکمّل اور اُن کے قلوب ساری اُمّت سے زیادہ پاکیزہ تھے۔ اسلامی نظام، اسلامی سیاست اور اسلامی انقلاب وغیرہ الفاظ اسی وقت حقیقی مفہوم پاتے ہیں جب عمل قرآن کریم، سنّتِ رسول صؐ اور سنّتِ خلفاءِ راشدین رضؓ (ابوبکر رضؓ، عمر رضؓ، عثمان رضؓ، علی رضؓ) کے عین مطابق ہو۔

میری آرزو تھی کہ سنّتِ صحابہ رضؓ و سنّتِ خلفاءِ راشدین رضؓ کی تفصیلات کے لئے مستقل چوتھا باب لکھتا، مگر مصروفیات و مشاغل کی وجہ سے یہ آرزو پوری نہ کرسکا۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہٖ محمّد وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ

اجمعین ٥

گوہر رحمان ۔ دار العلوم تفہیم القرآن مردان ۔ ۱۱ شعبان ۱۴۰۴ھ
۱۳ مئی ۱۹۸۴ء